



پر واقعہ بھی ہونا تھا

(شگفتہ مضامین)



توصیف ایزد

1 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

یہ واقعہ بھی ہونا تھا

توصیف ایزد

مہر آن لائن کمپوزنگ سنٹر سے بی ایس، ایم فل، ایم ایس اور پی ایچ ڈی تھیسز صرف تین دن میں کمپوز کروائیں۔ ۲۴ گھنٹے سہولت



”کتاب خزانہ“ لائبریری میں خوش آمدید۔

Mahar Online Public Library

پی ایچ ڈی اسکالر اپنا آرٹیکل شمارے میں لگاوانے کے لیے رابطہ کریں۔

اپنے ریسرچ ٹاپک کے متعلق ریختہ ویب سے کتب ڈونلوڈ کروانے اور سابقہ تھیسز حاصل کرنے کے لیے رابطہ کریں۔

اپنے قیمتی ڈاکو منٹس مناسب ریٹس پر ہمیشہ کے لیے محفوظ کروائیں اور جب چاہیں واپس لیں۔

اب آپ کو تھیسز کمپوزنگ کے لیے کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ گھر بیٹھے اپنا سنو پسر اور تھیسز پرو فیشنل انداز میں کمپوز کروائیں۔ نیز مقالے کی کمپوزنگ مع یروف ریڈنگ کروانے کی سہولت۔

کام یابی کے ۵ سال

مہر محمد مظہر کاٹھیا (ایم فل اسکالر)

مائیکروسافٹ آفس سپیشلسٹ

وٹس ایپ نمبر: 0303-761-96-93

تمام کتابیں ریختہ ویب سائٹ سے ڈون لوڈ کی جاتی ہیں۔ کسی بھی کتاب کو سکین یا پی ڈی ایف نہیں کیا جاتا۔ دستیاب کتب خریدنے کی عادت ڈالیں۔

ایم فل اور پی ایچ ڈی اسائنمنٹ، آرٹیکل، سنو پسر اور تھیسز کے متعلق رہ نمائی، کمپوزنگ اور فائنل سیٹنگ کے لیے رابطہ کریں۔

اب تک وٹس ایپ گروپ کی تعداد پانچ، آئیے آپ بھی ہمارے وٹس ایپ گروپ ”کتاب خزانہ“ کا حصہ بنیں۔

فیس بک، ٹیلی گرام ”کتاب خزانہ“ گروپ لنک سے تمام کتابیں ڈون لوڈ کریں:

www.facebook.com/groups/537746779706694

<https://t.me/joinchat/YMfAj2G2OgA1OGVk>

Mazhar03037619693@gmail.com

Twitter.com/@mazhar1kathia

اسکالر حضرات اپنے موضوع سے متعلق بنیادی اور ثانوی کتب کے لیے آگاہ کریں۔ تلاش کرنے کی مکمل کوشش کی جائے گی۔

کاروباری حضرات اپنے ایڈز / اشتہارات فیس بک، ٹیلی گرام اور وٹس ایپ کتاب خزانہ گروپ میں انتہائی مناسب ریٹ پر

پرموشن (پبلک شئر) کروائیں۔ وقت لینے کے لیے: 0303-761-96-93



پبلک سروس کمیشن سے متعلق
بہترین ویڈیو یوٹیوب چینل سے
ڈونلوڈ کریں۔

2 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

کسے خبر تھی کہ یہ واقعہ بھی ہونا تھا
کہ کھیل کھیل میں اک حادثہ بھی ہونا تھا
نامعلوم

3 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

یہ واقعہ بھی ہونا تھا

توصیف ایزد

نسٹعلیق مطبوعات

فیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

0300-4489310 / 0331-4489310

nastalique786@gmail.com

4 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

ن والقلم وما یسطرون ○

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

نام کتاب	یہ واقعہ بھی ہونا تھا
صاحب کتاب	توصیف ایزد
اشاعت	مئی ۲۰۲۱ء
مطبع	حاجی منیر پرنٹرز، لاہور
قیمت	1100 روپے
بیرون ملک	15 ڈالر، 10 پونڈ

خوبصورت کتابوں کی اشاعت کے لیے رابطہ کریں

نسٹعلیق مطبوعات

فیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

0300-4489310 / 0331-4489310

nastalique786@gmail.com

5 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

انتساب

رفیقہ حیات عنبرین

اور

بیٹیوں

حرا اور یشل

کے نام

6 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

فہرستِ مضامین

11	برگد سے آگے۔ از پروفیسر افتخار الدین سہیل	✦
13	دردِ دل کہہ لے۔ توصیف ایزد	✦
15	کہیں پرچہ آوٹ نہ ہو جائے	✦
33	دارچینی کے دیس میں	✦
50	ہمدِ دیرینہ کا ملنا	✦
66	چوزہ	✦
72	ہم نے الیکشن لڑا	✦
109	یہ ہم کیا کر بیٹھے	✦
144	تا کہ حقیقت واضح ہو جائے	✦
170	لکھنا کتاب کا	✦
188	برگد	✦

8 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

توصیف ایزد کی یہ کتاب کہنے کو تو ۹ ہلکے پھلکے انداز میں لکھے گئے مضامین پر مشتمل ہے۔ مگر ان کا اندازِ تحریر اور اپنے موضوع میں چیزوں کو upside down کر کے دیکھنے اور دکھانے کی جو عمدہ مہارت ہے۔ اُس نے ہر مضمون کو ایک کام کی چیز بنا دیا ہے۔ اتفاق سے ان کی اولین کتاب 'ذرا کیمبرج تک' میری نظر سے نہیں گزری۔ لیکن ان مضامین کا کمال ہے کہ اب میں نے اس کتاب کو بھی ڈھونڈ کر پڑھنے کا ارادہ کر لیا ہے۔

شگفتگی، مزاح اور پھکڑ پن کے درمیان اگرچہ خاصا فرق اور فاصلہ ہے۔ مگر آجکل بیشتر تحریروں میں یہ کم سے کم ہوتا نظر آ رہا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ توصیف ایزد نے شگفتگی اور مزاح سے تو بھرپور کام لیا ہے لیکن کہیں بھی اسے پھکڑ پن کی حدوں میں داخل نہیں ہونے دیا۔ مجھے یقین ہے اس کتاب کا ہر قاری میری بات سے اتفاق کرے گا اور ان مضامین کو ایک سے زائد بار پڑھنے میں خوشی محسوس کرے گا۔

امجد اسلام امجد

لاہور

مزاح ، مذاق نہیں ہوتا۔ توصیف ایزد صاحب کی کتاب نے اس پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔ کھلکھلاتے جملوں اور شرارتی سچو ایشنز کے درمیان وہ کمال مہارت سے بین السطور ایک پیغام قاری تک منتقل کر دیتے ہیں۔ نثری مزاح کی کوئی بھی اچھی کتاب شائع ہوتی ہے تو میرا اپنا سینہ فخر سے پھول جاتا ہے۔ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ توصیف ایزد صاحب شاندار مزاح نگار ہیں۔ ان کے جملے، مصرعے کا مزا دیتے ہیں۔ یہی ایک کامیاب مزاح نگار کی خوبی ہے کہ وہ جملوں کے استعمال میں حد درجہ محتاط ہوتا ہے۔ اس سے پہلے ان کا ایک سفرنامہ ”ذرا کیمرج تک“ بھی شائع ہو چکا ہے جو از خود مزاح کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ اب کی بار انہوں نے خالص واقعاتی مزاح پر ہاتھ ڈالا ہے اور مسکراہٹوں کے نئے دروا کیے ہیں۔ کتاب پڑھئے آپ کو میرے دعوے کی خود ہی تصدیق ہو جائے گی۔

گل نوخیز اختر

کالم نگار روزنامہ جنگ

برگد سے آگے

مشتاق یوسفی کی مزاح نگاری کے متعلق ایک ہم عصر نقاد نے درست کہا تھا کہ 'ہم مزاح کے عہدِ یوسفی میں جی رہے ہیں'۔ یوسفی کا مزاح مشاہدے اور تجربے کے بطن سے پھوٹتا ہے جسے اُس کا اسلوبِ بیان ممتاز اور منفرد بنا دیتا ہے۔ یوسفی کے اسلوب کی مقبولیت نے اُسے رجحان ساز مزاح نگار بنایا اور اُس کے نقشِ قدم پر چلنے والے ان گنت ادیب ادب کے منظر نامے پر ابھرے۔ توصیف ایزد بھی اسی قافلے کے مسافر ہیں۔ اُن کے پیشِ نظر مجموعہ مضامین میں 'یہ واقعہ بھی ہونا تھا' میں یوسفی کی 'زرگزشت' کی چھاپ بہت واضح ہے۔ مزاح کی زیریں لہران کی تحریر میں ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ بظاہر وہ اپنے تجربات اور واقعات بیان کرتے ہیں مگر ان کا اسلوبِ بیان اس میں مزاح کا دلچسپ عنصر پیدا کر دیتا ہے۔ ان تحریروں میں ان کی ژرف نگاہی اور حساس فکری نمایاں ہے۔

ہم عصر مقبول ادیبوں کے اثرات سے بچ نکلنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ توصیف ایزد جن مقامات پر سفر کا احوال بیان کرتے ہیں۔ ان جگہوں پر ان کی تحریروں میں ابنِ انشاء کا رنگ نظر آنے لگتا ہے۔ بعض مواقع ایسے بھی آتے ہیں کہ ان کا اسلوب عین وہی ہو جاتا ہے جو شوکت علی شاہ کا 'اجنبی اپنے دیس میں' ہے۔ مصنف کی تحریر کے چند نمونے ملاحظہ فرمائیے۔ آپ خود ہی میرے ہم خیال ہو جائیں گے۔

'غالباً مرغے رات بھر کی بے کاری و بد کاری سے فراغت پانے کے بعد مومنین کی نیندوں میں دخل اندازی کرنے کے لئے اپنے گلے صاف کر رہے تھے۔

'ہم نے ڈرائیور کی خدمت میں عرض کیا۔ کیا ہم کسی متبادل راستے سے نہیں نکل

12 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

سکتے۔ اُس نے ہمیں گھور کر ڈانٹتے ہوئے کہا، صرف ایک ہی راستہ ہے کوئی متبادل نہیں۔ اب ہمیں سمجھ آیا۔ کہ ون نیشن، ون روڈ کا مطلب کیا ہے۔
'ہم نے ڈرائیور کو ایک طرف کیا اور پوچھا۔۔۔ یہ کون ہیں اور یہ کیا جگہ ہے۔۔۔ یہ بڑی اچھی جگہ ہے۔ یہ لڑکیاں یہاں کام کرتی ہیں۔ خوبصورت بھی ہیں اور سستی بھی۔'

'آدھے مولوی دھڑلے سے کہہ رہے ہوں کہ کل جس نے روزہ نہ رکھا وہ گناہِ کبیرہ کا مرتکب ہوگا جس کی کم از کم سزا دس کروڑ سال جہنم کی آگ میں جلنا ہوگا اور بقیہ علماء کا اصرار ہو کہ کل عید ہے اور شیطان اور اُسکے چیلے روزہ رکھیں گے۔ جو مزہ اس خلیجان اور تذبذب میں ہے وہ گھڑی، کیلنڈر کی بندھی قوم کو کیا معلوم۔'
'غلط تشریح تو دور کی بات ہے۔ آپ تو ہر ہفتے ایک نئی تھیوری ایجاد کرتے ہیں۔ جس کی پہلی خصوصیت آپ ہی کی ایجاد کردہ پچھلی تھیوری سے اختلاف ہوتا ہے۔'
'پس ثابت ہوا کہ ہم جو بھی ادبی کاوش کریں گے، وہ انحطاطِ زمانہ کے طفیل نہایت اعلیٰ پائے کی ہوگی۔ جس پر قدماء و فصحاء کی ارواح مسرور ہونے کے ساتھ ساتھ حسد کریں گی۔'

کتاب کا آخری مضمون 'برگد' اسلوبِ بیان اور موضوع کے اعتبار سے دیگر مضامین سے مختلف ہے۔ اس میں ہمارے معاشرے کی ہیئتِ کدائی، روبہ زوال معاشرت، عدم برداشت، تعصب، فرقہ واریت، تنگ نظری اور متنوع کرداروں کی جس انداز میں عکاسی کی گئی ہے۔ وہ فکر افروز بھی ہے اور سبق آموز بھی۔

پروفیسر افتخار الدین سہیل

گورنمنٹ اسلامیہ کالج سول لائنز

لاہور۔

دردِ دل کہہ لے

اس کتاب میں نو مضامین ہیں۔ جن کے لکھنے میں ہم نے نو سال لگا دیے۔ کیونکہ ہماری کتاب ’ذرا کیمبرج تک‘ ۲۰۱۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ گویا ہم نے ایک سال میں ایک مضمون لکھا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی قدرے پریشانی ہوئی۔ لیکن پھر اپنے آپ کو سمجھایا کہ پریشانی والی کوئی بات نہیں۔ یہ کتاب لکھنا ہمارا پیشہ نہیں شوق ہے۔ اپنے فرائض منصبی ادا کرنے میں ہمارا سارا وقت اور توانائی صرف ہو جاتی ہے۔ اس لئے یہ تاخیر ہوئی۔۔۔ دوسری وجہ یہ بھی سوجھی کہ زیادہ نہیں لکھنا چاہیے۔ اس سے معیار گر سکتا ہے۔ تو ہم نے معیار گرنے سے روکنے کے لئے کم لکھا ہے۔۔۔ ان وجوہات کی بنا پر ابھی ہم مطمئن ہو ہی رہے تھے کہ ہمارے یارِ خاص عبدالحمید شیرازی ملتانی اپنی ٹانگ اڑانے پہنچ گئے۔ کہنے لگے۔ تم پچھلے نو سال سے اپنے تمام فرائض منصبی انجام دینے میں کوتاہی کرتے رہے ہو۔ اس جواز کی بنا پر کہ یہ کتاب لکھ رہے۔ اور آج الٹا فرائض منصبی کو تاخیر کا بہانہ بنا رہے ہو۔ اپنا پیشہ ورا نہ کام تم اس لئے نہیں کرتے کہ کتاب لکھ رہا ہوں۔ اور کتاب اس لئے نہیں لکھتے کہ پیشہ ورا نہ کام کر رہا ہوں۔۔۔ اور۔۔۔ ہاں دوسرا ڈھکوسلہ ہے تمہارا معیار کا۔۔۔ تمہارا دعویٰ ہے کہ کم اس لئے لکھتے ہو کہ معیار کم نہ ہو۔ حالانکہ معیار تمہاری کتابوں کا اس لئے کم ہے کہ تم مشق پوری نہیں کرتے کم لکھنے کی وجہ سے۔ اگر ہر دو چار ماہ میں ایک کتاب لکھ لو تو امکان ہے کہ دس بیس سالوں میں کچھ ایسا مواد، نادانستہ ہی سہی، لکھا جائے جسے ’انتخاب‘ کے نام سے چھاپا جاسکے۔۔۔ ملتانی نے مسودہ لے کر پڑھا۔ یا یوں کہیے کہ مسودے کو اونگھتے ہوئے سونگھا۔۔۔ پوچھنے لگا، جو کچھ اس میں لکھا ہے یہ سچ ہے کیا؟۔۔۔ عرض کی، کچھ حقیقت ہے اور کچھ

14 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

تخیل۔۔۔ کہنے لگا، نہیں کچھ خواہش ہے اور باقی افسوس۔۔۔ کہا، اگر صرف وہی لکھا جائے جو وقوع پذیر ہو تو یہ محض اخباری خبر ہوتی ہے اور اگر صرف تخیل ہی لکھ دیا جائے تو افسانہ۔۔۔ کہنے لگا، جھوٹ کو جتنے چاہے نام دے لو، سچ بننے والا نہیں ہے۔۔۔ تم جیسے جھوٹ لکھ کر سمجھتے ہیں کہ تعمیری کام کر رہے ہیں۔۔۔ کتابوں میں جھوٹ لکھنے والوں کی سزا بھی مقرر ہونا چاہیے۔۔۔ اور یہ بتاؤ کہ اس کام میں پیسے ملتے ہیں یا نہیں۔۔۔ کہا، پیسے مصنف کو خرچ کرنا پڑتے ہیں کتاب چھپوانے اور پھر دوستوں کو بھجوانے کے لئے۔۔۔ بولا، اب سمجھ آیا کہ تم کہاں فضول خرچی کرتے ہو۔۔۔ تو صاحبو! عبدالحمید ملتانی شیرازی کچھ دیر کے لئے کسی دوسرے کی حوصلہ شکنی کے لیے گئے ہیں، اسی اثنا میں عرض ہے کہ اس کتاب کے مضامین مشاہدات اور تخیلات کا ملغوبہ ہیں۔ زندگی کی طرح جس میں کچھ آپ نے دیکھا ہوتا۔ اور کچھ سوچا اور کیا ہوتا ہے۔ انجام میں جو تصویر بنتی ہے۔ وہ ایک حلیم کی دیگ کی طرح ہوتی ہے جس میں سب کچھ گھل مل چکا ہوتا ہے۔ دالیں، گوشت، مصالحے، گھی۔۔۔ کسی شے کا اپنا ذائقہ نہیں ہوتا۔ لیکن پکوان کا ایک ذائقہ ضرور ہوتا ہے۔

توصیف ایزد

۸ جولائی ۲۰۲۰ء

یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی،

لاہور

کہیں پرچہ آؤٹ نہ ہو جائے



جاگنگ ٹریک پر مٹر گشت کرتے ہوئے ابھی پندرہ منٹ ہی ہوئے ہوں گے کہ موبائل فون پر گھنٹیاں بجنے لگیں۔ فون سیٹ کان سے لگایا تو عبدالحمید شیرازی ملتانی نے نہایت رسان سے سلام کیا۔ ساتھ ہی پوچھا، کہاں ہو۔ عرض کیا واک کر رہا ہوں۔ کہنے لگے، یونیورسٹی سٹیڈیم کو لاک کر دینا چاہیے، ہر وقت تم جیسے بے کار لوگ واک کا بہانہ کر کے غول درغول غیبت کرتے پھرتے ہیں۔۔۔ غیبت، توبہ توبہ۔ غیبت اور ہم۔ ایسا نہیں ہے۔ ہاں البتہ دوستوں کا تذکرہ تو ہوتا رہتا ہے۔ احباب سے تعلق خاطر کا تقاضا ہے کہ انہیں یاد رکھا جائے۔ ہم نے دفاعی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔۔۔ خیر یہ بات پھر کبھی سہی، فی الحال کہنا یہ ہے۔۔۔ ملتانی بولا۔۔۔ تم جانتے ہو کہ انٹری ٹیسٹ ہونے والا ہے۔ یہ ایک انتہائی اہم معاملہ ہے۔ قوم کے ہزاروں ہونہار طالبعلموں کا مستقبل اس سے وابستہ ہے۔ اور یہ امتحان ملک کے تقریباً ہر بڑے شہر میں ہوگا۔ تمہیں اس امتحان کے انعقاد کے لئے کہاں بھیجا جائے۔ ملتانی نے ہماری رائے پوچھی۔۔۔ کیا مطلب، کہاں بھیجا جائے۔ کہیں بھی نہیں۔ ہم نے جواباً کہا۔ یار مجھے اس کام سے دور ہی رکھو۔۔۔ کیوں؟ ملتانی غرایا۔۔۔ یہ ٹیسٹ نہ صرف ہمارے ادارے بلکہ قوم و ملک کے حوالے سے انتہائی اہم ہے، کبھی تو تنخواہ حلال کر لیا کرو۔ خیر یہ بتاؤ ملتان جانا ہے یا بہاولپور، ٹیسٹ لینے کے لئے۔۔۔ کیا! ملتان یا بہاولپور اور وہ بھی جولائی کے مہینے میں۔

17 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

یار ملتانی میں تو تمہیں اپنا دوست سمجھتا ہوں لیکن تم تو حکامِ بالا کے ٹوڈی نکلے۔ یعنی عین وسطِ جولائی میں مجھے تم ملتان، بہاولپور بھجواؤ گے۔ صرف اس لئے کہ باس تم سے خوش ہو جائے اور تمہارے حسنِ انتظام کے ڈنکے پٹ جائیں۔ چاہے اس کے لئے تمہیں اپنے دوستوں کو کتنی ہی تکلیف کیوں نہ دینی پڑے۔ ہم نے دفاعی مورچے سے گولے داغنے کی کوشش کی۔۔۔ اوئے پر لے درجے کے نالائق، نکمے، کام چور۔ یہ بتاؤ جولائی کے مہینے میں ملتان بہاولپور میں کاروبارِ زندگی معطل ہو جاتا ہے۔ یہ جو ہماری قوم آجکل امریکہ سے بھیک مانگتی پھر رہی ہے۔ پتہ ہے اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ صرف تم جیسوں کی کام چوری ہے۔ ملتانی نے سنگین غیرتِ ملی کا مظاہرہ کیا۔ میرا وقت برباد نہ کرو۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ تم ٹیسٹ لینے کے بہانے ملتان یا بہاولپور جیسے پرفضا مقام کی سیر کر لو۔۔۔ پُرفضا اور ملتان، بہاولپور یہ بھی اچھی کہی تم نے۔ ہم نے جواب دیا۔۔۔ اور اگر تمہیں یہ منظور نہیں ہے تو میرے پاس دوسرے چوائس بھی ہیں۔۔۔ دوسرے چوائس کیا ہیں۔ ہم نے بادلِ نخواستہ پوچھا۔۔۔ بھئی، پہلی چوائس تو ہے ملتان یا بہاولپور۔۔۔ ہاں، ہاں دوسری بتاؤ۔۔۔ دوسری ہے، بہاولپور یا ملتان۔۔۔ کیا کہا، یعنی دو چوائس والی بات تم صرف دھوکے کے لئے کر رہے ہو۔ اور یہ تو بتاؤ اس غضب کی گرمی میں ملتان یا بہاولپور پرفضا مقام کیسے ہو گئے۔ ہم نے استفسار کیا۔۔۔ پرفضا کیوں نہیں، پرفضا کیا ہوتا ہے۔ ملتانی بولا۔۔۔ پرفضا ہے سویٹزر لینڈ۔ وہاں بھیجونہ صرف ٹیسٹ لینے جائیں گے بلکہ ساتھ اپنا بور یہ بستر بھی لے جائیں گے اور تمہاری کام چوروں سے جان چھوٹ جائے گی۔ نتیجتاً ہماری قوم کو امریکہ سے بھیک بھی نہیں مانگنا پڑے گی، کہو کیسا منصوبہ پیش کیا ہے قومی ترقی کا۔۔۔ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔ لو میں ابھی تمہیں جیکب آباد یا سبی بھجوانے کے آرڈر ٹائپ کروا رہا ہوں۔ اب بتاؤ ملتان، بہاولپور پرفضا مقام ہیں کہ نہیں۔ ملتانی نے بھرپور جوابی وار کیا۔۔۔ یار ملتانی! تم میں ایک بڑی خرابی ہے۔ تم فوراً سنجیدہ ہو جاتے ہو۔ تم کہتے ہو تو

18 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

ملتان، بہاولپور ہی چلا جاتا ہوں۔ لیکن یار پلیز یہ سب، جیکب آباد والی اوجھی حرکت نہ کر دینا۔ ہم نے ہکلاتے ہوئے التجا کی۔۔۔ اب آئے ہو نہ لائن پر۔ ملتانی فاتحانہ انداز میں بولا۔

انٹری ٹیسٹ سے ایک دن پہلے ہم علی الصبح ملتانی کے پاس پہنچے۔ ہمیں ٹیسٹ کے بہاولپور سنٹر کا انچارج بنا دیا گیا تھا۔ کئی من کاغذات کے تھیلے تھما دیے گئے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے سینکڑوں اقسام کے فارم پکڑائے گئے۔ اس فارم پر تم نے دستخط کر کے امتحانی پرچہ جات نگرانوں کے حوالے کرنے ہیں۔ اس فارم پر یہ تصدیق ہوگی کہ سوالنامہ عین امتحان شروع ہونے کے وقت کھولا گیا ہے۔ اس فارم پر تم نے بہاولپور آمد، وہاں سے روانگی، راستے کی تمام تفصیلات یعنی کس روٹ سے گئے، کس شہر سے گزرے، راستے میں کہاں چائے پی، کہاں کھانا کھایا، کہاں رک کر میوزک سنٹر سے کیسٹ خریدے، کون سے گانے سنے، اور کون سے گانے سننے کی حسرت دل میں لئے بیٹھے رہے، کہاں سے جلیبیاں، اندر سے، کینو، ملوک، اور کھوئے کی قلفی کھائی۔ سب درج کرنا ہے۔ پٹرول اور فاصلے کی تفصیلات کے لئے لاگ بک علیحدہ ہوگی۔ ایمانداری کے ساتھ کام کرنے کی بابت پسند و نصائح سے بھرا ہوا ایک پرچہ بھی تھمایا گیا۔ جس میں دین، اخلاقیات، تہذیب کے نام پر دھمکی نما التجا کی گئی تھی کہ سوالنامہ آپ کے پاس ہے۔ اس لئے سارا رستہ لائحہ کا ورد کرتے رہیں۔ ایسا نہ ہو کہ آپ شیاطین کے بہکاوے میں آ کر اپنی توجہ کسی دوسری طرف کر لیں اور نتیجتاً کہیں پرچہ آوٹ نہ ہو جائے۔ ہم نے لاہور سے نکلتے ہی کٹے ہوئے امرود مع کالی مرچ و سفید نمک اسی پرچے پر رکھ کر کھائے اور آخری قاش کے ساتھ اس کاغذ کے پرزے کو نہر کے صاف پانی میں بہا دیا۔ کیونکہ مقدس اوراق کا احترام ہم سب پر لازم ہے۔ امتحان کا ساز و سامان دیکھ کر قرون وسطیٰ کی مہمات یاد آنے لگیں۔ جب اونٹوں پر رسد لاد کر سورما میدانِ کارزار کی طرف جایا کرتے تھے۔ ایک ایئر کنڈیشنڈ بس میں جمبو سائز ٹرنک لاد دیئے گئے۔ ان ٹرنکوں کو

19 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

پانچ، پانچ کلو گرام کے تالے لگے ہوئے تھے۔ ہمیں تھلیے میں لے جا کر ایک بھاری ٹوکری پکڑا دی گئی۔ ہم نے ملتانی کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے سفر کے دوران بھوک مٹانے کے لئے ریلے آموں کا بندوبست کیا ہوا تھا۔ ٹوکری اور آموں کا شکریہ سن کر ملتانی کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ کہنے لگا، یہ آم نہیں ٹرنکوں کی چابیاں ہیں جنہیں ہر وقت تم نے اپنے پاس رکھنا ہے۔ اور عملے کا کوئی فرد اس چابیوں بھری ٹوکری کے پاس نہ پھٹکنے پائے۔ بالکل ایسے ہی ٹرنک تقسیم ہندوستان سے قبل ہماری دادی کے جہیز میں آئے تھے۔ جن کے تالے زنگ آلود ہونے کے باعث چابیوں سے کھل نہ سکے۔ پھر مقامی مستریوں کو دعوت فنکاری دی گئی لیکن وہ ناکام ہو گئے تھے۔ بالآخر دادی جان کے میکے سے ان ٹرنکوں کے بنانے والے کاریگروں کو بلوایا گیا تھا۔ جنہوں نے سارے خاندان کے سامنے ہتھوڑے مار مار کر ٹرنک کھولنے کی غرض سے وہ تالے توڑے تھے۔ ایک ٹرنک میں بہشتی زیور نامی کتاب کی پچاس کے لگ بھگ جلدیں رکھی ہوئی تھیں۔ اور ساتھ ہی ایک سفید پرچے پر نہایت نستعلیق انداز میں درج تھا۔ دلہن جتنی جلدیں چاہے اپنے پاس رکھ لے۔ باقی جلدیں رفع شر کے واسطے، دلہن کی ساس، ہندوں اور دیگر تمام سسرالی خواتین میں بانٹ دی جائیں۔

ہمیں بہاولپور لے جانے کے لئے ایک پرائیویٹ بس کا انتظام کیا گیا تھا۔ میں نے ملتانی سے پوچھا۔ ہماری یونیورسٹی کے پاس بسیں موجود ہیں تو پھر پرائیویٹ بس کرائے پر کیوں لی گئی ہے۔۔۔ کہنے لگا، نہایت غور و خوض کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ پرائیویٹ بس کا بندوبست کیا جائے تاکہ راستے میں کسی کو یہ شک ہی نہ ہو کہ اسی بس میں امتحان داخلہ کے سوالنامے اور جوابی کاپیاں موجود ہیں۔ ٹیسٹ لینے والا قافلہ لاہور سے روانہ ہوا تو عملے میں ایک عدد سیکورٹی گارڈ بھی موجود تھا جس کے ہاتھ میں کلاشنکوف تھی۔ ہم نے ازراہ تجسس پوچھا۔ کیا تمہارے پاس فائر کرنے کے لئے گولیاں بھی ہیں یا صرف خالی کلاشنکوف اٹھائے ہوئے ہو۔ اُس نے سپاہیانہ تکبر کے ساتھ کہا۔ میرے

20 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

پاس بھی ہیں اور کلاشکوف کے اندر بھی۔ اُس نے کلاشکوف کی نالی معائنے کے لئے ہماری طرف موڑ دی۔ ہم نے نہایت انکساری سے اسے شاباش دی اور ساتھ ہی کلاشکوف کا رخ بھی دوسری طرف کر دیا۔ راستے میں متعدد مقامات پر ایک بورڈ پر لکھا ہوا تھا۔ ون نیشن، ون روڈ *۔ یہ بورڈ اس کمپنی کی جانب سے لگایا گیا تھا جس نے اس شاہراہ کی تعمیر کی تھی۔ ایک قوم، ایک شاہراہ والی بات کچھ سمجھ نہ آسکی۔ شاید اس کا مطلب ہے کہ ساری قوم کو ایک ہی راستے کا انتخاب کرنا چاہئے۔ یعنی یہ ایک طرح سے وحدتِ قوم کا نعرہ تھا۔ یہ سوچ کر ہم نے اس تحریر کی گتھی سلجھانے کی کوشش کی۔ کچھ دیر کے بعد ہماری بس شاہراہ پر ٹریفک میں پھنس گئی۔ ہر طرف دھواں، گرد و غبار اور گرمی کا راج تھا ٹریفک جام سے نکلنے کے لئے ہم نے ڈرائیور کی خدمت میں عرض کیا۔ کیا ہم کسی متبادل راستے سے نہیں نکل سکتے۔ اُس نے ہمیں گھور کر ڈانٹتے ہوئے کہا، صرف ایک ہی راستہ ہے کوئی متبادل نہیں۔ اب ہمیں سمجھ آیا۔ کہ ون نیشن، ون روڈ کا مطلب کیا ہے۔ کہ چونکہ آپ ایک ہی قوم سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے آپ کو ایک ہی شاہراہ درکار ہے۔ اگر کوئی دوسری قوم موجود ہو تو دوسری سڑک بنائی جاسکتی ہے۔ ایک قوم کے لئے دو، تین یا زائد شاہرات کی تعمیر دراصل اُس قوم کی وحدت پارہ پارہ کرنے کی سازش ہو سکتی ہے۔۔۔ ون نیشن، ون روڈ ہی ایک ایسا طریقہ ہے جس سے وحدتِ ملی کا وجود قائم رہ سکتا ہے۔ یوں ہمیں انشراحِ صدر ہو گیا۔

تم اس وقت کہاں ہو۔ ملتانی نے دورانِ سفر چھٹی مرتبہ فون کیا۔ امتحانِ داخلہ کا سارا سامان اس وقت کہاں ہے۔۔۔ عرض کیا۔ سامان میرے ساتھ بس میں موجود ہے۔۔۔ ہیں۔ ساتھ کیا مطلب؟ تمہاری نظریں کدھر ہیں۔ اور تمہارا دھیان۔۔۔ خیر وہ تو بچپن سے ہی اول فول چیزوں کی طرف لگا رہتا ہے۔ ملتانی غرایا۔۔۔ سامان صرف ساتھ نہیں رکھو بلکہ اس پر اپنی نظریں گاڑ کر رکھو۔ اور ہاں یہ جو تم نے اپنے سر پر ہیڈ فون چڑھایا ہوا ہے جس سے تم نصیبو لعل کے بازاری لہجے میں گانے سن رہے ہو۔ اسے بند

One Nation, One Road

21 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

کرو اور تمام توجہ صرف ٹیسٹ کے سامان پر مرکوز کرو۔ کہیں پرچہ آؤٹ نہ ہو جائے۔۔۔ یہ الزام نما حقیقت حال سن کر ہم بھونچکے رہ گئے۔ ہم نے بس کے اندرونی منظر کا بھرپور جائزہ لیا۔ کہیں ملتانی بس کے اندر ہی تو نہیں بیٹھا ہوا۔ لیکن ایسا کچھ نہیں تھا۔ اب ہم نے قدرے خفگی سے اپنا دفاع کرتے ہوئے کہا۔۔۔ غلط، بالکل غلط۔ ہم نصیبو لعل نہیں سن رہے۔۔۔ تم سن رہے ہو۔ نہیں، ہرگز نہیں۔ وہ ریکارڈ ختم ہوئے کئی منٹوں کا طویل عرصہ بیت چکا ہے۔ اس وقت ہم عارف لوہار کی مدھر آواز سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔۔۔ میں کہہ رہا ہوں تم ٹیسٹ کے سامان پر توجہ رکھو اور تم نصیبو اور لوہار کے چکر میں لگے ہوئے ہو۔ ملتانی سٹپٹایا۔۔۔ اچھا بھئی دونوں کو چھوڑ دیتا ہوں۔ تم بھی میری جان چھوڑو۔۔۔ یہ کہہ کر ہم نے فون بند کیا اور نصیبو اور عارف لوہار بند کر کے منصور ملنگی کا ریکارڈ سننا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر میں ہمیں بھوک کا احساس ہوا۔ ڈرائیور سے کہا۔۔۔ کوئی اچھا سارے سٹورنٹ ڈھونڈو۔۔۔ ڈرائیور نے بخوشی تعمیل کی اور ایک ٹرک ڈرائیور ہوٹل پر جا رکا۔۔۔ ہم نے تو تمہیں کسی اچھے ریسٹورنٹ کا کہا تھا۔ تم کہاں رک گئے ہو۔۔۔ بادشاہ، ایک مرتبہ کھانا کھا کر دیکھو۔ عارف لوہار کے گانوں پر صرف سر نہیں دھنتے رہو گے۔ کھانے کے بعد اگر نہ ناچو تو میرا نام بدل دینا۔ یہ کہتے ہوئے ڈرائیور نے اپنی بائیں آنکھ بھی میچی۔۔۔ ناچار بس سے نیچے اترے اور ابھی ٹرکوں، ڈرائیوروں، خدمت گاروں کا جائزہ لے ہی رہے تھے کہ پھر ملتانی کا فون آگیا۔۔۔ ایسا کرو کہ بس کے چاروں طرف چار پائیاں بچھو الو اور ہر چار پائی پر صرف تمہارے عملے کا ایک آدمی بیٹھا ہونا چاہیے۔ جس کا چہرہ اور دھیان ہر وقت ٹیسٹ کے سامان کی طرف ہوگا کیونکہ کہیں پرچہ آؤٹ نہ ہو جائے۔ ساتھ ہی فون بند ہو گیا۔ ہمارا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔۔۔ ویسے ملتانی کو کس نے بتایا کہ ہم کھانا کھانے کے لئے رکے ہیں۔ اور ہاں یہ نصیبو لعل کے گانے والی بات ملتانی تک کیسے پہنچی۔ ہم نے چند لمحے غور کیا۔ پھر اس کا رِلا حاصل کو ترک کر کے کھانا کھانے لگے۔

خدا خدا کر کے سات آٹھ گھنٹوں کی مسافت تمام ہوئی اور ہم بہاولپور کے نواحی

علاقے میں پہنچے۔ ہمیں ہر طرف ریاستی حسن نظر آنے لگا۔ لیکن یہ حسن صرف کھیت کھلیانوں تک ہی محدود تھا۔ نرمی اور ملائمت سے بھرپور سرائیکی زبان و لہجے کے تو ہم ہمیشہ سے قائل تھے۔ اور ساتھ ہی ساتھ دل میں یہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ ریاست کی حد میں داخل ہوتے ہی مدھرنسوانی آوازیں سرائیکی گائیکی کے ساتھ ہمارا استقبال کریں گی۔ اور ہمارے ساتھ ازل کے بندھن کا اعتراف و اعادہ کریں گی۔ ابھی ہم یہ سوچ ہی رہے تھے کہ ایک پولیس نا کے پر ہماری بس روک لی گئی۔ آنا فنا سپاہی بس میں داخل ہو گئے اور ہمیں نیچے اترنے کا حکم دیا۔ باہر نکل کر معلوم ہوا کہ پولیس ہماری بس کی تلاشی لینا چاہتی ہے۔ ہم نے اپنا تعارف کروایا اور مقصد سفر بھی بیان کیا۔ لیکن پولیس پر اس کا کوئی خاطر خواہ اثر نہ ہوا۔ ان کا کہنا تھا کہ دہشت گردی روکنے کے لئے ہمارے سارے ساز و سامان کی تلاشی لینا ضروری ہے۔ ٹرنک اور ان کے اندر موجود سامان کھولے بغیر ہمیں آگے نہیں بڑھنے دیا جائے گا۔ اور ٹرنکوں کی تلاشی کے دوران ہمیں اپنے تمام ساتھیوں سمیت نا کے پر موجود پولیس کے پاس چپ سادھے تماشاے اہل کرم دیکھنا ہوگا۔۔۔ لیکن ٹرنکوں میں امتحانی سوالنامے اور جوابی کاپیاں ہیں جو کسی صورت امتحان سے پہلے نہیں کھولی جاسکتیں کیونکہ کہیں پرچہ آوٹ نہ ہو جائے۔ ہم نے وضاحت پیش کی۔۔۔ لیکن پولیس ہماری اس دلیل کو کارِ سرکار میں مداخلت سمجھ رہی تھی اور ہمیں سنگین نتائج کی دھمکیاں دے رہی تھی۔ اس ساری مہم کے دوران یہ پہلا موقع تھا کہ ہم نے خود ملتان کو فون کیا اور صورت حال سے آگاہ کیا۔۔۔ ملتانى الٹا ہمارے سر ہو گیا۔ کہنے لگا۔ تمہیں ایسی پولیس اور نا کے کے پاس جانے کی ضرورت کیا تھی۔ عرض کیا۔ ہم اُن کے پاس نہیں گئے، وہ ہمارے راستے میں آدھمکے ہیں۔۔۔ یار تم تو بالکل نکلے اور اناڑی آدمی ہو۔ ملتانى نے ہمیں ہماری اوقات یاد کراوائی۔۔۔ یار ہم جیسے بھی

آ ڈیکھ فرید دا بیت حزن

ہن روز ازل دی تانگ طلب

(خواجہ، غلام فرید)

23 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

ہیں۔ اب بتاؤ کیا کریں۔ ہم نے لجاجت سے جواب دیا۔۔۔ اچھا میں کسی سے بات پولیس کے ساتھ سادہ کپڑوں میں چند لوگ موجود ہیں جو پولیس کو ہدایات دے رہے ہیں۔ ہم نے نفری میں سے ایک ایسا سپاہی ڈھونڈا جو اپنے حلیے سے سست الوجود، غبی، کام چور دکھائی دیتا تھا۔ ہم نے ذرا موقع ملتے ہی اُن سادہ کپڑوں والے لوگوں کے بارے میں دریافت کیا۔ اُس نے نہایت بے اعتنائی سے جواب دیا۔ یہ مقامی سیاستدان اور ان کے کارندے ہیں۔ ان کا اصرار ہے کہ ٹرنکوں میں بم اور اسلحہ ہو سکتا ہے اور ہم اپنی تسلی کئے بغیر اپنے علاقے میں مشتبہ لوگوں کو داخل نہیں ہونے دیں گے۔ کچھ دیر کے بعد ملتانی نے فون کے ذریعے اطلاع دی کہ حکام بالا سے بات ہو گئی ہے۔ ابھی پولیس سے تمہیں چھٹکارا مل جائے گا۔ تم نے کسی صورت بھی کسی کو بھی ٹرنک کھولنے نہیں دینا کیونکہ کہیں پرچہ آوٹ نہ ہو جائے۔۔۔ چند لمحوں بعد پولیس کو ایک فون کال موصول ہوئی اور ان کے لب و لہجے میں روایتی حسن سلوک جھلکنے لگا۔ اب مقامی سیاستدان ہمیں ایک طرف لے گئے اور دہشت گردی سے اپنے علاقے کو بچانے کے لئے ہم سے مدد کے طالب بن گئے۔ ساتھ ہی یہ مدد فراہم کرنے پر ہمیں انعام و اکرام کا عندیہ بھی دیا۔ ہم نے پھر وضاحت کہ کہ دہشت گردی کا ہمارے سامان کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ جواب ملا، دہشت گردی پر لعنت بھیجو۔ امتحانِ داخلہ کے سوالنامے کی زیادہ نہیں صرف ایک کاپی چاہیے۔ باقی کاپیاں ہم خود کروالیں گے۔ کیونکہ اپنے علاقے کے نوجوانوں کا خیال ہم نہیں رکھیں گے تو کون یہ نیک کام کرے گا۔ اب نکلا سانپ پٹاری سے۔۔۔ ہم نے ادھر ادھر دیکھا۔ حالات کا چشم تصور سے جائزہ لیا۔ جو رقم انعام اور تحفے میں آفر ہوئی۔ اُس پر بھی غور کیا۔ تب اُن سے مخاطب ہوئے۔ آپ بلاوجہ ہلکان ہو رہے ہیں۔ یہ مقام مناسب نہیں ہے۔ ہم آپ کی مشکل کشائی بہاولپور ریسٹ ہاؤس میں کر سکتے ہیں۔ وہاں بے دھڑک آجائیے۔ اس پر انہوں نے اتفاق کیا اور ہماری جان چھوٹی۔ ہم نے چونکہ ہر قیمت پر تہیہ کیا ہوا تھا کہ کہیں پرچہ آوٹ نہ ہو جائے۔ سو ہم اپنے سامانِ دہشت گردی کے ساتھ فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔

24 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

جب ہم بہاولپور پہنچے تو شام ڈھل چکی تھی۔ بس سے سامان اتارا اور تمام لوگ اپنے اپنے کمروں میں گھس گئے۔ غسل کیا اور تھوڑی دیر کے لئے دراز ہو گئے۔ اچانک یاد آیا کہ ہمارے ایک یار دیرینہ بہاولپور میں ہی بغرض ملازمت رہتے تھے۔ برسوں سے ملاقات نہ ہو سکی۔ فوراً فون پر اُن کو اپنے آنے کی اطلاع کی۔ وہ کسی ضروری کام میں مصروف تھے۔ لیکن ہماری آواز سنتے ہی پر لگا کر ہمارے پاس پہنچ گئے۔

یونیورسٹی میں ہمارے ہم جماعت ہونے کے علاوہ ہم ذوق بھی تھے۔ ہم دونوں دن رات فارغ بیٹھے ملک اور یونیورسٹی کے نظام کے خلاف گفتگو کیا کرتے تھے۔ کوئی بیس برس بعد ملاقات ہوئی تو ہمارے ہمدِ دیرینہ کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ پرانے دن یاد کر کے آہیں بھرتے رہے۔ ابھی ملاقات کا لطف آنا شروع ہی ہوا تھا کہ موبائل فون کی گھنٹی بجی۔۔۔ ملتان لائن پر موجود تھا۔ دل تو بہت چاہا کہ فون کو پٹخ دوں لیکن پھر یاد آیا کہ اسی آلہ کوفت سے ہم بہت سارے پُر لطف کام بھی لیتے ہیں۔ نہایت بے دلی سے بات شروع کی۔۔۔ تم یہاں کس کو لئے بیٹھے ہو۔۔۔ کسی کو بھی نہیں۔۔۔ پرانے دوست ہیں، ہم جماعت ہیں۔۔۔ ٹیسٹ کا سامان کہاں ہے۔۔۔ یہیں میرے پاس ہی دھرا ہوا ہے۔۔۔ تو تم ٹیسٹ کے سامان کے پاس ایک اجنبی کے ساتھ خوش گپیاں کر رہے ہو۔۔۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔۔۔ بہت فرق پڑتا ہے۔۔۔ اچھا ہم باہر چلے جاتے ہیں۔۔۔ یک نہ شد دوشد۔۔۔ تم باہر چلے گئے تو سامان کا ذمہ دار کون ہوگا۔۔۔ احتیاط کرو، توجہ کرو اور دھیان صرف سامان پر مرکوز کرو کہیں ایسا نہ ہو کہ پرچہ آوٹ ہو جائے۔۔۔ یہ گفتگو سن کر ہمارے دوست صورتِ حال سمجھ گئے اور خود ہی رخصت ہو گئے۔ اور ہمیں واپس یونیورسٹی کے زمانہ طالب علمی میں دھکیل گئے۔

جس کمرے میں ہم ٹھہرے ہوئے تھے۔ اس کے دو حصے تھے۔ پہلے حصے میں صوفے اور میز وغیرہ پڑے ہوئے تھے۔ گویا اسے ہم لاؤنج یا ڈرائنگ روم کہہ سکتے ہیں۔ دوسرے حصے میں ڈبل بیڈ، کرسیاں، ڈریسنگ ٹیبل موجود تھے۔ دونوں حصوں

25 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

کے درمیان دیوار تھی۔ پہلے حصے سے دوسرے حصے میں داخل ہونے کے لئے لکڑی کا دروازہ تھا۔ جسمیں انٹرئل لاک لگا ہوا تھا۔ ایسے کمروں کو سویٹ بھی کہا جاتا ہے۔ ہم اس سویٹ کے دوسرے یعنی بیڈ روم والے حصے میں ٹھہرے۔ اور احتیاطاً ٹیسٹ کا سارا سامان اسی حصے میں رکھوا لیا۔ بڑے بڑے بوسیدہ ٹرنکوں کی موجودگی میں یہ بیڈ روم کم اور کسی فیکٹری کا گودام زیادہ دکھائی دینے لگا۔ سویٹ کے پہلے حصے میں ہمارا سیکورٹی گارڈ قابض ہو گیا۔ جب ہم نے اسے دوسرے کمرے میں جانے کے لئے کہا تو اُس نے بتایا کہ اُسے یہیں رات ٹھہرنے کا حکم ملا ہے۔ دل تو چاہا کہ گارڈ کے دانت توڑ دیں لیکن ہم سوائے اپنے دانت پیسنے کے کچھ نہ کر سکے۔ کھانا کھانے کے بعد ہمیں جلد ہی نیند آ گئی۔ دو تین گھنٹے گزرے ہوں گے کہ ہماری آنکھ کھل گئی۔ چند منٹ کروٹیں بدلتے رہے۔ اچانک ہماری نظر سویٹ کے دونوں حصوں کے درمیان موجود دروازے کے انٹرئل لاک پر پڑی تو اس کے وسط میں موجود چھوٹے سے سوراخ میں ہمیں حرکت کرتی ہوئی آنکھیں نظر آئیں۔ پہلے تو ہمیں یہ وہم ہی لگا لیکن جب اپنے تمام حواس مجتمع کئے تو آنکھیں مزید واضح ہو گئیں۔ یہ ہمارا سیکورٹی گارڈ ہی تھا۔ ایک دم میں ہمارا غصہ آسمان کو چھونے لگا۔ ایک ہی جست میں ہم نے بستر سے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ گارڈ کو پیچھے ہٹنے کا موقع نہ مل سکا۔ ہم نے انتہائی درشت لہجے میں پوچھا۔ یہاں کیا کر رہے ہو۔ وہ بولا، ڈیوٹی۔۔۔ ڈیوٹی کیا مطلب۔ ہم نے مزید اشتعال کا مظاہرہ کیا۔۔۔ جناب، ہر آدھے گھنٹے بعد ملتانى صاحب کا فون آرہا ہے۔ انہوں نے ہدایت کی ہے کہ جب تک آپ سوئے رہیں۔ میں اسی طرح آپ اور ٹرنکوں پر براستہ انٹرئل لاک نظریں گاڑھے رکھوں۔ اس بات پر ہمیں ملتانى کی ذہنی حالت پر شدید دکھ ہوا۔ ساتھ ہی ہم نے گارڈ سے پوچھا۔ ملتانى کے پاس تمہارا موبائل نمبر ہے۔ اُس نے بلا تامل تصدیق کر دی۔ اب ہمیں سارے دن کے واقعات یاد آنے لگے کہ کیسے ملتانى کو ہمارے ہر فعل کی خبر ہو رہی تھی۔۔۔ ہم نے خفگی سے پوچھا۔ تو تم سارا دن ملتانى کو میرے بارے میں بتاتے

26 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

رہے ہو۔ گارڈ نے فوراً نفی کی۔۔۔ نہیں جناب، میں نہیں بتاتا رہا، وہ خود مجھے پوچھتے رہے تھے۔ البتہ اگر پورے آدھے گھنٹے بعد اُن کا فون نہ آتا تو مجھے اُن کو فون پر حالات کی اطلاع دینا ہوتی تھی۔۔۔ سر، میں اپنی ڈیوٹی کے معاملے میں بے بس ہوں۔۔۔ لا حول ولا قوۃ۔

غالباً مرغے رات بھر کی بے کاری و بدکاری سے فراغت پانے کے بعد مومنین کی نیندوں میں دخل اندازی کرنے کے لئے اپنے گلے صاف کر ہی رہے تھے کہ ہماری آنکھ ایک بھونچال کے ساتھ کھلی۔ ذرا حواس بحال ہوئے تو معلوم ہوا کہ دروازے کو اگر چند لمحوں میں نہ کھولا گیا تو شاید پھر کھولنے کی ضرورت ہی نہ رہے۔ وہ خود ہی اکھڑ کر ہم سے بغل گیر ہو جائے گا، اس ایمر جنسی میں فوراً دروازہ کھولا۔ ہماری حالت دیکھ کر دروازے پر موجود لوگ شرمندہ سے ہو گئے اور اپنے کئے کی خود ہی سزا بھگت بیٹھے۔ اُن کی حالتِ غیر دیکھ کر ہم نے اپنے حال پر نظر دوڑائی تو ایکسکیوز می کہہ کر دروازہ بند کر لیا۔ چند منٹوں میں اپنے لباس و احوال کو قبول صورت بنانے کے بعد دوبارہ دروازہ کھولا تو دستک دینے والوں میں مقامی انتظامیہ کے لوگوں کو موجود پایا۔ جن میں مقامی کالج کے پرنسپل بھی شامل تھے۔ کہنے لگے، چونکہ ٹیسٹ کے انعقاد کے آغاز میں صرف چھ گھنٹے ہی رہ گئے ہیں۔ اس لئے ہمیں فوری طور پر تیار ہو کر امتحانی مراکز کی طرف کوچ کر جانا چاہیے۔ عرض کیا کہ ہم بہت جلد یہاں سے کوچ نہیں کر رہے؟ جلدی کا کام شیطان کا۔۔۔ جواب ملا جلدی والا شیطان تاخیر والے فرشتے سے بہتر ہوتا ہے۔ فوراً غسل کر کے لباس تبدیل کیا۔ ناشتے کی ٹیبل پر پہنچے۔ پراٹھے، آلیٹ، چائے وغیرہ سے ناشتہ کیا۔ پرنسپل صاحب نے ٹیسٹ کے مقامی انتظامات پر سیر حاصل گفتگو کی جو اُن کے خیال میں حسبِ حال اور ہماری رائے میں بالکل غیر متعلق بلکہ بکواس تھی۔ اس سے تو بہتر ہوتا وہ ہمیں بہاولپور میں رات کو سینماؤں میں چلنے والی فلموں کے بارے میں ہی آگاہ کر دیتے۔ ہم نے یہ بریفنگ سنتے ہوئے کئی بار اپنی جمائیوں کو جس ٹکنیک سے

27 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

روکا اسے صوفیاء کی اصطلاح میں جس دم کہتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ چونکہ ہم پکے صوفی نہیں ہیں تو کئی بار جس دم کا عمل ناکام بھی ہوا۔

ٹرنگوں کو لا کر سوئے امتحان گاہ روانہ ہوئے تو ہمارے آگے پیچھے پولیس گارڈ ایسے چل رہے تھے جیسے اشتہاری ملزموں کو مخبروں کی مدد سے دبوچنے کے بعد پیشی بگھٹنے کے لئے عدالت لے جایا جاتا ہے۔ ہم نے پرنسپل صاحب سے اس عزت افزائی کی وجہ دریافت کی تو وہ وہی تھی جسے ملتان کہتا تھا کہ کہیں پرچہ آوٹ نہ ہو جائے۔ ٹیسٹ کے لئے اسی کے لگ بھگ مختلف کمرے حاصل کئے گئے جن میں ساڑھے سات ہزار امیدواران کو آزمائش وابتلا کی بھٹی میں سے اس لئے گزارا جانا تھا کہ وہ مزید بھٹیوں کے لئے تیار ہو جائیں۔ پو پھٹتے ہی امیدواران اپنے اپنے قبائل کے ہمراہ میدان کارزار پہنچنے لگے۔ ہم نے ٹرنگوں میں موجود امتحانی ساز و سامان کو پرنسپل کے حوالے کیا۔ جس نے یہ ٹرنگ مقامی عمارات کے ٹیسٹ منعقد کرنے والوں کو پہنچا دیے۔ اس مرحلے کے دوران اتنے فارم، حلف نامے، عہد نامے پُر کروائے گئے جتنے اگر انگریز ہندوستانیوں کو کوہِ نور واپس کرتے تو بھی نہ پُر کرواتے۔ امیدواران اپنی نشستوں اور اُن کی مائیں، بہنیں امتحانی کمروں سے ایک فرلانگ دور جائے نمازوں پر براجمان ہو گئیں۔ البتہ اُن کے ابا جان اپنے بیٹوں، بیٹیوں کی ممکنہ ناکامی سے نبٹنے کے لئے اُن کی ماؤں کو موردِ الزام ٹھہرانے کے لئے منصوبہ بندی کرتے پائے گئے۔

بالآخر ٹیسٹ شروع ہو گیا۔ ہر کمرے میں بیسیوں امیدواران تاخیر سے پہنچے۔ کچھ ایسے تھے جو گرد و نواح کے قصبات و دیہات سے آئے تھے اور اُن کے پاس بہاولپور میں رہنے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ اگرچہ وہ اپنے گھروں سے پہلی دستیاب بس میں سوار ہو کر آئے تھے۔ چند ایسے امیدواران بھی تاخیر سے پہنچے جو جلے وقوعہ پر امتحان شروع ہونے سے گھنٹہ، دو گھنٹے پہلے پہنچ چکے تھے۔ وہ امتحانی کمروں کے ارد گرد نوٹس لئے اپنے رٹے کو آخری شکل دینے میں مصروف رہے۔ کمرہ امتحانات میں امیدواران کی حیرانی

28 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

سے بھری شکلیں تو جا بجا نظر آئیں۔ لیکن ایسے چہرے بھی موجود تھے جو اس ٹیسٹ کی تیاری کروانے والوں کو درجہ شہادت پر پہنچانے کے لئے صرف ٹیسٹ کے ختم ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ امیدواران کی اکثریت نقل کی شکل میں تائید غیبی کی منتظر و طالب رہی۔ چند ایک ایسے بھی تھے جنہوں نے ہم سے براہ راست کسی ایک یا دو سوالات کے بارے میں کہا کہ یہ سوالات اُن کی سمجھ سے بالاتر ہیں۔ وہ ہم سے مدد کے طلبگار ہوئے۔ ہم نے اُن سے پوچھا کہ ان ایک دو سوالات کے علاوہ باقی کا کیا حال ہے۔ کہنے لگے، باقی تمام سوالات پر ہمیں عبور حاصل ہے۔ جواباً عرض کیا۔ کہ آپ ہم سے ایک، دو مخصوص سوالات کے بارے میں استفسار کر رہے ہیں۔ جبکہ ہمیں اس پورے پرچے میں ایک بھی سوال کا جواب نہیں آتا۔۔۔ اس پر انہوں نے ہم پر کسر نفسی کا الزام دھرا اور زندگی میں پہلی مرتبہ ہم اس الزام تراشی پر بے حد مسرور ہوئے۔ ایک امیدوار نے یہ الزام بھی عائد کیا کہ اس ٹیسٹ کی تیاری کروانے والے ادارے کو اُس نے بھاری رقم دی جو ہم تک پہنچائی گئی اور ہم نے جواباً گیس پیپر بھی بھیجا لیکن یا تو گیس ہی درست نہیں تھا یا پھر ہم نے عین وقت پر پرچہ تبدیل کر دیا۔ ہم نے لاکھ وضاحت کی کہ ہم نے یہ پرچہ سوالات ترتیب نہیں دیا بلکہ ہمیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ حرکت کس کی ہے۔ لیکن وہ امیدوار ہمیں ٹیسٹ ختم ہونے کے بعد ملنے کی تاکید کرتا رہا تا کہ حساب بے باک ہو سکے۔ دس پندرہ ایسے امیدوار بھی تھے جو دوران امتحان بے ہوش ہو گئے انہیں فوراً پانی پلایا گیا اور اُن کے خاندان والوں کو اطلاع بھی بھجوائی گئی۔ جس شخص کے ذریعے یہ اطلاع بھجوائی گئی، اُسی نے ہمیں بتایا کہ اُن کے خاندان والے ہمارے خلاف ایف۔ آئی۔ آر کروانے تھانے روانہ ہو چکے ہیں۔

لاکھ منتوں مرادوں کے بعد ٹیسٹ کا مقررہ وقت ختم ہوا تو یوں لگا کہ صدیاں بیت گئی ہوں۔ جوانی کا پیاں اکٹھی کرنے، دوبارہ فارم بھرنے۔ اور ٹرنکوں کو سیل کرنے کا مرحلہ جاں گسل دو گھنٹوں میں ختم ہوا۔ ملتانی کا فون آیا۔ پوچھا کسی مرحلے پر کہیں پرچہ

29 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

آؤٹ تو نہیں ہوا۔ ہم نے کہا ہرگز نہیں۔ ساتھ ہی ملتانی نے فون بند کر دیا۔۔۔ سب کام مکمل کرنے کے بعد اپنے عملے اور میزبانوں کے ہمراہ کھانے کی میز پر پہنچے تو یوں لگا جیسے ہم نے دلی فتح کر لی ہو۔ انواع و اقسام کے کھانے چُن دیے گئے۔ مرغ روسٹ، مٹن کڑاہی، ران روسٹ، چکن منچورین، چکن ود پائین اپیل۔ چکن ود المنڈ۔ کھانے سے ہم بھرپور لطف لے رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ ایک آدھ جملہ ازراہِ آداب ہم نے اپنے میزبانوں کی پر لطف دعوت کی تعریف میں کہنا بھی گوارا کر لیا۔ لیکن جیسے بوقتِ نکاح بات صرف دولہا کے بارے میں ہی بر محل ہوتی ہے۔ ایسے ہی آج کے ٹیسٹ کے کامیاب انعقاد پر ہر طرف فقط ہماری ہی تحسین ہونا چاہیے تھی۔ ہم نے میزبانوں اور اپنے عملے کو بتانا شروع کیا کہ ہم نے اس ٹیسٹ کے لئے کیسی منصوبہ بندی کی۔ کس طرح یہ ممکن ہوا کہ آج کے دورِ پُرفتن میں ہم نے لاہور سے چار پانچ سو کلومیٹر دور آکر یہ ٹیسٹ منعقد کیا اور کیسی کیسی احتیاطی تدابیر اختیار کی گئیں کہ کہیں پرچہ آؤٹ نہ ہو جائے۔۔۔ اسی وقت، عین اسی وقت، پتلون، شرٹ میں ملبوس ایک شخص آیا اور اُس نے پرنسپل صاحب کے کان میں کچھ کہا۔ ہمیں یہ بات نہایت ناگوار گزری۔ دل ہی دل میں اُس شخص کی بد اخلاقی پر اُسے کوسا۔ کیونکہ اُس کی مداخلت کی وجہ سے لوگوں نے ہمارے حسنِ انتظام کی چند تفصیلات کو قابلِ توجہ نہ سمجھا۔ پرنسپل صاحب فوراً اٹھے اور باہر چلے گئے۔ ہم نے موقعِ غنیمت پا کر سویٹ ڈشوں پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا۔ قریباً دس منٹ بعد پرنسپل صاحب واپس آئے تو حیرانی، مایوسی اور غصے کا ملغوبہ اپنے چہرے پر ملے ہوئے تھے۔ چھوٹے ہی بولے۔ آپ تو کہتے ہیں کہ آپ نے اس ٹیسٹ کے لئے بہت محنت اور منصوبہ بندی کی تھی۔۔۔ جواب دیا۔ یہ سب کچھ اس لئے کیا کہ کہیں پرچہ آؤٹ نہ ہو جائے۔۔۔ لیکن پرچہ آؤٹ ہو چکا ہے اور اب منسوخ بھی ہو چکا ہے۔ پرنسپل صاحب نہایت غصیلے لہجے میں دھاڑے۔۔۔ جی کیا کہا آپ نے۔ ہمارا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔۔۔ جی ہاں۔ پرچہ آؤٹ ہو چکا ہے۔۔۔ لیکن۔ لیکن

30 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

آپ کو کیسے معلوم ہے۔ ہم نے اپنی بندوق سے آخری فائر کیا۔۔۔ صرف مجھے ہی نہیں، پورے پاکستان کو یہ بات معلوم ہو چکی ہے۔ تمام ٹی۔وی چینل یہ خبر نشر کر رہے ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ آؤٹ ہونے والا سوالنامہ بھی دکھا رہے ہیں۔۔۔ ہمیں بحر ہند میں غوطے آنے لگے۔۔۔ لیکن حضور داد دیجیے ہمیں۔ اسی حالت میں ہم نے چاکلیٹ، پڈنگ، کھیر کھانے کے علاوہ کولڈ ڈرنک بھی پی۔ البتہ احتیاط یہ کی کہ ٹیسٹ کے بارے میں ایک بھی لفظ نہ بولا۔ پھر پرنسپل صاحب کے ہمراہ ٹی۔وی کورٹج دیکھنے گئے۔ تمام چینلز چیخ و پکار کر رہے تھے۔ امیدواران نے ٹائروں کو بیچ چوراہوں میں آگ لگا رکھی تھی۔ والدین سخت غصے کے عالم میں ٹیسٹ انتظامیہ، جو ہم سمیت دیگر نفوس پر مشتمل تھی، کو قرار واقعی سزا دینے کے مطالبات کر رہے تھے۔ ہم نے قریباً آدھ گھنٹہ حالات پر غور و خوض کرنے کے بہانے راہ فرار کے مختلف زاویوں پر مغز ماری کی۔ ٹیسٹ ختم ہوئے تین، چار گھنٹے ہو چکے تھے۔ جب کچھ سجھائی نہ دیا تو ملتانی سے رابطہ کیا۔۔۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔ پرچہ آؤٹ کیسے ہو گیا، لوگ باہر پھرے ہوئے ہیں۔ کہیں ہجوم حملہ ہی نہ کر دے۔ ہم منمنائے۔۔۔ میرے بس میں ہو تو خود ہجوم میں گھس کر تم پر حملہ کر دوں۔ ملتانی نے لاوا اگلا۔۔۔ لیکن ہم نے کیا کیا، سب کچھ تو ٹھیک ہوا ہے۔ پرچہ کیسے آؤٹ ہو گیا۔ ہم کسمسائے۔۔۔ یہ تو تمہیں ہی معلوم ہوگا۔ ملتانی کے غصے میں تھکاوٹ اور مایوسی گھل چکی تھی۔۔۔ ہم نے اپنے عملے کے ہمراہ سارے ٹرنک بس پر لادے۔ میزبانوں کے تمام ملازم ذرا دور کھڑے ہمیں گھور رہے تھے۔ پرنسپل صاحب نے ایک خفیہ راستے سے ہمیں نکالا۔

ہم لاہور واپس آنے کے لئے ملتان کی طرف روانہ ہوئے۔ ہمارے عملے کے تمام لوگوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ صرف ہمارا سیکورٹی گارڈ نارمل لگ رہا تھا۔ وہ بار بار اپنی بندوق کھولتا، اُس میں گولیاں بھرتا۔ منہ میں کچھ بڑبڑاتا اور ہمیں گھورتا جاتا تھا۔ ساہیوال پہنچنے تک ہمیں درجنوں فون موصول ہوئے۔ کسی نے القابات سے نوازا۔ کسی

31 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

نے دولت کو تمام برائیوں کی جڑ قرار دیا۔ کسی نے سستی و کاہلی کے انسانی تہذیب پر تباہ کن اثرات بیان کئے۔ تنگ آکر ہم فون آف کرنے ہی والے تھے کہ ملتانی کی کال آگئی۔ ہم نے پرانی دوستی کی مروت میں فون سن ہی لیا۔۔۔ ہاں کدھر ہو تم۔۔۔ جہنم میں۔۔۔ خوب وہیں رہو۔ اچھا، ساری بات کھل گئی ہے۔۔۔ ہم نے اپنے اوپر فردِ جرم سننے کے لئے ہمت مجتمع کی۔۔۔ کیا ہوا ہے۔۔۔ دراصل سوالنامہ میں نے مرتب کیا تھا کہ کوئی دوسرا ممتحن کہیں پرچہ آؤٹ نہ کر دے۔ ملتانی بولا۔ اپنی نگرانی میں، میں نے سوالنامے کی کاپیاں بنوائیں، اور جوابی کاپیاں بھی۔ اپنے سب سے قابلِ اعتماد دوستوں کو اس ٹیم میں لیا تا کہ پرچہ آؤٹ نہ ہو جائے۔۔۔ پھر کیا ہم نے کیا پرچہ آؤٹ۔ ہم نے فردِ جرم کی جزئیات سے جان چھڑانے کی کوشش کی۔۔۔ نہیں، تمہیں تو تمہاری کاہلی و نالائقی کے میرٹ پر ہی اس ٹیم میں رکھا گیا تھا، تمہارے تو سامنے بھی سوالنامے پڑا ہوا ہو تو اول تو تمہیں سوالات کی سمجھ ہی نہیں آسکتی، دوم پرچہ آؤٹ کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ کام کرنا پڑتا ہے جو تم کسی بھی صورت میں کرنا پسند نہیں کرتے۔ ملتانی نے اپنے برسوں پرانے انداز میں تجزیہ کیا۔۔۔ پھر ہوا کیا ہے۔۔۔ ہاں۔ ہوا یہ ہے کہ میرے جس آفس بوائے کو میں نے سوالنامے کی کاپیاں بنانے کے لئے کہا تھا۔ وہ زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا۔ اسی لئے اُس کو یہ کام دیا تھا۔ سوالنامے کی ہزاروں کاپیاں ہوئیں اور ایک ہفتے سے زائد وقت میں یہ کام مکمل ہوا تھا۔ میرے آفس بوائے نے ایک ایک سوال شذرات کی شکل میں یاد کیا اور ہر روز گھر جا کر وہ یہ سوالات لکھتا رہا۔ دراصل اُس نے کسی جگہ یہ ڈینگ ماری تھی کہ اسے، صرف اسے، سوالنامے کا پتہ ہے۔ اس چیز کو ثابت کرنے کے لئے وہ اس مشن میں جُت گیا۔ ٹوٹی پھوٹی انگریزی کو وہ تین، چار طالب علموں کی مدد سے سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر کسی ایک امیدوار کو اُس نے ایک ہزار روپے میں یہ سوالنامہ فروخت کر دیا۔ جس نے ٹیسٹ مافیا کو یہ سوالنامہ دس ہزار روپے میں بیچا۔ ٹیسٹ مافیا نے ایک ویب سائٹ بنائی اور فی امیدوار دس ہزار روپے کمائے

32 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

اور آخری رات کو اسی ویب سائٹ پر پرچہ آؤٹ کر دیا۔ یوں یہ پرچہ ہزاروں امیدواران کے ہتھے لگ گیا۔ اور اُس کو آؤٹ کرنے والے لکھ پتی ہو چکے ہیں۔۔۔ ملتان خاموش ہو گیا۔۔۔ میرادل چاہا، اپنے سیکورٹی گارڈ کی بندوق اٹھاؤں اور بذریعہ موبائل فون ملتان کو گولی مار دوں۔۔۔ ابھی ہم یہ سوچ ہی رہے تھے کہ ملتان پھر گویا ہوا۔۔۔ بہاولپور امتحانی مرکز کے تمام سوالنامے، جوابی کاپیاں، دیگر سامان مکمل احتیاط کے ساتھ لے کر آنا۔ کیونکہ امیدواران نے جوابات کے علاوہ سوالنامے بھی واپس کر دیے ہوتے ہیں۔ کچھ سوال تو امیدواران کو یاد رہ جاتے ہیں لیکن پورا سوالنامہ انہیں یاد نہیں رہ سکتا۔ اس لئے تمہارے پاس موجود سوالنامے انتہائی اہمیت کے حامل ہیں۔ انہیں مکمل رازداری کے ساتھ لاہور پہنچاؤ۔ کیونکہ کہیں پرچہ آؤٹ نہ ہو جائے۔

33 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

دارچینی کے دیس میں



کولمبو میں ہمارے مختصر قیام کی یہ آخری رات ہے۔ نصف شب کا وقت ہے۔ ہم نے اپنی پسند کا میوزک آئٹم آن کیا۔ لیکن اس سکوت میں ساز و آواز کی ملاوٹ طبیعت پر گراں گزری۔ میوزک بند کر دیا۔ ایک عجب سماں ہے۔ گہری سیاہ رات ہے۔ مکمل خاموشی ہے۔ صرف ایک ہی آواز سنائی دے رہی ہے۔ سمندر کی لہروں کی آواز۔ لیکن نجانے کیوں یہ آواز نہیں، ایک گہرا سکوت معلوم ہو رہی ہے۔ لہریں ردھم کے ساتھ ساحل سے ٹکراتی ہیں۔ کسی قدر تلی راگ میں ایک میلوڈی سنائی دیتی ہے۔ دولہروں کے ساحل سے ٹکرانے کے درمیان ایک وقفہ آتا ہے جس کے دوران دُور بہت دُور سمندر سے خاموشی کے سکون آور سُر بکھرتے ہیں۔ ایک ایسی موسیقی ہے۔ جو کبھی آواز بن کر پردہ سماعت سے ٹکراتی ہے اور کبھی یہی سُر اور تال گہری خاموشی بن کر روح سے ہمکلام ہوتے ہوئے ہیں۔ ایسی راتیں دہائیوں بعد نصیب ہوتی ہیں۔ ہم اس وقت کولمبو کے نواحی علاقے میں موجود ماؤنٹ لیوینیا ہوٹل میں قیام پذیر ہیں۔ یہ ہوٹل بحر ہند کے عین کنارے واقع ہے۔ سمندر کی لہریں ہوٹل کے وسیع عقبی لان کی دیوار سے ٹکرا کر واپس جا رہی ہیں۔ لان کے وسط میں سوئمنگ پول بنا ہوا ہے۔ دن کی روشنی میں ہمارے کمرے میں موجود شیشے کی دیوار سے پردہ ہٹائیں تو تاحد نظر سمندر نظر آتا ہے۔ ساحل کے ساتھ ساتھ ناریل کے اونچے اونچے درخت ہیں۔ چاندی کے ذروں جیسی صاف چمکدار ساحلی ریت ہلکے سُرمئی رنگ کے سمندری پانی کے ساتھ گھل مل رہی ہے۔ بلند درختوں کے سرسبز چوڑے پتے اور اُن کے درمیان نیم پکے ناریل لٹک رہے ہیں۔ ہوٹل سے ذرا فاصلے پر ساحل کمان کی طرح بل کھاتا ہے۔ جس کے پس منظر میں کولمبو شہر کی بلند و بالا عمارات نظر آرہی ہیں۔ جو اپنی بنت ، دراز قامتی اور خوبصورتی میں نیویارک کی سکائی لائن سے کم نہیں ہیں۔

دو مہینے قبل ہمیں سارک ✱ ورکشاپ میں قومی نمائندگی کا دعوت نامہ موصول ہوا

تھا۔ ویزہ اور ٹکٹ کنفرم ہوا تو روانگی کی تیاری شروع ہو گئی۔ ہمیں لاہور سے کراچی اور وہاں سے کولمبو پہنچنا تھا۔ روانگی سے ایک رات قبل قریباً دس بجے ہوں گے۔ ہم اپنے ٹی وی لاؤنج میں نیم دراز ہو کر کرکٹ میچ دیکھ رہے تھے۔ صاحبو! رات کے کھانے کے بعد چائے کا دور چل رہا ہو، سنسنی خیز میچ لمحہ بہ لمحہ آپ کو امید و ناامیدی کے درمیان ہچکولے دے رہا ہو تو ایک سرشاری کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ ایک لمحے ایک کھلاڑی کو ملک کی آن اور دوسرے میں اُسی کے اجداد کے بارے میں آپ ڈارون کے نظریہ ارتقاء سے محض اتفاق ہی نہیں کر رہے ہوں بلکہ اس کا ابلاغ بھی کر رہے ہوں۔ اور اسی، عین اسی وقت آپ کو اطلاع دی جائے کہ اگلے روز آپ جس فلائٹ سے سفر کرنے جا رہے ہیں، وہ منسوخ ہو گئی ہے۔ تو آپ کی ساری سرشاری ہرن ہو جاتی ہے۔ ہم نے میچ سے توجہ اپنے شیڈول کی طرف مبذول کی تو یاد آیا کہ ہماری لاہور سے کراچی فلائٹ منسوخ ہو گئی ہے جبکہ کراچی سے کولمبو جانے والی پرواز روانہ ہو جائے گی بغیر یہ دھیان کئے کہ ہم کراچی میں ہیں یا لاہور میں۔ بدن میں بجلی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ میچ اور چائے ایک طرف کئے اور فوراً ٹریول ایجنٹ سے رابطہ کیا۔ چھوٹے ہی بولے۔ کیوں صاحب، یہ کیا حرکت ہے۔ کل فلائٹ منسوخ ہو گئی ہے۔ کرائے کی رقم تم کب سے ہڑپ کر چکے ہو۔ تمہیں شرم کرنا چاہیے۔ ایجنٹ صاحب کہنے لگے۔ حضور، میں ٹریول ایجنٹ ہوں، جہازوں کی کمپنی کا مالک نہیں ہوں کہ جہاز میرے حکم کے تابع ہوں۔ کمپنی نے فلائٹ منسوخ کر دی ہے تو میرے شرمسار ہونے سے تو اب نہیں چلے گی۔۔۔ تو اس کا مطلب ہے کہ تم واقعی کرایہ ڈکار گئے ہو۔ ہم نے ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوئے دوسرا وار کیا۔۔۔ جی نہیں۔ اگر آپ بدگمانی کی بکُل ✨ اتاریں تو سو حل ہیں۔ ایجنٹ نے جواب دیا۔۔۔ مثلاً، ہم نے استفسار کیا۔۔۔ مثلاً یہ کہ آپ اپنے پیسے واپس لے لیں پچاس فیصد کٹوتی کے بعد۔ یا اگلی فلائٹ سے چلے جائیں۔۔۔ اگلی فلائٹ کب

پنجابی بمعنی چادر لپیٹنا

36 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

ہے۔۔۔ ہر روز اس کمپنی کی ایک ہی فلائٹ کراچی جاتی ہے۔ کل والی فلائٹ منسوخ ہو گئی ہے تو پرسوں چلے جائیں۔۔۔ ہمیں غوطے آنے لگے۔۔۔ ذرا اوسان بحال کئے اور گویا ہوئے۔ پرسوں کراچی جا کر ہم کیا کریں گے۔ کولمبو جانے والی پرواز تو کل روانہ ہو جائے گی۔ ہم نے بال ایجنٹ کے کوٹ میں پھینکا۔۔۔ ہوووو، یہ بات ہے۔ ایجنٹ نے پہلی بار سنجیدگی کا مظاہرہ کیا۔ بالکل ٹھیک۔ اچھا، اچھا تو کوئی بات نہیں۔ آپ اپنے آدھے پیسے واپس لے لیں۔۔۔ حضرت! بات پورے یا آدھے پیسوں کی نہیں ہے۔ ہمیں ہر حال میں کل دوپہر سے پہلے کراچی پہنچنا ہے تاکہ شام کو کولمبو جانے والی پرواز پر سوار ہو سکیں۔ ہم نے خواستگاری کا مظاہرہ کیا۔۔۔ حضور! ٹریول ایجنٹ کے بزنس میں یہ بڑی قباحت ہے۔ مسئلہ مسافروں کا ہوتا ہے، قصور ایر لائن والوں کا اور کرکٹ میچ کا مزہ بچارے ٹریول ایجنٹ کا کرکرا ہوتا ہے۔۔۔ اب ہم پر راز منکشف ہوا کہ بے رخی جاناں بے سبب نہیں ہے۔۔۔ میچ بھی کوئی دیکھنے کی چیز ہے۔ آپ اپنے روزگار کا خیال کیجیے اور ہمارے کراچی جانے کا بندوبست فرمائیے ہم نے اُسے قائل کرنے کی کوشش کی۔۔۔ بندہ پرور! ہر وہ شے جس میں لطف آتا ہو۔ اُس کی راہ میں روزگار، خاندان، بیوی، بچے حائل ہو جاتے ہیں۔ کبھی ان سب کو چکما دے بھی جائیں تو نیک نامی پھن پھیلانے کھڑی ہوتی ہے۔ ایجنٹ نے اپنا غبار نکال ہی لیا۔۔۔ یہ باتیں کولمبو سے واپسی پر ہوں گی، ہم آپ کو ایسے نسخے بتائیں گے کہ زندگی میں ہر طرف لطف ہی لطف ہوگا۔ فی الحال آپ کسی متبادل پرواز کا انتظام کیجئے۔۔۔ اچھا، قبلہ، کوشش کرتا ہوں۔ لیکن واپسی پر آپ کو لطف والے نسخے کا وعدہ پورا کرنا ہوگا۔۔۔ وعدہ ہر حال میں نبھائیں گے لیکن واپسی پر۔ اور واپسی تبھی ممکن ہے اگر ہم وہاں پہنچ پائیں۔۔۔ چلیں، اس بار بھی میچ کو آپ کی چرب زبانی کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔ فون بند کریں، تھوڑی دیر میں دوسری فلائٹ کا بندوبست کر کے دوبارہ کال کرتا ہوں۔۔۔ فون بند ہوا تو ہم نے پانی کا گھونٹ پیا۔ رات گیارہ بجے ہوں گے۔ ایجنٹ

37 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

نے کال کیا۔ ہم نے جھٹ سے ایسے فون کال موصول کی جیسے ایک مدت راہِ عاشقی میں
تپسیا کرنے کے بعد کسی نوجوان کو پہلی مرتبہ اُس کی محبوبہ نے فون کیا ہو۔۔۔ جی، ہو گیا
بندوبست۔۔۔ جی ہاں، انتظام ہو گیا ہے۔ آپ دوسری ایر لائن سے کراچی جا رہے
ہیں۔ ایک گھنٹہ بعد لاہور سے فلائٹ جا رہی ہے۔ فوراً ائر پورٹ پہنچیں۔ یہ آخری
چانس ہے۔۔۔ کیا کہا تم نے۔ ہم ایک گھنٹے میں کیسے ائر پورٹ سے فلائٹ لے سکتے
ہیں۔ کوئی تیاری نہیں ہے۔ اور ائر پورٹ پہنچنے میں بھی آدھ گھنٹہ لگ جائے گا۔ اور، اور
یہ کہ رات کے آخری پہر کراچی پہنچیں گے اور اگلی شام کو کولمبو کی فلائٹ ملے گی۔ خیر وہ تو
تم نے ائر لائن والوں سے کہہ دیا ہوگا کہ ہمیں بہترین ہوٹل میں ٹھہرا دیا جائے۔ ہم
ہڑ بڑائے۔۔۔۔۔ کراچی میں قیام کا بندوبست آپ خود کر لیں، یہ کوئی مشکل نہیں ہے۔
ائر پورٹ پر تمام معلومات موجود ہوں گی۔ وقت کم ہے، آپ فوراً ائر پورٹ پہنچیں۔
آپ کا ٹکٹ وہیں آپ کو تیار ملے گا۔ ہم ہمیشہ اپنے دوستوں اور گاہکوں کا بے حد خیال
رکھتے ہیں۔ میں اپنے بیڈ روم میں پہنچ چکا ہوں۔ فون بند کرنے لگا ہوں۔ شاید آج
رات دوبارہ آپ سے بات نہ ہو سکے گی۔ اپنا خیال رکھیے گا۔ اور کولمبو سے واپسی پر
میرے لئے کوئی نہ کوئی فرحت بخش شے ضرور لائیے گا۔ اور ہاں یاد آیا، یہ جو متبادل
فلائٹ آپ کو ابھی دی گئی ہے، اس کے پانچ ہزار روپے اضافی ہیں۔ آپ پرانے
دوست ہیں۔ واپسی پر ادا کر دیجیے گا۔ ہمارا کام ہی آپ کو سہولت پہنچانا ہے۔ خدا
حافظ۔۔۔ اور لائن کٹ گئی، ہم نے بہتیرا ہیلو، ہیلو کہا۔ لیکن جواب ندارد۔۔۔ افراتفری
میں اہل خانہ کو آواز دی۔ اور اپنی روانگی کا پروگرام بتایا۔ سوٹ کیس میں فوراً کپڑے
ٹھونسے گئے۔ جوتے، جرابیں، پرفیوم، شیو کا سامان، متعلقہ کاغذات گاڑی میں پہنچائے
گئے۔ بقیہ پیکنگ گاڑی میں گھر اور ائر پورٹ کے درمیان سرپٹ بھاگتے ہوئے کی گئی۔
ائر پورٹ پہنچے۔ جہاز میں سوار ہونے والے ہم آخری مسافر تھے۔

رات کے پچھلے پہر ہم کراچی ائر پورٹ پہنچے۔ سامان کندھے پر رکھا اور ہوٹل کی

تلاش شروع کی۔ ائر پورٹ پر مختلف ہوٹلوں کے نمائندے موجود تھے۔ ہم نے ایک دن کے لئے ہوٹل بک کروایا۔ ٹیکسی میں سوار ہوئے اور ہوٹل پہنچ گئے۔ جلدی سے کمرے کی چابیاں حاصل کی اور سامان پھینک کر سو گئے۔ آنکھ کھلی تو دوپہر کا وقت تھا۔ غسل کیا، کھانا کھایا اور دوبارہ کراچی ائر پورٹ کی طرف چل نکلے۔ بین الاقوامی پرواز پر سوار ہونے کے لئے مسافروں کو امیگریشن، کسٹم اور سیکیورٹی کے مراحل سے گزرنا ہوتا ہے۔ جس میں دو تین گھنٹے لگ جاتے ہیں۔ لنکا ائر لائن کے طیارے میں سوار ہوئے تو خلاف توقع سلیقہ، آداب اور انتظام دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی۔ سفر آرام دہ تھا۔ چار گھنٹے میں ختم ہو گیا۔ کولمبو ائر پورٹ پہنچے تو رات گہری ہو چکی تھی۔ ایک ٹیکسی ڈرائیور ہمارے نام کا کتبہ اٹھائے انتظار کر رہا تھا۔ اُس نے خوشدلی سے ہمارا سامان اٹھایا اور گاڑی میں رکھ دیا۔ گاڑی چند منٹوں بعد کولمبو جانے والی شاہراہ پر فراٹے بھر رہی تھی۔ قریباً پون گھنٹے بعد ہم کولمبو کے نواحی علاقے ماؤنٹ لیوینیا میں واقع ہوٹل میں پہنچ چکے تھے۔

ماؤنٹ لیوینیا ہوٹل ایک سہ منزلہ عمارت میں واقع ہے۔ یہ پُر شکوہ عمارت نو آبادیاتی عہد میں تعمیر کی گئی تھی۔ رہائشی کمرے، طعام خانے، برآمدے نہایت کھلے اور ہوادار ہیں۔ حوض تیراکی ہوٹل کے عقبی حصے میں سمندر کے بالمقابل واقع ہے۔ حوض کا فرش شوخ نیلے رنگ کی سلوں سے بنایا گیا ہے اور اس کے تین اطراف میں کھلی فضا میں کھانے کے میز لگائے گئے ہیں۔ حوض اور سمندر کی درمیانی جگہ پر آرام دہ کرسیاں اور سوئمنگ بیڈ پڑے ہوئے ہیں۔ یہ ہوٹل دراصل انگریز گورنر تھامس میٹ لینڈ کی رہائش گاہ تھی جو 1805 میں سری لنکا آیا تھا۔ اُس کی آمد سے قبل انگریز گورنر کی رہائش گاہ موجود تھی۔ لیکن اُسے وہ پسند نہ آئی۔ اُس نے اپنے عہدے کے شایانِ شان رہائش گاہ بنانے کا منصوبہ بنایا۔ سمندر کے عین کنارے پر موجود یہ جگہ اُسے بھاگئی۔ اُس نے یہاں ایک عالی شان محل نما گھر تعمیر کروایا۔ یہاں قیام کے دوران اس کی دل بستگی کا

39 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

سامان بھی فراہم کیا جاتا تھا۔ اتفاق سے ایک مرتبہ اُس کے سامنے ایک رقص طائفہ لایا گیا۔ جس میں لیوینا نامی جواں سال خوب رو رقاصہ شامل تھی۔ لیوینا کی ماں سنہالی اور باپ پرتگال کا رہنے والا تھا۔ اُس نے بارگاہِ حاکم میں دل موہ لینے والا رقص پیش کیا۔ رقاصہ غضب کی عشوہ طراز تھی۔ دورانِ رقص اُس نے کمال انہماک کے ساتھ تال میل پر توجہ مرکوز کئے رکھی، اور گورنر کی طرف دیکھنا گوارا نہ کیا۔ جب محفل کا رنگ جم گیا تو لیوینا نے چند خاص مقاماتِ رقص پر ایسی دزیدہ نگاہی سے کام لیا کہ گورنر کے دل پر چوٹ پڑی۔ اور جب رقص اپنے کمال کو پہنچا تو اُس نے نگاہ کا ایسا تیر پھینکا جو گورنر کے جگر سے پار ہو کر روح میں پیوست ہو گیا۔ اور وہ اپنے دل و جاں کھو بیٹھا۔ اُس محفل کے بعد گورنر کے شب و روز لیوینا کے دھیان میں گزرنے لگے۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ وہ اپنے مقام و مرتبے کی وجہ سے دیسی رقاصہ سے کھلے عام ملنے سے قاصر تھا۔ اُس وقت کولمبو میں گورے کافی تعداد میں موجود تھے جو مختلف سرکاری امور سرانجام دے رہے تھے۔ گورنر کو اندیشہ تھا کہ اگر کسی گورے یا گوری کو اُس کے لیوینا کے ساتھ معاملے کی بھنک بھی پڑ گئی تو یہ بات فوراً برطانیہ میں اعلیٰ حکام تک پہنچ جائے گی اور اُس کا عہدہ چھن جائے گا۔ دوسرے جانب وہ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور بھی تھا۔ افسری اور عاشقی دونوں اکٹھے نہیں چل سکتے۔ لیکن گورنر نے اس مشکل کا حل ڈھونڈ ہی لیا۔ رقاصہ کے گھر کے پاس ایک متروک کنواں تھا۔ گورنر نے وہاں سے ایک سرنگ کھدوائی جو سیدھی اُس کی رہائش گاہ میں موجود مے خانہ تک جاتی تھی۔ لیوینا بڑی مشکل سے دن گزارتی۔ یہی حال گورنر کا بھی تھا۔۔۔ اب سمجھ آیا کہ وہ سلطنت جس میں آفتاب غروب نہیں ہوتا تھا، آج اپنی ہی حدود میں سورج کیوں ڈھونڈتی پھرتی ہے۔ سر شام لیوینا عاشقِ بامراد کے پاس پہنچ جاتی۔ عشقِ حاکم ہو تو عاشق کو حسن کے چرنوں میں بیٹھنا ہوتا ہے اور اگر عاشقِ حاکم ہو تو حسن کو اپنے ہی قدموں میں بٹھا لیتا ہے۔ دونوں پہروں ملاقات سے لطف اندوز ہوتے۔ پوہ پھٹنے سے قبل لیوینا بذریعہ سرنگ اپنی

40 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

کوٹھڑی میں واپس آ کر سو جاتی اور گورنر علی الصبح اپنے دفتر میں مصروف ہو جاتا، جمائیوں کے ساتھ۔ سارا دن جھک مارتا۔ سرکاری مصروفیات میں مگن رہتا۔ شام ہوتے ہی پھر پردے واہ ہو جاتے اور وہ ہوتا اور لیوینیا ہوتی۔ اسی عاشقی و حاکمیت میں چھ برس کٹے تو گورنر کو مالٹا تعینات کر دیا گیا۔ جانے سے قبل اُس نے ایک قریبی گاؤں کی جاگیر لیوینیا کے نام کر دی اور اپنے تئیں عشق کی لاج رکھ لی۔ اہل مغرب کے نزدیک یہ ادا کمالِ وفا ہے، ہاں اہل مشرق کے یہاں کچھ بھی شایانِ وفا نہیں ہوتا، مادی اشیاء تو بالکل بھی نہیں البتہ دل و جاں متاعِ حیات ہوتی ہیں۔ وجہ اُس کی یہ ہے کہ عشاق کے پاس ہوتے ہی دل و جاں ہیں دیگر فضولیات کی اُس کے ہاں گنجائش نہیں ہوتی۔ لیوینیا اور میٹ لینڈ کے بعد ۱۹۴۷ء میں اس عمارت کو ہوٹل بنا دیا گیا اور اسکے موجد و معمار کی تسکینِ روح کے لئے اس کو ماؤنٹ لیوینیا ہوٹل کا نام دے دیا گیا۔

ہوٹل کے کمرے میں ہم نے اپنا سامان کھولنا شروع کیا۔ رات کے پونے بارہ بج چکے تھے۔ اگلی صبح سارک ورکشاپ شروع ہو رہی تھی جس میں ہم نے پریزنٹیشن (Presentation) دینا تھی۔ تھکاوٹ سے جسم میں درد شروع ہو چکا تھا۔ ہم نے لیپ ٹاپ کھولا اور اپنا کام شروع کر دیا۔ ایک گھنٹے میں کام مکمل ہو گیا۔ ہم نے شکر ادا کیا اور سونے کی تیاری کرنے لگے۔ کمرے کی لائٹ بند کی۔ اوڑھنے کے لئے کمبل کھول رہے تھے کہ فون بجنا شروع ہو گیا۔ ہیلو۔۔۔ جی آپ خیریت سے پہنچ گئے۔ ورکشاپ کے میزبان نے کرم کا مظاہرہ کیا۔۔۔ جی، بالکل۔۔۔ کوئی ضرورت ہو تو بتائیے گا۔۔۔ جی ضرور عرض کریں گے۔ ہم فون بند کرنے ہی لگے تھے کہ میزبان پھر گویا ہوئے۔ معذرت چاہتا ہوں، ایک گزارش کرنا تھی آپ سے۔ جی کیا، ہم نے بے دلی سے پوچھا۔۔۔ وہ، وہ دراصل پاکستان سے تین مندوب بلوائے گئے تھے۔ جن میں سے دو مقرر ہیں جنہوں نے پریزنٹیشن دینا تھی۔ ایک تو آپ ہیں اور دوسرے صاحب تشریف نہیں لائے، صبح ورکشاپ کے پہلے سیشن میں اُن کی پریزنٹیشن ہے۔ کیا

41 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

آپ اُن کی پریزنٹیشن بھی کر لیں گے۔ مجھے یقین ہے، آپ کر لیں گے۔ آپ کی معلومات وسیع ہیں، آپ کے لئے کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔۔۔ اپنی وسعتِ معلومات کی جھوٹی تعریف ہمیں زندگی میں پہلی بار بُری لگی۔۔۔ عرض کیا، آدھی رات گزر چکی ہے۔ ہم بے حد تھکے ہوئے ہیں۔ نئی پریزنٹیشن تیار کرنے کے بہت وقت درکار ہوتا ہے۔۔۔ نہیں، نہیں۔ آپ کے لئے کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ ہم نے بڑی چھان پھنک کرنے کے بعد آپ کا انتخاب کیا تھا کیونکہ آپ بہت لائق آدمی۔۔۔ ہماری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ لائق بنیں تو نیند غارت ہوتی ہے، سوئیں تو نالائق کا دھبہ لگتا ہے۔ کیا کریں۔ ہمیں ایک نیا نسخہ سوچنا۔ اپنی ساکھ اور نیند کو بچانے کا۔۔۔ دوسری پریزنٹیشن کا موضوع کیا ہے۔۔۔ جی بہت بہتر، میں ابھی آپ کو ایک ای میل بھیج رہا ہوں۔ ساری تفصیلات اُس میں موجود ہیں۔ آپ اُسے پڑھ لیں۔ پھر بات کریں گے۔ خدا حافظ۔۔۔ ہم بستر سے اٹھے، لیپ ٹاپ آن کیا۔ اتنی دیر میں ای میل آچکی تھی۔۔۔۔۔ موضوع دیکھا تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ یہ تو ہمیں موضوع ہی سمجھ نہیں آرہا۔ پریزنٹیشن کیا بنائیں گے۔ ای میل کے آخر میں لکھا ہوا تھا۔ یہ ہمارے وطن کی عزت کا سوال ہے جس کا تحفظ ہم پر لازم ہے۔ براہِ مہربانی یہ پریزنٹیشن تیار کر کے ورکشاپ کے افتتاحی اجلاس میں تشریف لائیے۔ پہلا پورا سیشن آپ ہی کے نام ہے اور آپ اُس کے واحد مقرر ہیں، افتتاحی کلمات کے بعد۔ اس وقت نصف شب کا وقت ہے۔ میں نے علی الصبح ورکشاپ کے انتظامات کے لئے بیدار ہونا ہے۔ اس لئے فوراً سو رہا ہوں۔ امید ہے پہلے سیشن میں آپ سے ملاقات ہوگی۔ آپ کی پریزنٹیشن سے پہلے یا ہو سکتا ہے بعد میں۔ یاد دہانی کے لئے مکرر عرض ہے۔ پہلے سیشن میں آپ ہی واحد مقرر ہیں۔۔۔ ای میل پڑھ کر دل تو چاہا، منتظمین کا گریبان پکڑ لوں۔ واپس پاکستان چلا جاؤں یا پھر سو جاؤں۔ بھاڑ میں جائے افتتاحی سیشن۔ لیکن کیا کروں، وطن کی عزت کا سوال ہے اور اپنی ساکھ کا بھی۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ پریزنٹیشن تیار کرنا شروع کر دی۔ جمائیوں اور نیند

42 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

کے وقفوں کے دوران کام کرتے رہے رات کے پچھلے پہر تک۔ جب مواد پورا نہ ہوا تو ویب سے تصاویر ڈھونڈ کر پریزنٹیشن میں رنگ بھرنے کی کوشش کی۔ جیسے تیسے چار بجے پریزنٹیشن مکمل ہوئی۔ کس معیار کی، یہ ہمارے سوچنے کی بات نہیں تھی۔

صبح سویرے الارم کے شور سے ہڑبڑا کر بیدار ہوئے۔ عجلت میں تیار ہو کر ڈائننگ ہال پہنچے، ناشتہ کیا۔ اور ورکشاپ ہال میں جا دھمکے۔ وہاں سارک ممالک کے مندوبین موجود تھے۔ غیر رسمی تعارفی سلسلہ چل رہا تھا۔ ہندوستان، نیپال، سری لنکا، مالدیپ، بنگلہ دیش کے نمائندے اپنے اپنے بارے میں آگاہ کر رہے تھے۔ ہمارے وفد میں دو افراد موجود تھے۔ ہمارے ساتھ شیریں نغمہ بھی وفد میں شامل تھیں۔ سرخ و سفید رنگت۔ تیکھے نقوش۔ سکن ٹائٹ جینز اور شرٹ میں ملبوس، نہایت حسین و جمیل تھیں۔ انگریزی فرفر بولتی تھیں اور وہ بھی امریکی لہجے میں۔ عمر انیس بیس برس ہوگی یا ہمیں یہی لگ رہی تھی۔ کیونکہ ہماری زوجہ کا ہمارے خلاف جو دائمی مقدمہ ہے، اُس کی شق اول کے مطابق ہمیں اپنی بیوی کی عمر دو گنی اور دوسری عورتوں کی نصف دکھائی دیتی ہے۔ شیریں سے بات چیت شروع ہوئی تو ہم اُس کے رسیلے لب و لہجے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ بات وہ ادا و ناز سے کرتی تھیں۔ اور اُس پر یہ خوبی مستزاد کہ اُس کی معلومات کا دائرہ نہایت معقول تھا۔ یعنی محدود بلکہ بے حد محدود۔ معلومات کی کثرت سے شخصیت میں جو کثافتی رنگ پیدا ہوتا، اُس سے وہ بالکل پاک تھیں۔ سارک ممالک، ورکشاپ کے اغراض مقاصد، طریقہ کار۔ یہ سب باتیں ماؤنٹ لیونیا ہوٹل کے رومانوی رنگ کو گدلا کر رہی تھیں۔ اور یہی اور صرف یہی وجہ تھی کہ وہ اس گدلے پن سے اپنے آپ کو بچائے ہوئے تھی۔ ورکشاپ شروع ہوئی۔ تمام ممالک کے قومی ترانے بجائے گئے۔ افتتاحی تقریر محض پانچ منٹ میں ختم ہو گئی اور سٹیج پر ہمیں کھڑا کر دیا گیا۔ ہم نے آدھ گھنٹے کی پریزنٹیشن میں پچاس کے لگ بھگ سلائیڈز دکھا دیں۔ درمیان میں کچھ مندوبین نے سوالات کرنے کی بدعت بھی شروع کی۔ جس کا جواب ہم نے یہ دیا کہ

43 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

سوال و جواب پر یزنیشن کے آخر میں ہوں گے۔ مواد ختم ہو گیا تو ہم نے دو تین ویڈیوز بھی چلا دیں۔ جب یہ سب ختم ہوا تو ہم اگلے سیشن کے پندرہ منٹ بھی ہڑپ کر چکے تھے۔ منتظمین نے دو سوالوں کی اجازت دی۔ جو ہم نے موضوع سے متعلقہ معلومات کی بجائے علم الکلام سے بھگتا دیئے۔ سیشن ختم ہوا، تالیاں بجیں، منتظمین کے سانس بحال ہوئے اور ہماری دھاک بیٹھ گئی۔ ورکشاپ دو دن تک جاری رہی۔ مختلف مندوبین اپنے اپنے موضوع پر گفتگو کرتے رہے۔ سارک ممالک کے وسائل و مسائل سمجھنے اور سمجھانے کے حوالے سے یہ ایک بھرپور اجلاس رہا۔ درمیان میں چائے اور کھانے کے وقفے بھی آئے۔ ورکشاپ کے اختتام پر مندوبین کے اعزاز میں عشائیہ دیا گیا۔ جس میں سری لنکا اور ہندوستان کے پکوانوں سے مہمانوں کی تواضع کی گئی۔ یہاں بھی اکثر مندوبین علمی و نظریاتی آلودگی پھیلا کر کھانے کا مزما کر کرتے رہے۔ البتہ شیریں اس آلودگی سے دور اپنے موبائل فون پر بات چیت کرتی رہی۔ جب بات چیت میں وقفہ آتا تو وہ گیمز میں لگن ہو جاتی۔ ہم نے موقع غنیمت جانا۔ کھانے کی پلیٹ اٹھائی اور اُس سے گپ شپ شروع کر دی کیونکہ کسی کھر درے، سپاٹ اور کام کے جنونی (workaholic) مرد سے خوب و دوشیزہ کی رفاقت ہزار گنا بہتر ہے۔ ورکشاپ میں دلچسپی تو خیر دور کی بات ہے۔ اُسے اس کے موضوعات کا بھی علم نہیں تھا۔ شیریں! جب تمہیں اس ورکشاپ میں دلچسپی ہی نہیں ہے تو تم یہاں آئی کیوں تھی۔ وہ دراصل میں اسلام آباد میں بور ہو رہی تھی تو میں نے اپنی ممی سے کہا کہ مجھے گھومنے کے لئے ننھیا گلی جانا ہے۔ میرے ماموں بھی اُس وقت موجود تھے۔ انہوں نے کہا کہ ننھیا گلی ہم سب اکٹھے چلیں گے دو ہفتوں کے بعد۔ فی الحال میں مصروف ہوں۔ البتہ میں تمہیں اسی ہفتے کولمبو بھیج دیتا ہوں۔۔۔ تو کیا تمہارے ماموں کسی بڑے عہدے پر مامور ہیں۔۔۔ جی، وہ سیکریٹری ہیں۔ کسی وزات کے۔۔۔ کس وزارت کے۔۔۔ یہ تو مجھے معلوم نہیں، دو تین روز بعد اُن کا ڈرائیور مجھے میرا ٹکٹ اور ویزہ دے گیا تھا۔ سو میں کولمبو

44 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

آگئی۔۔۔ تو کیا تمہارے ماموں کو ہم بھی ماموں کہہ سکتے ہیں۔ یہ سوال ہم شیریں سے پوچھ نہ سکے۔۔۔ بنگلہ دیش کے مندوب مطیع الرحمن اور اُن کی بیگم سے خوب گفتگو رہی۔ اُن کی بیگم نے ہمیں پوچھا۔ لاہور میں انارکلی بازار اب بھی موجود ہے۔۔۔ صرف موجود نہیں۔ پوری آب و تاب کے ساتھ خواتین اور سیاحوں کی خریداری کا مرکز ہے۔۔۔ صرف خواتین کیوں۔ مردوں کا وہاں شاپنگ کرنا منع ہے کیا۔۔۔ منع ہی سمجھ لیں کیونکہ ہمارے یہاں کمانے کی ذمہ داری خاوند کی اور مکانے کی بیوی کی ہے۔۔۔ اچھا آپ یہ بتائیں، لاہور میں کنیئر ڈکالجز موجود ہے۔۔۔ بالکل ہے اور بہت شاندار ہے۔ لیکن آپ کیوں پوچھ رہی ہیں۔ ہمیں تجسس ہوا۔۔۔ وہ دراصل بنگلہ دیش بننے سے پہلے میں وہاں پڑھتی تھی اور شاپنگ کرنے انارکلی جایا کرتی تھی۔ مطیع بھی لاہور میں ہی پڑھ رہے تھے، وہیں ہماری پہلی ملاقات ہوئی تھی جس کا نتیجہ شادی کی شکل میں برآمد ہوا۔ بیگم نے یہ کہتے ہوئے مطیع کی طرف دیکھا۔ مطیع الرحمن کو بجلی کا جھٹکا لگا۔ ہاں۔ بالکل میں وہیں انجینیئر نگ یونیورسٹی میں طالب علم تھا۔ وہ وقت بہت یاد آتا ہے۔ لاہور بہت یاد آتا ہے۔ ورکشاپ سے فراغت پانے کے بعد ہم نے کولمبو دیکھنے کا پروگرام بنایا۔ ہوٹل سے ٹیکسی لی اور کولمبو شہر روانہ ہوئے۔۔۔ خوب تو دارلحکومت میں تم ہمیں کونسے مقامات دکھا رہے ہو۔ ہم نے ٹیکسی ڈرائیور سے پوچھا۔۔۔ ہم تو کولمبو جا رہے ہیں، وہاں آپ جس جگہ کہیں گے، میں آپ کو لے جاؤں گا۔۔۔ وہی، وہی۔ دارلحکومت کولمبو میں قابل ذکر کونسے مقامات ہیں۔ ہم نے خوشدلی سے پوچھا۔۔۔ جی۔ دارلحکومت کولمبو نہیں سری جے وردھنا پورے کوٹے ہے۔ ڈرائیور نے جواب دیا۔۔۔ کیا! کیا نام لیا تم نے دارلحکومت کا۔ ہم نے حیرت سے پوچھا۔۔۔ سری جے وردھنا پورے کوٹے۔۔۔ وہ کیا ہوتا ہے۔۔۔ وہ دارلحکومت کا نام ہے۔۔۔ یہ جو تم بول رہے ہو، یہ شہر کا نام ہے۔۔۔ جی، بالکل۔۔۔ تو کیا کولمبو دارلحکومت نہیں ہے۔۔۔ ہے بھی اور نہیں بھی۔ ڈرائیور نے ہماری الجھن میں اضافہ کیا۔۔۔ سرکاری طور پر تو سری جے وردھنا پورے کوٹے

45 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

دارالحکومت ہے۔ ویسے بہت سارے ادارے اور کام کولمبو میں ہیں۔ اصل میں کوٹے کولمبو کا نواحی علاقہ ہے۔۔۔ کوٹے کیا ہے۔ ہمیں کچھ سمجھ نہ آیا۔۔۔ وہ دراصل سری جے وردھنا پورے کوٹے کو مختصراً کوٹے ہی کہتے ہیں۔۔۔ کوٹے اور کولمبو دونوں جڑے ہوئے ہیں یا یوں کہہ لیں کوٹے کولمبو کے اندر ایک علاقے کا نام ہے۔۔۔ اب ہمیں صورتِ حال کا کچھ ادراک ہوا۔۔۔ سری لنکا کو انگریزوں سے ۱۹۴۸ء میں آزادی ملی تھی۔ اُس وقت ملک کا نام سیلون تھا۔ ۱۹۷۲ء میں اس کا نام بدل کر سری لنکا رکھ دیا گیا۔ ملک کا رقبہ پینسٹھ ہزار مربع کلومیٹر اور آبادی لگ بھگ دو کروڑ ہے۔ یہ ایک جزیرہ ہے۔ جس کے ہمسایہ ہندوستان اور مالدیپ ہیں۔ ہمارے یہاں سال میں دو مرتبہ مون سون کا موسم آتا ہے۔ مئی سے جولائی تک جنوب مغرب میں اور دسمبر سے جنوری تک شمال مشرق میں۔ ہمارے ملک کا نقشہ موتی نما ہے۔ اس لئے ہم اسے گوہر ہندوستان بھی کہتے ہیں۔ ہماری شرح خواندگی ننانوے فی صد ہے۔ جو دنیا کے کسی بھی ترقی یافتہ ملک کے برابر ہے۔ جنوبی ایشیاء میں تو ہمارا مقابلہ ہی نہیں ہے۔ ڈرائیور نے ہمیں سری لنکا سے متعارف کروایا۔ یہ ایک قدیم ملک ہے۔ ہماری تین ہزار سالہ تاریخ تو مختلف حوالوں سے ثابت ہے۔ جبکہ مختلف تاریخ دانوں کے مطابق یہ خطہ سوا لاکھ سال سے پانچ لاکھ سال تک پرانا ہے۔ ڈرائیور نے بڑھانکی۔۔۔ ہاں، ہاں۔ لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ جب آدم جنت سے دنیا میں تشریف لائے تھے تو اُن کو سری لنکا میں کوہِ آدم کی چوٹی پر اتارا گیا تھا تا کہ وہ زمین پر نہ گر جائیں اور انہیں چوٹ نہ لگ جائے۔ ہم نے جواب دیا۔۔۔ اب ڈرائیور کو کچھ سمجھ نہ آیا کہ ہم تاریخ پر بات کر رہے ہیں یا اُس کا چیزہ لے رہے ہیں۔۔۔ سنبھل کر کہنے لگا۔ آپ مسلمان ہیں۔ کیونکہ یہ مسلمانوں کا خیال ہے۔۔۔ کوہِ آدم وسطی سری لنکا میں قریباً سات ہزار فٹ اونچا مخروطی پہاڑ ہے۔ اس کی چوٹی کے قریب بارہ فٹ لمبا ایک پاؤں کا نشان ہے۔ ہندوؤں کے نزدیک یہ شیواجی کے پاؤں کا نشان ہے۔ کچھ عیسائیوں کے نزدیک یہ سینٹ تھامس کا، جبکہ دیگر عیسائیوں

46 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

اور مسلمانوں کے خیال میں یہ آدم کے پاؤں کا نشان ہے۔۔۔ خوب، تو پھر حقیقت کیا ہے۔ ہم نے پوچھا۔۔۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ بدھ مت کے بانی بدھا کے پاؤں کا نشان ہے۔ زائرین موم بتیاں ہاتھ میں لئے بدھا کے پاؤں کی زیارت کے لئے اس پہاڑ پر چڑھتے ہیں۔۔۔ چلیں، جس کا بھی ہے۔ تم بدھ مت سے ہو۔۔۔ ہاں، بالکل میں بدھ مت پر یقین رکھتا ہوں۔ سری لنکا میں زیادہ لوگ بدھ مت مذہب سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔ تقریباً ستر فیصد لوگ بدھ ہیں۔ تیرہ فیصد ہندو، دس فیصد مسلمان اور سات فیصد عیسائی ہیں۔ ڈرائیور نے ہماری معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔۔۔، شام ڈھل رہی تھی۔ ہم کولمبو کے وسط سے گذر رہے تھے۔۔۔ کہیں دور سے مغرب کی اذان سنائی دی۔ موزن کی آواز صاف سنائی نہیں دے رہی تھی۔ البتہ وقت اور آواز کے ردھم سے ہم نے اندازہ کیا کہ اذان ہی ہے۔ ساتھ ہی ڈرائیور نے دونوں ہاتھ جوڑے اور سر تعظیم سے جھکایا۔۔۔ دوسرے مذہب کی تکریم کا یہ جذبہ دیکھ کر ہم بہت متاثر ہوئے اور دل ہی دل میں اُسے کرائے کے علاوہ ٹپ دینے کا بھی ارادہ کر لیا۔۔۔ اچھا تو تم دوسرے مذاہب کا احترام کرتے ہو۔ ہم نے خوشی سے پوچھا۔۔۔ جی، ہاں۔ میں ہر مذہب کا احترام کرتا ہوں۔۔۔ جی تو تم نے اذان کی آواز سنتے ہی اپنا سر بندگی کے انداز میں جھکایا تھا۔ خوب، بہت خوب۔ ہم نے اُسے داد دی۔۔۔ جی، اذان کیا ہوتی ہے۔۔۔ اُس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔۔۔ بھئی یہ جولاؤڈ سپیکر سے ابھی آواز آرہی تھی، جس کے اکرام میں تم نے معافی کے انداز میں ہاتھ جوڑے اور سر جھکایا تھا۔ یہ دراصل مغرب کی اذان تھی۔ ہم نے جواب دیا۔۔۔ نہیں، نہیں۔ یہ تو بدھ مت کی عبادت گاہ سے شام کی عبادت کی صدا تھی۔ میں نے تو اُس کے سامنے سر جھکایا تھا۔ ڈرائیور نے وضاحت کی۔۔۔ ساتھ ہی ہمارا صلح گل کا فلسفہ زمین بوس ہو گیا۔۔۔ ہم نے خاموشی سے شہر دیکھنے کی طرف توجہ مبذول کی۔ بے پناہ حیرت ہوئی کہ سری لنکا میں ٹریفک بے حد نظم و ضبط کے ساتھ چل رہا تھا۔ شام کے وقت، دفتری اوقات ختم ہونے

47 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

کی وجہ سے، شاہرات گاڑیوں سے بھری ہوئی تھیں۔ لیکن نہ کہیں ٹریفک جام، نہ ہارن کی بے ہنگم آوازیں، اور گالم گلوچ نہ ہاتھ پائی۔ سب اپنی قطار میں دھیرے دھیرے چل رہے تھے۔ جونہی ٹریفک لائٹس سرخ ہوئیں، تمام ٹریفک ساکت ہو گیا اور دوسری طرف سے گزرنے والوں کو جگہ دے دی۔ ایسا ترقی یافتہ ممالک میں تو ہوتا دیکھا تھا۔ لیکن سری لنکا میں یہ ایک بے حد حیران کن اور دلچسپ تجربہ تھا۔۔۔ ہم ابھی ٹریفک پر غور کر رہی رہے تھے کہ ڈرائیور نے ایک بڑی دکان کے سامنے گاڑی پارک کی اور کہا۔ آئیں، میں آپ کو کچھ خاص اشیاء دکھاتا ہوں۔۔۔ ہم دکان میں داخل ہوئے تو پتہ چلا کہ یہ قیمتی پتھروں کی دکان ہے۔ یہاں پر ہیرے جواہرات اپنی آب و تاب کے ساتھ سجے ہوئے تھے۔ زمرد، یاقوت، پکھراج، لعل۔۔۔ صاحبو! ہم نے سری لنکا آنے سے پہلے سوچا تک نہ تھا کہ یہاں ایسے ایسے قیمتی و خوشنما پتھر موجود ہوں گے۔ سری لنکا کے مختلف علاقوں میں قدرتی طور پر یہ جواہرات پائے جاتے ہیں۔ ان کی قیمتیں چند ہزار سے لے کر ملین ڈالروں میں تھیں۔۔۔۔۔ ہم نے ونڈو شاپنگ مکمل کی تو ڈرائیور سے پوچھا۔۔۔ یہاں کیوں لے کر آئے ہو۔۔۔ کہنے لگا۔ سیاح زیادہ تر یہیں شاپنگ کرتے ہیں، سو میں آپ کو یہاں لے آیا۔۔۔ اچھا یہ بتاؤ تمہیں یہ دکاندار گاہک کو یہاں لانے کے لئے پیسے سری لنکا کے روپوں میں ادا کرتے ہیں یا ڈالروں میں۔۔۔ پیسے تو مجھے تب ملیں گے اگر آپ کچھ خریدیں گے۔۔۔ تمہیں ہماری معاشی حالت کے بارے میں غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہمارا تو آنے جانے کا کرایہ بھی سارک والوں نے ادا کیا ہے۔۔۔ ساتھ ہی ڈرائیور کے موڈ میں کر خنگی آئی۔ کہنے لگا۔ پہلے بتا دیتے، میں ایسے ہی اپنا وقت برباد کر رہا ہوں۔۔۔ اور ساتھ ہمارا بھی۔ ہم نے بھی خفگی دکھائی۔۔۔ آپ کا وقت بھی قیمتی ہے کیا۔ ڈرائیور حیرت سے بولا۔۔۔ چھوڑو بھئی۔ ہمیں سری لنکا کی کوئی ایسی جگہ اور چیز دکھاؤ جس کا تعلق یہاں کی دھرتی سے ہو۔ ہم نے اپنے تئیں فلسفہ جھاڑا۔۔۔ مثلاً، کیا ہے آپ کے ذہن میں۔۔۔ مثلاً، مثلاً۔۔۔ یہاں کی چائے، دار

48 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

چینی، ربڑ، مصالحے مشہور ہے۔۔۔ صاحب، آپ پاکستان واپس بحری جہاز میں جائیں گے۔ اُس نے استفسار کیا۔۔۔ کیا مطلب، ہم نے پوچھا۔۔۔ مطلب یہ کہ چائے، دار چینی، ربڑ، مصالحے تو بوریوں میں دوسرے ملکوں میں جاتے ہیں اور بوریاں بحری جہازوں میں لادی جاتی ہیں۔۔۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ سارک والوں نے آپ کو آنے کے لئے ہوائی جہاز اور واپسی کے لئے بحری جہاز کا ٹکٹ دیا ہے۔۔۔ ایسا استدلال ایک ٹیکسی ڈرائیور بھی کر سکتا ہے۔ یہ ہمیں کولمبو میں ہی معلوم ہوا۔۔۔ اچھا، تم چھوڑو ان باتوں کو۔ ویسے بھی چائے، مصالحے تو کہیں کھیتوں یا گوداموں میں ہی ہوں گے۔ کولمبو جیسے بڑے شہر میں بھی تو دیسی اور ارزاں اشیاء ہوں گی۔۔۔ خوب، کولمبو میں تو اتنا کچھ ہے کہ مہینوں کم پڑ جائیں گے دیکھنے کے لئے۔ ڈرائیور کے چہرے پر رونق واپس آگئی۔ وہ ہمیں کولمبو کی اونچی عمارتوں والے مہنگے علاقوں میں گھماتا ہوا ایک گھنٹے بعد ایک درمیانے درجے کے علاقے میں لے گیا۔ اچانک گاڑی ایک گھر کے سامنے رکی اور بغیر کچھ بتائے گھر میں داخل ہو گیا۔ گھر کے باہر مقامی زبان میں لکھا ہوا بورڈ لگا ہوا تھا۔ جس کی ہمیں کچھ سمجھ نہیں آئی۔ صرف دو تین منٹوں کے بعد، وہ گھر کے گیٹ کے قریب آیا اور ہمیں اندر آنے کا کہہ کر پھر غائب ہو گیا۔ ہم نے پانچ سات منٹ انتظار کیا۔ لیکن ڈرائیور کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ ہم گاڑی سے نیچے اترے اور گھر کے دروازے کے پاس پہنچے۔ گھر کے صحن میں ایک درمیانی عمر کا آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اُس نے خوشدلی سے اندر آنے کا کہا اور بتایا کہ آپ کا ڈرائیور سامنے والے کمرے میں موجود ہے۔ ہم بھی کمرے میں پہنچ گئے۔ ہمیں دیکھتے ہی ڈرائیور نے ہمیں صوفے پر بٹھالیا۔ ساتھ ہی ایک سانولی سلونی لڑکی کمرے میں داخل ہوئی اور ہمیں اور ڈرائیور کو ٹھنڈے کولڈ ڈرنکس پیش کئے جو ہم نے غٹا غٹ پینے شروع کر دیئے۔۔۔ اچھا تو یہ ہمیں ریسٹورنٹ میں لے آیا ہے۔ ہم نے خود کلامی کی۔۔۔ ابھی چند لمحے ہی گزرے تھے کہ دو لڑکیاں اور چار پانچ ادھیڑ عمر کی خواتین آکر ہمارے ارد گرد براجمان ہو

49 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

گئیں۔ کسی نے ہمارا نام پوچھا۔ کسی نے وطن دریافت کیا۔ کسی نے خوش آمدید کہا۔ ہمیں کچھ سمجھ نہ آئی۔ ہم نے ڈرائیور کو ایک طرف کیا اور پوچھا۔۔۔ یہ کون ہیں اور یہ کیا جگہ ہے۔۔۔ یہ بڑی اچھی جگہ ہے۔ یہ لڑکیاں یہاں کام کرتی ہیں۔ خوبصورت بھی ہیں اور سستی بھی۔ ڈرائیور نے آخری گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔۔۔ سستی! کیا مطلب۔۔۔ ڈرائیور نے ہماری جانب غور سے دیکھا اور کہا۔۔۔ ہاں۔ ان جیسی اور اس قیمت میں پورے کولمبو میں نہیں ہیں۔۔۔ اب بات سمجھ آئی۔۔۔ ہم نے ڈرائیور سے واپس جانے کا کہا اور تیزی سے واپس گاڑی میں جا بیٹھے۔۔۔ وہ بھی ہمارے پیچھے پیچھے گاڑی میں آ بیٹھا۔۔۔ ہم نے اُسے ہوٹل واپس جانے کا کہا۔ اور منہ دوسری طرف کر لیا۔۔۔ پانچ منٹ ڈرائیور کرنے کے بعد وہ بولا۔۔۔ آپ کو پسند نہیں آئیں وہ ساری لڑکیاں۔۔۔ ہم نے تو تمہیں یہاں کی مقامی اشیاء دکھانے کو کہا تھا۔ تم ہمیں کہاں لے گئے۔ ہم نے اپنے غصے کو جھٹکتے ہوئے کہا۔۔۔ عام طور پر سیاح قیمتی پتھر خریدتے ہیں یا ایسی لڑکیاں۔۔۔ سری لنکا میں ان کے علاوہ بھی تو بہت کچھ ہوگا۔ ہم نے آہستگی سے کہا۔۔۔ بہت کچھ ہے۔ آپ کی دلچسپی کس چیز میں ہے۔۔۔ ہمیں فوری طور پر کوئی چیز بھجائی نہ دی۔۔۔ مثلاً یہاں کا مشہور ہے، مشہور ہے۔۔۔ ہاں، یاد آیا۔ کرکٹ مشہور ہے۔۔۔ کرکٹ، لیکن آج تو کولمبو میں کوئی میچ نہیں ہو رہا۔ ڈرائیور نے کہا۔۔۔ اچھا۔ اچھا۔ اس کے علاوہ یہاں کیا مشہور ہے۔۔۔ ہاں۔ سری لنکا میں تو بہت دہشت گردی ہوتی تھی۔ وہاں گزری ہیں لڑائی مار کٹائی ہے۔۔۔ یہ سوغات اب آپ کے ہاں کی زیادہ مشہور ہے۔ ابھی چند برس ہی گزرے ہیں ہماری کرکٹ ٹیم پر پاکستان میں دہشت گردوں نے حملہ کیا تھا۔ ڈرائیور نے منہ پھلاتے ہوئے کہا۔۔۔ چند منٹ ہم دونوں خاموش رہے۔ اتنے میں ہم اپنے ہوٹل پہنچ گئے۔ ڈرائیور کو کرایہ ادا کیا۔ لابی میں آ بیٹھے۔ سانس لیا۔ ٹھنڈے پانی کا گلاس چڑھایا۔ ڈرائیور کی آخری بات کی چوٹ بہت گہری تھی۔۔۔

50 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

ہمد مِ دیرینہ کا ملنا



تو یہ جو تم لندن میں مٹر گشت کر رہے ہو۔ اس کے لئے پیسے کہاں سے آئے ہیں تمہارے پاس۔ عذیر نے ہمیں فون پر ہی آئینہ دکھا دیا۔۔۔ یار، وہ بات دراصل یہ ہے کہ۔۔۔ ہم نے اپنا دفاع کرنے کے لئے جواز بنانا شروع ہی کیا تھا کہ وہ پھر بولا۔۔۔ رہنا تم نے میرے گھر میں ہے، ائر پورٹ سے میں تمہیں لوں گا۔ کھانا تم نے میرے ساتھ کھانا ہے۔ گھومنے کے لئے بھی میں تمہارے ساتھ ہوں، تو تمہیں پیسے کس کام کے لئے چاہئیں۔ اُس نے ہمیں چاروں شانے چت کر دیا۔۔۔ پھر بھی ویزہ تو چاہیے ناروے کے لئے۔ ہم نے آخری وار کیا۔۔۔ یار تمہارے بھی عجیب مسائل ہیں۔ یورپ میں رہتے ہوئے ہمیں تو کسی دوسرے یورپی ملک میں جانے کے لئے ویزے کی ضرورت نہیں ہوتی۔۔۔ خیر۔ میں تمہارے ویزے کے لئے ایک خط لکھ دیتا ہوں۔ لندن میں ناروے کے سفارت خانے میں جمع کروا دو گے یا وہ بھی میں آکر جمع کرواؤں۔۔۔ ہم اتنے تساہل پسند بھی نہیں ہیں۔ تم خط بھیج دو، باقی کارروائی ہم خود سر انجام دیں گے۔ ہم نے سینہ پھٹا کر کہا۔ اگلے روز ہماری درخواست ناروے کے سفارت خانے میں جمع ہو گئی۔ دو تین دن گزرے ہوں گے، ہمیں انٹرویو کے لئے بلاوا آ گیا۔۔۔ پوچھا، ناروے کیوں جانا چاہتے ہیں۔۔۔ بولے، دوست سے ملنے کے لئے۔۔۔ کیا دوست سے ملنا واقعی اہم ہے۔ کب سے وہ آپ کے دوست ہیں۔۔۔ یونیورسٹی کے دور میں اکٹھے ہی جھک مارا کرتے تھے۔۔۔ کتنے دنوں کے لئے جانا چاہتے ہیں۔۔۔ جتنے دن عذیر ہمیں سنبھال سکے۔۔۔ پہلیاں نہ بچھوائیں، اپنا شیڈول

52 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

بتائیں۔۔۔ کوئی زیادہ نہیں، بس ویک اینڈ پر جائیں گے۔۔۔ گویا آپ جمعے کی رات کو لندن سے اوسلو جائیں گے اور اتوار کو واپس آجائیں گے۔۔۔ جی، ہاں۔ باقی ایام میں عذیر مزدوری کرتا ہے۔ ہمیں کہاں سنبھالے گا۔۔۔ خوب۔ ایک ہفتے تک پاسپورٹ آپ کو بھیج دیا جائے گا۔ آپ تشریف لے جائیں۔۔۔ ہم سفارت خانے سے باہر نکلے۔ لندن کے جس علاقے میں سفارت خانے ہیں، اس کا نام ہیل گریو اسکوائر ہے۔ یہ مرکزی لندن میں واقع ہے اور معروف ہائیڈ پارک اس کے قریب ہی ہے۔ سفارت خانے کے ساتھ ہی ایک پارک ہے جس میں کرسٹوفر کولمبس کا مجسمہ نصب ہے۔ کولمبس ایک کرسی پر بیٹھا ہوا ہے اور اُس کے ہاتھ میں کاغذات کا ایک پلندہ ہے۔ غالباً یہ مختلف خطوں کے نقشے ہیں۔ یہ مجسمہ سپین والوں نے تحفے کے طور پر دیا تھا۔ ہم یہ خوبصورت علاقہ دیکھتے ہوئے زیر زمین ٹرین اسٹیشن پہنچے۔ گاڑی میں سوار ہوئے اور واپس اپنے گھونسلے پہنچ گئے۔ لندن میں جس گھر اور کمرے میں ہم مقیم تھے، اُسے رہائشگاہ کہنا مناسب نہ ہوگا۔ کیوں کہ رہائش گاہ سے ایک وسعت کا احساس ہوتا ہے۔ جس سائز کی ہماری رہائش تھی۔ اُسے گھونسلہ ہی کہا جانا چاہیے۔ راستے اور گھونسلے میں ہم نے سوچا۔ کہ ناروے تو ہم جا ہی رہے ہیں۔ کیوں نہ کسی دوسرے یورپی ملک بھی گھوم آئیں کیونکہ ناروے کے ویزے، جسے شیجن ویزہ کہتے ہیں، کے طفیل ہم ناروے میں داخل ہو کر کسی بھی دوسرے یورپی ملک جا سکتے ہیں۔ دل ہی دل میں ہم نے سویڈن، ڈنمارک وغیرہ کا پروگرام بھی بنانا شروع کر دیا۔ تین دن بعد ہمیں پاسپورٹ موصول ہوا۔ جس پر جمعے سے اتوار تک کا شیجن ویزہ چسپاں تھا۔ صرف تین دن کا ویزہ دیکھ کر ہمارا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ سویڈن، ڈنمارک درمیان میں ہی رہ گیا۔ فوری طور پر کسی سستی ائر لائن کا ٹکٹ تلاش کرنے لگے۔ انٹرنیٹ پر تلاش شروع ہوئی تو معلوم ہوا کہ یورپ میں ایسی ائر لائنز بھی کام کرتی ہیں جو انتہائی سستی ہیں۔ رایان ائر لائن کا ٹکٹ ہمیں صرف دس پاؤنڈ میں مل گیا۔ یعنی لندن سے اوسلو صرف دس پاؤنڈ میں۔ اس

53 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

سے زیادہ پیسے تو ایک دن میں لندن میں زیر زمین ٹرین پر سفر کرنے میں خرچ ہو جاتے ہیں۔ کیا بات ہے یورپ کی، ہم نہایت مسرور ہوئے اور یہی خبر سنانے کے لئے اپنے دوست کو فون کیا۔۔۔ ہیلو ملتان۔ کیسے ہو، تم تو ویسے ہی ہو گے جیسے ہمیشہ ہوتے ہو۔ خیر بتانا یہ تھا کہ میں عذیر سے ملنے اوسلو جا رہا ہوں۔ یار بہت سستا ٹکٹ ملا ہے۔ صرف دس پاؤنڈ کا۔۔۔ اوسلو کا بھی اوسلو کا۔۔۔ کیا کہا تم نے پیدل کون جا سکتا ہے اوسلو۔ اور پیدل جانے کا ٹکٹ کب ہوتا ہے۔ جہاز کا ہے۔۔۔ بحری جہاز کا نہیں، ہوائی جہاز کا۔۔۔ کیا! فلائٹ ہیتھرو ائر پورٹ سے نہیں جاتی۔۔۔ سٹینسٹیڈ (Stanstead) ائر پورٹ سے جاتی ہے۔ وہ کہاں ہے۔۔۔ کوئی بات نہیں، ہم وہاں سے چلے جائیں گے۔۔۔ کہاں اترتی ہے۔ ریگی ائر پورٹ پر۔۔۔ وہ کتنا دور ہے اوسلو سے۔۔۔ کتنا، پچاس کلومیٹر۔ کوئی بات نہیں، وہاں تو عذیر ہمیں لینے کے لئے آ ہی جائے گا۔۔۔ صرف ہینڈ بیگ ہی لے کر جا سکتے ہیں۔۔۔ تو کیا ہوا، دو دن کے لئے تو جا رہے ہیں۔ ہم نے زیادہ سامان کس لئے لے کر جانا ہے۔۔۔ ویسے یہ ساری باتیں تم حسد میں کر رہے ہو۔ یار تم بھی ساتھ چلو بڑا مزہ آئے گا۔ لیکن تم تو سیگریٹ بھی بیوی سے پوچھ کر پیتے ہو، وہ تمہیں کب اجازت دے گی، اوسلو جانے کی۔۔۔ اب تم بیٹھے سڑتے کڑھتے رہو۔ ہم جا رہے ہیں اوسلو۔ خدا حافظ۔

جمعے کو علی الصبح ہم سٹینسٹیڈ جانے والی بس میں سوار ہوئے اور پرواز سے چار گھنٹے قبل ہی ائر پورٹ پہنچ گئے۔ ہمارا خیال تھا کہ بین الاقوامی پرواز پر سفر کرنے کے لئے کسٹم، امیگریشن، سکیورٹی کے تمام مراحل پر لمبی قطاریں ہوں گی۔ لیکن وہاں جا کر معلوم ہوا کہ یہاں تو تمام کام مشینوں کے ذریعے ہوتا ہے۔ اور یہ تمام مراحل پانچ منٹ میں طے ہو جاتے ہیں۔ جلد ہی ہم اپنا بورڈنگ کارڈ تھا مے مسافروں کے لاؤنج میں پہنچ چکے تھے۔ پرواز وقت پر روانہ ہوئی۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم نے پوچھا کہ یہاں چائے سے مسافروں کی تواضع کی جائے گی یا کھانے سے۔ معلوم ہوا دونوں دستیاب ہیں مگر

پیسے ادا کرنا ہوں گے۔ کیونکہ یہ ایک سستی آر لائن ہے۔ اس میں کھانا، چائے، مشروبات قیماً ہی دستیاب ہوتے ہیں۔۔۔ سوا گھنٹے کے بعد ہم ریگی آر پورٹ پہنچ چکے تھے بغیر کچھ کھائے پئے۔ آر پورٹ پر عذیر، اُس کا بیٹا اور اُس کے ابو انتظار کر رہے تھے۔ گویا ہمارے استقبال کے لئے تین نسلیں آئی ہوئی تھیں۔ عذیر بے حد اپنائیت سے بغل گیر ہوا۔۔ دوست! تم ہمارے استقبال کے لئے اپنے ابو اور بیٹے کو بھی ساتھ لے آئے ہو۔ ہم نے احسانمندی کا مظاہرہ کیا۔۔۔ وہ دراصل کمال کی ممی مصروف تھی۔ وہ اپنے بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔۔۔ کوئی بات نہیں کوئی ضروری کام ہوگا۔ ویسے بھی تین افراد استقبال کے لئے آئے ہوئے ہیں، وہ بھی اوسلو میں۔۔۔ حنا کی تو آج چھٹی تھی۔ مصروفیت تو کوئی نہیں تھی، وہ تو سوئمنگ کرنے گئی ہوئی تھی۔ کمال گھر میں حنا کی عدم موجودگی میں الٹی سیدھی حرکتیں کرتا ہے۔ چیزیں خراب کرتا ہے۔ میں اس لئے اسے ساتھ لے آیا۔ ابو کو آر پورٹ کے ساتھ ہی ایک دفتر میں کام تھا۔ واپسی پر انہیں بھی وہاں لے جاؤں گا۔۔۔ اور میری کمپنی نے مجھے ایک مہمان کو آر پورٹ سے ریسو کرنے کا کہا ہے۔ ابھی اُس کو بھی لینا ہے۔ یہ کہہ کر عذیر نے ہمیں ہماری اوقات یاد دلا دی۔ ہمارا سامان رکھنے کے لئے گاڑی کی ڈگی کھلی تو وہاں ایک بیلچہ پڑا ہوا دیکھا۔ فوراً پوچھا۔ بیلچہ تمہارے کُل وقتی کام میں استعمال ہوتا ہے یا جزو وقتی میں۔ عذیر نے جواب میں مسکرا کر اپنے ابو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ جی۔ ابو جی میں نے ٹھیک ہی کہا تھا آپ سے کہ یہ آتے ہی بیلچے کے بارے میں میرا انٹرویو کرے گا۔ اُس کے ابو بھی ہمارے تبصرے سے محظوظ ہوئے۔۔۔ تم ذرا ہمارے ساتھ چلو تو تمہیں پتہ چلے گا کہ یہاں اس قدر برف پڑی ہوتی ہے کہ ہر شخص کو اپنی گاڑی میں بیلچہ رکھنا پڑتا ہے۔ ناروے میں کسی بھی راستے پر آپ کو برف ہٹانے کا مرحلہ درپیش آسکتا ہے۔ اس لئے بیلچہ یہاں ایک ضروری اوزار کے طور پر سفر میں ساتھ رکھنا پڑتا ہے۔ آئی سمجھ، تم نے تو زندگی میں اپنی فریج سے برف اٹھا کر اپنے گلاس میں نہیں ڈالی، تمہیں کیا

55 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

پتہ ہو یہاں برف سے نبٹنے کے لئے کیسے کیسے کام کرنا پڑتے ہیں۔ عذیر نے ہماری گو شمالی کی۔ گاڑی میں سوار ہوئے اور زیر زمین پارکنگ سے باہر نکلے تو ہر طرف برف ہی برف تھی۔ سڑکوں، پہاڑوں، وادیوں، میدانوں میں پڑی برف بہت خوبصورت دکھائی دیتی ہے مگر دو شرائط کے ساتھ۔ پہلی یہ کہ یہ صورت حال مستقل نہ ہو۔ برف کہیں کہیں ہو اور کبھی کبھی ہو۔ دوسری یہ کہ ناظر ہماری طرح برف دیکھتے ہی نزلہ، زکام کا شکار نہ ہو جائے۔ ہماری تو یہ حالت ہے کہ زکام کا شکار کوئی شخص صرف فون یا ای میل ہی کر دے تو ہمیں تین دن تک چھینکیں آتی رہتی ہیں۔ بخار اُس کے بعد ہوتا ہے اور کھانسی اُس کے بھی بعد۔ شادی کے بعد ہم ہنی مون نامی خواری کے سلسلے میں سوات گئے تھے۔ اُس مہم کی تصاویر ہماری بیگم نے سنبھال کر رکھی ہوئی ہیں۔ جن میں ہمارے پس منظر میں برف سے لدے ہوئے پہاڑ ہیں۔ جب بھی کبھی یہ تصاویر دیکھتے ہیں تو سردی سے کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ ہمارے احباب کپکپی کی وجہ سردی ماننے سے انکاری ہیں۔۔۔ یار عذیر! ہر طرف برف ہی برف ہے تمہیں تو اپنی گاڑی کے پہیوں پر لوہے کی زنجیریں بھی چڑھانی چاہئیں جیسے دوسری جنگِ عظیم کی فلموں میں پولینڈ میں چلتے ہوئے فوجی ٹرکوں کے پہیوں پر چڑھی ہوتی ہیں۔۔۔ پندرہ منٹ پہلے تو تم مجھے بیلچہ بردار مزدور ثابت کر کے مزا لے رہے تھے اب کیا ہوا ہے۔ عذیر نے پوچھا۔۔۔ ہم نے حالات کی سنگینی کو دیکھتے ہوئے چُپ رہنے کو ہی ترجیح دی۔۔۔ تھوڑی ہی دور گئے ہوں گے کہ ہم چیخے۔ عذیر تم غلط سڑک پر گاڑی ڈرائیو کر رہے ہو۔ سامنے سے کوئی گاڑی آئی تو حادثہ ہو جائے گا۔۔۔ عذیر نے ایک لمحے کے لئے توقف کیا۔ پھر قہقہہ لگایا اور کہنے لگا۔ یہاں پر سڑک کے دائیں ہاتھ پر ہی چلتے ہیں۔ پاکستان اور برطانیہ میں ہم بائیں ہاتھ چلتے ہیں۔ بے فکر رہو، ہم ٹھیک جا رہے ہیں۔ سامنے سے کوئی گاڑی نہیں آئے گی، یہ سڑک یک طرفہ ٹریفک کے لئے ہے۔۔۔ یہ وضاحت سن کر ہم پہلے مطمئن اور بعد میں شرمندہ ہوئے۔

56 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

پچاس کلومیٹر سے زائد فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم عذیر کے گھر پہنچ گئے۔ حنا بھابھی نے دروازے پر ہمارا استقبال کیا۔ یہ ایک دو منزلہ گھر تھا جس میں داخل ہوتے ہی ہمیں جوتے اتارنے کا حکم ہوا۔ گھر کے فرش اعلیٰ لکڑی سے بنائے گئے تھے۔ گھر میں داخل ہوں تو ایک کم چوڑا اور نسبتاً لمبا راستہ تھا جس کے دائیں جانب باورچی خانہ تھا اور یہ راستہ ایک کشادہ کمرے میں کھلتا تھا۔ جس کی ایک دیوار میں قریباً ۷۲ انچ کا ٹی وی نصب تھا۔ ٹی وی کے سامنے نہایت کھلے اور چوڑے سائز کے صوفے پڑے تھے۔ ایک کونے میں نہایت قیمتی ونیس کھانے کا میز اور کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ آدھے فرش پر قالین بچھا ہوا تھا۔ یہ کمرہ بیک وقت ڈرائنگ روم، ڈائننگ، ٹی۔ وی اور گپ شپ لاؤنج تھا۔ اس کمرے کے ساتھ ایک بڑا بیڈ روم تھا۔ کچن جدید طرز پر بنایا گیا تھا۔ گھر کی کلر سکیم سے اندازہ ہوتا تھا کہ اہل خانہ رنگوں کے معاملے میں اچھے ذوق کے حامل ہیں۔ بالائی منزل پر جانے کے لئے لکڑی کا زینہ لگا یا گیا تھا۔ یہاں پر ایک عام استعمال کا کمرہ اور دو بیڈ روم بنے ہوئے تھے۔ گھر کی دونوں منزلوں میں ایک ایک ٹائلٹ اور باتھ روم بنایا گیا تھا۔ گھر کی تزئین و آرائش سے خاتون خانہ کا جمالیاتی ذوق منعکس ہو رہا تھا۔ عذیر کے والد گرامی سے ہمارا پہلا تعارف دو دہائیاں قبل ہوا تھا۔ انہوں نے پچاس کی دہائی میں کراچی کے میڈیکل کالج سے طب کی تعلیم حاصل کی تھی اور ساری عمر اسی شعبے سے منسلک رہے تھے۔ ہم انہیں ڈاکٹر صاحب یا انکل کے نام سے پکارتے تھے۔ مطالعے کے وہ شیدائی نہیں، نشینی تھے۔ تاریخ، بین الاقوامی سیاسیات، سماجیات و معاشرت پر اُن کی گہری نظر تھی۔ انگریزی زبان کے دلدادہ تھے۔ جب جوش میں ہوتے تو فرماتے کہ علم دراصل انگریزی زبان ہی ہے باقی تمام علوم تو ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ جوش کی کیفیت انہیں روزانہ ایک مرتبہ فی پھر تو معمول کے مطابق ہوتی ہی تھی۔ لیکن چونکہ ہم جیسے پرانے نیاز مندوں سے وہ زیادہ التفات برتتے تو انگریزی زبان کی اساسی حیثیت کی یاد دہانی اپنی یا ہماری اونگھنے کی

حالت میں ایک گھنٹے میں تین چار مرتبہ کرتے۔ جبکہ حالتِ بیداری میں ہر موضوع پر گفتگو کے اول آخر انگریزی زبان کی حمد و ثناء بیان کرتے۔ اور جب کبھی حاضر جوابی پر اترتے تو انگریزی زبان کے علاوہ باقی تمام موضوعات سے مکمل اجتناب کرتے۔ ایک مرتبہ زمانہ طالب علمی میں ہم نے گستاخی کی اور عرض کیا۔ کوئی بھی زبان، بشمول انگریزی، دراصل ذریعہ اظہار ہے۔ جس کو کسی بھی علم کے ابلاغ کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ مراد یہ کہ علم تصور ہے اور بنیادی شے ہے، زبان اس کا اظہار کرتی ہے۔ جس بناء پر ثانوی۔۔۔ ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کی وسیع پیشانی پر شکنیں واضح ہو گئیں۔ ساتھ ہی ہم نے پینتر بدلا۔۔۔ البتہ انگریزی چونکہ بہت وسیع زبان ہے اس لئے کسی بھی علم کے صحیح ابلاغ کے لئے دیگر زبانوں سے زیادہ موزوں ہے۔ ہمارے اس بیان کا اتنا فائدہ ہوا کہ انہوں نے ہمیں گمراہ اور کم علمی کے درجے پر فائز کر دیا ورنہ وہ ہمیں چوپایہ سمجھ کر کھرلی سے باندھ کر چارہ کھلاتے۔۔۔ جواب میں انہوں نے پہلے تو انگریزی کے فضائل بیان کئے۔ پھر ہماری بات کے رد میں دلائل دیے۔ بعد ازاں سب و شتم کیا اور ہمیں گھر سے نکال دیا ہمراہ عذیر کے۔ کیونکہ ایسے لڑکے کو وہ بیٹا ہی نہیں سمجھنا چاہتے تھے جس کے دوست بقول اُن کے انگریزی زبان کی ثانوی اہمیت کے قائل ہوں۔ عذیر ہمارے ہمراہ پورا ایک ہفتہ ہاسٹل میں پڑا رہا کہ کب ابوجی یہ واقعہ بھولیں اور کب وہ اپنے گھر میں داخل ہو سکے۔۔۔ ہم نے لاونج میں صوفے پر بیٹھتے ہی کہا۔ ڈاکٹر صاحب، ناروے کی اپنی زبان ہے۔ جو ظاہر ہے انگریزی سے کم تر ہے۔ کیا عذیر کو کسی انگریزی زبان والے ملک نہیں جانا چاہئے تھا۔ ڈاکٹر صاحب کھل اٹھے۔ بالکل صحیح کہا تم نے۔ میں نے عذیر کو بہت مرتبہ سمجھایا لیکن اس کی اپنی مجبوریاں ہیں۔ اس کی جاب یہاں ہے۔۔۔ جاب تو برطانیہ میں بھی مل سکتی ہے۔۔۔ ہاں، مگر وہاں اسے اپنا سسرال نہیں ملے گا۔ اب تم ہی بتاؤ سسرال اور انگریزی زبان میں سے کسی ایک چیز کو منتخب کرنا ہو تو کیا کرنا چاہئے۔۔۔ ظاہر ہے، سسرال کو۔ ہم نے اپنے گریبان میں

58 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

جھانکتے ہوئے رائے دی۔۔۔ تو گویا تم اور عزیز دونوں ایک ہی تھالی کے چٹھے بٹے ہو۔ اور آج بھی اتنے ہی بے وقوف ہو جتنے بیس برس قبل تھے۔ انہوں نے ہماری تواضع کی۔۔۔ ڈاکٹر صاحب! انگریزی کے بارے میں تو ہمارا کامل ایمان ہے کہ یہ اُم العلوم ہے لیکن سسرال کی دھونس اور دہشت گردی کی وجہ سے تکیہ کیا ہوا ہے۔ ہم نے نہایت کمزور دفاع پیش کیا۔۔۔ ڈاکٹر صاحب کو یہ اطمینان بہر حال ہو گیا کہ ہم انگریزی زبان کی اہمیت سمجھ چکے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے دیگر موضوعات پر بھی بات کرنا گوارا کر لی۔۔۔ تو ناروے میں آپ میڈیکل پریکٹس کرتے ہیں، ہم نے منہ کا ذائقہ بدلہ۔۔۔ نہیں، اب میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔۔۔ تو سارا دن اوسلو گھومتے پھرتے ہوں گے۔۔۔ سارا دن تو نہیں کبھی کبھار گھومنے نکل جاتا ہوں۔۔۔ پوتے اور پوتی کو پڑھاتے ہیں۔۔۔ ہاں جب وہ چاہیں، تب پڑھا دیتا ہوں۔۔۔ تو زیادہ وقت تو پھر بور ہی ہوتے ہوں گے۔۔۔ بالکل نہیں۔ مجھے تو وقت ہی نہیں ملتا پڑھنے میں ہی دن گزر جاتا ہے۔۔۔ کیا پڑھتے ہیں۔۔۔ آجکل جدید انگریزی گرامر پڑھ رہا ہوں۔۔۔ اب ہماری زبان گنگ ہو گئی، کیا تبصرہ کریں، سوچنے لگے۔۔۔ ویسے ڈاکٹر صاحب جب آپ پاکستان میں میڈیکل پریکٹس کیا کرتے تھے، اُس وقت آپ مصروفیت کی وجہ سے انگریزی زبان سیکھنے اور سکھانے پر زیادہ توجہ نہیں دے سکتے تھے، اب آپ کے پاس شاندار موقع ہے انگریزی کے حوالے سے۔ ہم نے بڑی مشکل سے راہ نکالی۔۔۔ نہیں، ایسا نہیں۔ بات یہ ہے کہ میڈیکل پریکٹس کا مقصد لوگوں کی صحت بحال کرنا ہوتا ہے۔ لیکن ہمارے ڈاکٹر ایک غلطی کرتے ہیں، وہ علاج کرتے ہیں تاکہ مریض صحتمند ہو جائے لیکن یہ نہیں سوچتے کہ مرض ختم ہونے کے بعد اُسے کیا کرنا چاہیے۔ ڈاکٹر صاحب نے بالکل نئی زمین دریافت کی اپنی غزل کی جس کی ہمیں بالکل ہی سمجھ نہ آئی۔ پوچھا، ڈاکٹر کا کیا تعلق اس بات سے کہ مریض شفا یاب ہونے کے بعد کیا کرتا ہے۔۔۔ ڈاکٹر صاحب نے زور سے میز پر ہاتھ مارا۔ بالکل میں تمہیں یہیں لانا

59 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

چاہتا تھا۔ تم اور ہمارے ہاں کے ڈاکٹر برابر کے ناقص العقل ہیں۔۔۔ اچھا تو آپ کیا کرتے تھے اس سلسلے میں، ہم نے چڑ کر دریافت کیا۔۔۔ اب، اصل نکتے کی طرف آئے ہو تم۔ ڈاکٹر صاحب فرمانے لگے۔ عین اُس وقت جب وہ شدتِ تکلیف سے کراہ رہے ہوتے تھے، میں مریضوں کے دو کام کرتا تھا، پہلا کام اُن کا علاج اور دوسرا اُن کی تعلیم و تربیت۔۔۔ تعلیم و تربیت کیسے؟ عاجزی سے عرض کیا۔۔۔ میں انہیں انگریزی زبان کی اہمیت سے روشناس کرواتا اور زبان کی باریکیاں سمجھاتا تھا۔۔۔ آپ کراہتے ہوئے مریضوں کو انگریزی پڑھاتے تھے۔ وہ آپ سے جان چھڑا کر کسی دوسرے ڈاکٹر کے پاس نہیں چلے جاتے تھے کیا؟ ہمارا پیاناہ صبر لبریز ہوا۔۔۔ عقلمند مریض میرے پاس ہی پڑے رہتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب رسان سے بولے۔۔۔ نیم مردہ کو آپ عقل مند کہتے ہی ہیں یا سمجھتے بھی ہیں۔ باوجود کوشش کے، یہ تبصرہ کرنے سے ہم اپنے آپ کو روک نہ سکے۔۔۔ اکثر مریضوں کی مقدارِ جہالت تمہارے برابر ہی ہوتی تھی، وہ دوسرے ڈاکٹروں کے پاس چلے جاتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے لگی لپٹی رکھے بغیر جواب دیا۔۔۔ حنا، کھانا دے دو بڑی بھوک لگ رہی ہے۔ عذیر نے اونچی آواز میں کہتے ہوئے ہمیں باکسنگ رنگ سے نکالنے کی کوشش کی۔۔۔ آپ لوگ ڈائننگ ٹیبل پر آجائیں۔ کھانا بالکل تیار ہے۔ بھابی نے کچن سے جواب دیا۔ سب لوگ کھانے کی میز پر آگئے۔ بھابی نے اچار گوشت، بھنی ہوئی مچھلی، بریانی، نان، سلاد میز پر چُن دیے۔ ہم نے پیٹ بھرنے کے بعد اُس وقت تک کھانا کھایا جب تک ہماری نیت نہ بھر گئی۔ بھابی، آپ کے ہاتھ میں بہت ذائقہ ہے۔ ہم نے تحسین کی۔۔۔ جی بھائی۔ ابو جی بھی یہی کہتے ہیں۔ لیکن یہ بات آپ اپنے دوست کو بھی سمجھائیں۔۔۔ یہ تو ہاسٹل کے میس کو بھی شاندار کہا کرتا تھا۔ یہ آپ کے کھانے کی تعریف نہیں کرتا، ہم نے عذیر کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔۔۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کہ ہم اپنی اکلوتی بیگم کے کھانے کی تعریف نہ کریں۔ عذیر کسمسایا۔۔۔ تعریف تو کرتے ہیں لیکن اتنی نہیں جتنی

60 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

کرنا چاہیے۔ بھابی نے گتھی سلجھائی۔ کھانا کھانے کے بعد سب لوگ لاؤنج میں آ بیٹھے۔
گپ شپ نئے سرے سے شروع ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب آپ نے جس دور میں میڈیکل
کی تعلیم حاصل کی، اُس زمانے میں تو خال خال ہی ڈاکٹر ہوتے تھے، ہم نے پھر چٹکی
کاٹی۔۔۔ ہاں، ایسا ہی تھا۔ میں ٹوبہ ٹیک سنگھ کے گاؤں موروثی پور میں پیدا ہوا۔۔۔
موروثی پور یا میراثی پور۔ ہم نے تلفظ پر زور دیا۔۔۔ میراثی پور وہ گاؤں ہے جہاں تم
مجھ سے چالیس پتالیس برس بعد جہالت کی میراث لئے اس جہان کو آلودہ کرنے آئے
تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے ہمارا تلفظ، املا، جج، لہجہ سب کچھ ہی درست کر دیا۔ اب قابو
آئے ہو تم۔ عذیر نے واشگاف قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔۔۔ موروثی پور کا سکول پورے
ضلع میں مشہور تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔۔۔ کس کام کے لئے مشہور
تھا، ہم نے پھر وضاحت چاہی۔۔۔ تم جیسے پیدائشی بلکہ ازلی ابدی جاہلوں کے اندر
پڑھائی اور علم کی پڑیا ٹھونسے میں۔۔۔ ضلع کیا، پورے صوبے میں ایسا سکول نہیں تھا۔
بلکہ اب تو میں نے ناروے کے سکول بھی دیکھ لئے ہیں۔ ہمارے موروثی پور جیسا سکول
پوری دنیا میں کہیں نہ ہوگا۔ اساتذہ اور طلباء کا صرف ایک ہی کام تھا۔ پڑھائی، پڑھائی
اور پھر پڑھائی۔ البتہ اُس زمانے میں انگریزی چھٹی جماعت سے پڑھانا شروع کرتے
تھے۔ پہلے پانچ سال تو ہمارے بس ضائع ہی ہو گئے کیونکہ انگریزی پڑھائی نہیں گئی
تھی۔ چھٹی جماعت سے لے کر دسویں تک ہم نے انگریزی پر بہت توجہ دی۔ نویں
جماعت کا واقعہ ہے ہم نے امتحان میں انگریزی کے پرچے میں لفظ لکھا summer-
salt جس کو میرے استاد نے غلط کر دیا۔ میں نے پوری جماعت کے سامنے ڈائلاگ
بولا۔ I shall cut my fingers if proven wrong spellings۔
میرے استاد نے مجھے بہت سمجھایا کہ یہ جج غلط ہیں لیکن میں نہ مانا۔ بالآخر سکول کے
سب اساتذہ اکٹھے کئے گئے۔ ہیڈ ماسٹر کی عدالت میں کیس پیش کیا گیا۔ میرے استاد
نے کہا کہ یہ کلا بازی کے جج غلط لکھتا ہے۔ اصل جج ہیں somersault۔ تو آپ

61 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

یہ تنازعہ کرنے کی بجائے انگریزی لغت میں صحیح جے دیکھ لیتے، ہم نے عقل مندی کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی۔۔۔ لغت میں دیکھ لیتے۔ لغت وہاں کہاں ہوتی تھی۔ میرے پاس نہ استاد کے پاس۔ بلکہ سکول میں بھی نہیں تھی۔ اُس وقت تک میں نے صرف لغت کے بارے میں سنا ہی تھا، دیکھی کبھی نہیں تھی۔ یہی حال میرے استاد بلکہ ہیڈ ماسٹر تک سب کا تھا۔ مجھ سے میرے بچوں کی دلیل پوچھی گئی تو میں نے جس کتاب سے یہ جے یاد کئے تھے وہ دکھا دی۔ میرے استاد نے کہا کہ اُس کے استاد نے اُس کو جو جے بتائے تھے وہ somersault ہی ہیں۔ میرے استاد اور اُن کے استاد کی عزت و عظمت کی وجہ سے اُن کے جے درست قرار دیے گئے اور مجھے اپنی انگلیاں کاٹنے کا حکم سنایا گیا۔ میں نے جواب میں کہا، اگر میرے جے غلط ہیں تو انگلیاں اُس شخص کی کاٹی جانی چاہئیں جس نے یہ کتاب لکھی ہے۔ میرا کام تو رٹا لگانا تھا۔ وہ میں نے ٹھیک لگایا۔ جس کی آپ کے سامنے تصدیق ہوگئی ہے۔ اب سکول ماسٹروں کی مجلس چاہے تو میری کتاب کے مصنف کو ڈھونڈ کر اُسے اپنی انگلیاں کاٹنے پر آمادہ کر لے۔ یوں ہم نے اپنے زمانہ طالبعلمی میں پوری مجلس اساتذہ کو پچھاڑ دیا تھا۔ یہ تھا ہمارا تعلیمی نظام اور معیار۔ تمہاری طرح نہیں تھا کہ جے غلط لکھ کر اپنے استادوں سے پٹائی کروا کر ساری رات انہیں بد دعائیں دینے پر اکتفا کر لیا۔ ہمیں بطور طالب علم بھی اپنے علم انگریزی پر کامل اعتماد تھا خصوصاً اساتذہ کے مد مقابل۔۔۔ پھر ہمارا داخلہ ڈاؤ میڈیکل کالج کراچی ہو گیا۔ موروٹی پور سے کراچی گئے تو شہر کی زندگی دیکھ کر اتنے ہی حیران و پریشان تھے جتنے تم لندن اور اوسلو دیکھ کر ہو رہے ہو۔ ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کرنے کے بعد واپس پنجاب آگئے۔ پریکٹس شروع کی۔ پھر ہمیں ایران میں ملازمت مل گئی۔۔۔ خوب، ایران تو بہت عمدہ جگہ ہے۔ فارسی زبان و ادب، ایرانی تہذیب و تمدن سے تو آپ خوب لطف اندوز ہوئے ہوں گے۔ ہم نے بھرپور دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ یہ تم جیسے دقیانوسی اور پس ماندہ لوگوں کی باتیں ہیں۔ وہاں کسی کو انگریزی نہیں آتی تھی

62 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

۔ بہت مشکل تھا وہاں رہنا۔ میں نے ایرانی مریضوں کو انگریزی کی طرف راغب کیا۔ پہلے چار سال تو کسی نے میری بات پر توجہ نہ کی۔ لیکن پھر انہیں احساس ہو گیا۔ میں نے آخری چھ سالوں میں شاذ ہی کسی کا علاج کیا ہوگا۔ جو بھی آتا، میں اُسے انگریزی پڑھاتا رہتا۔ علم کی شمع روشن کی میں نے اُس عمیق جہالت والے معاشرے میں۔۔۔ تنخواہ آپ ڈاکٹر کی لیتے اور کام انگریزی ٹیچر کا کرتے تھے۔ ایرانیوں کے حوصلے کی داد دی جانی چاہیے۔ ہم نے گفتگو میں مداخلت کی۔۔۔ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ ڈاکٹر ایرانیوں کے پاس موجود تھے۔ اُن کا اصل مسئلہ انگریزی زبان کا تھا۔ وہ میں نے حل کر دیا۔ دس سال گزار کر میں واپس پاکستان آ گیا۔۔۔ آپ اپنے وطن سے اُداس ہو گئے ہوں گے۔ ہم نے ڈاکٹر صاحب کی بات کی تائید کی۔۔۔ بالکل نہیں۔ اصل میں ایرانیوں نے وہاں ایک سکول قائم کر کے اُس میں ایک مقامی استاد تعینات کر دیا جس نے انگریزی پڑھانا شروع کر دیا تھا۔ میرا مشن مکمل ہو گیا تھا۔۔۔ واپس پاکستان پہنچا تو یہاں پر حالات خراب ہو چکے تھے۔ بنگالی اپنا علیحدہ ملک چاہتے تھے۔ ہم نے بنگالیوں کے ساتھ بڑی زیادتیاں کیں تھیں۔ وہ بڑے ذہین اور سیاسی سمجھ بوجھ کے حامل تھے۔ بے شمار خوبیوں والے تھے بس ایک ہی خرابی تھی اُن میں۔ بچے بہت ہوتے تھے اُن کے۔۔۔ جی ہاں۔ زیادہ آبادی کے بڑے مسائل ہوتے ہیں۔ ہم نے ہاں میں ہاں ملائی۔۔۔ سب سے بڑا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ زیادہ بچوں کو انگریزی سکھانا بے حد مشکل کام ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اصل مسئلے کی نشاندہی کر دی۔۔۔ وہ تو خیر اپنے ہاں پنجاب میں بھی ایسا ہی ہے۔ بچے جوان ہو جاتے ہیں۔ لیکن تعلیم نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ ویسے ہمارے ہاں بچے جب جوان ہوتے ہیں تو بڑے گبھرو بنتے ہیں۔ ذرا محنت کر لیں تو کھیلوں میں بڑا نام پیدا کر سکتے ہیں۔ ہم نے ڈاکٹر صاحب کو کلاس روم سے کھیل کے میدان میں لانے کی کوشش کی۔۔۔ بالکل غلط۔ جوان تو برطانیہ میں ہوتے ہیں۔ چارلس ڈارون تھا جوان جس نے بحری جہاز پر

63 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

دنیا کے چکر لگائے۔ ہر خطے کے پودے اور ارضیاتی نمونے اکٹھے کئے۔ نظریہ ارتقاء پیش کیا۔ اصل جوان تھا وہ۔ ہمارے پنجاب کے جوان اُس کے مقابلے میں پدی ہیں پدی۔ یہ کیا کرتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ساتھ والے گاؤں کے لونٹھوں کے ساتھ کبڈی کھیلتے ہیں اور میچ ہار جاتے ہیں۔۔۔ ہار جیت تو کھیل کا حصہ ہوتی ہے لیکن یہ مانیں کڑیل جوان ہیں ہمارے۔ گوروں کے جوانوں سے تو ہماری لڑکیاں زیادہ جفاکش ہوتی ہیں۔ بلکہ لڑکیوں کو بھی چھوڑیں ہمارے ہیچڑے بھی ان سے طاقتور ہوتے ہیں۔ ہم نے غیرت ملی کا بھرپور مظاہرہ کیا۔۔۔ ہمارے جوان فر فر انگریزی بول سکتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے استفسار کیا۔۔۔ شاید نہیں، لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ہم بھی لنگوٹ کس کر میدان میں اترے۔۔۔ فرق یہ پڑتا ہے کہ ایسے تمام جوان جو انگریزی سے نابلد ہیں بلا شک و شبہ جاہل مطلق ہوتے ہیں اور تم اُن سب کے امام ہو۔ کیونکہ تم جہالت کی وکالت کرتے ہو۔۔۔ لیجئے بھائی چائے لیں۔ تاکہ آپ تازہ دم ہو کر مقابلہ کر سکیں۔ حنا بھابی نے سب کو چائے پیش کرتے ہوئے کہا۔ آج کئی برس کے بعد ہم اپنے دیرینہ دوست اور اُس کی فیملی کے ساتھ گپ شپ کر رہے تھے۔ رات کافی گزر چکی تھی لیکن میزبان سونے کے موڈ میں نہ تھے۔۔۔ یار عذیر۔ ناورے میں تو چھ مہینے دن اور چھ مہینے رات ہوتی ہے۔ آجکل گرمیوں کا موسم ہے، رات تو ہوتی ہی نہیں تو تم لوگ رات کا کھانا کس وقت کھاتے ہو۔۔۔ یہ جو تم نے کھانا کھایا ہے یہاں، یہ رات ہی کا کھانا تھا۔ یہاں رات اور دن کا اندازہ گھڑی کی سوئیوں سے ہوتا ہے۔ آجکل دن اٹھارہ گھنٹے کا ہوتا ہے۔ بقیہ چھ گھنٹے دن نہیں ہوتا۔ ہم اسے رات کہہ لیتے ہیں۔ ساتھ ہی عذیر نے کھڑکی سے پردہ سرکایا۔۔۔ رات کا وقت تھا لیکن رات نہیں تھی۔ دن بھی نہیں تھا۔ ایک ایسا اندھیرا تھا جسے کم اندھیرا کہنا چاہیے۔۔۔ سردیوں میں بالکل الٹ ہوتا ہے اٹھارہ گھنٹے کی رات اور باقی دن۔ عذیر نے مزید وضاحت کی۔۔۔ تو یہ جو کہتے ہیں کہ چھ ماہ کا دن اور چھ ماہ کی رات ہوتی ہے ناروے میں۔۔۔ ہم نے اپنی الجھن

64 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

بیان کی۔۔۔ وہ دراصل شمالی قطب کے بالکل قریب ہوتا ہے۔۔۔ اچھا تو یہ کسی سے پوچھ کر بتاؤ کہ یہاں لوگ نماز کس وقت پڑھتے ہیں اور روزے کیسے رکھتے ہیں۔ ہم نے دوسری الجھن بتائی۔ کسی سے کیوں۔ میں بتاتا ہوں عذیر نے فوراً ردِ عمل دیا۔۔۔ تم بتاؤ گے۔ یعنی جسے یہ تک نہیں معلوم کہ سال میں کتنے مہینوں میں روزے رکھے جاتے ہیں اور دن میں کتنی نمازیں ہوتی ہیں، وہ نماز، روزہ کے ایام و اوقات بتائے گا۔۔۔ ڈاکٹر صاحب اور بھابی نے قہقہہ لگایا۔۔۔ یہاں لوگ سارے کام گھڑی اور کیلنڈر کے مطابق کرتے جاتے ہیں۔ ہاں کبھی کبھار منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے پاکستان جاتے ہیں تاکہ لطف لیا جاسکے کہ مولوی حضرات یومِ عید کے تعین کا تنازعہ کیسے کھڑا کرتے ہیں۔ عذیر نے جواب دیا۔۔۔ حیف ہے تمہاری ترقی پر۔ اگر انٹیسویس روزے کی رات کو آپ دل ہی دل میں تہیہ کئے بیٹھے ہوں کہ کچھ ہو جائے میں کل روزہ نہیں رکھوں گا اور عین آدھی رات کو سرکاری اعلان ہو جائے کہ کل عید نہیں روزہ ہوگا تو جو کشمکش آپ کے من میں ہوتی ہے۔ اُسکا مزہ اوسلو میں کیسے آسکتا ہے۔ یا یہ کہ آدھے مولوی دھڑلے سے کہہ رہے ہوں کہ کل جس نے روزہ نہ رکھا وہ گناہِ کبیرہ کا مرتکب ہوگا جس کی کم از کم سزا دس کروڑ سال جہنم کی آگ میں جلنا ہوگا اور بقیہ علما کا اصرار ہو کہ کل عید ہے اور شیطان اور اُسکے چیلے روزہ رکھیں گے۔ جو مزہ اس خلجان اور تذبذب میں ہے وہ گھڑی، کیلنڈر کی بندھی قوم کو کیا معلوم۔ ہم نے ناروے والوں کو نیچا دکھانے کی کوشش کی۔۔۔ یہ مزہ لینے کے لئے ہم لوگ پاکستان آجاتے ہیں ہر پانچ سالوں کے بعد، عذیر بولا۔۔۔ یہ مزہ انگلینڈ میں پاکستان سے بھی زیادہ ہے۔ تین دن تک سمجھ نہیں آتا کہ روزہ ہے یا عید۔ کچھ لوگ مقامی طور پر چاند دیکھتے ہیں۔ کچھ اپنے اپنے آبائی ملکوں کے ساتھ روزہ، عید کرتے ہیں۔ چند لوگ ہر حال میں سعودی عرب کے ساتھ عید مناتے ہیں۔ جبکہ مسلمانوں کی زیادہ تر تعداد اس صورتِ حال سے صرف لطف اندوز ہوتی ہے اور ہر روز عید منانے پر ٹکلی ہوئی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے لقمہ دیا۔ ہاں

65 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

بھی۔ کافی گپ شپ ہوگئی۔ میں تو سونے جا رہا ہوں۔ تم لوگ بھی آرام کرو، صبح ملاقات ہوگئی۔ ساتھ ہی ڈاکٹر صاحب اٹھے اور اپنے بیڈ روم کی طرف چل پڑے۔ باقی تمام لوگ بھی اپنے اپنے کمرے میں سونے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

66 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

چوزہ



نہیں، نہیں، نہیں۔۔۔ مجھے چوزہ چاہیے۔ چاہے کچھ بھی ہو، میں چوزہ لوں گی اور ابھی لوں گی۔ حرا نے ضد کی۔ لیکن بیٹا آپ کے پاس تو پہلے ہی ایک چوزہ ہے۔ بابا نے حرا کو سمجھاتے ہوئے کہا۔۔۔ وہ اب بڑا ہو گیا ہے۔ اور وہ اکیلا بھی ہے۔ اُس کو کھیلنے کے لئے ایک چوزہ چاہیے۔ حرا نے ضد کی۔۔۔ اچھا بیٹا لے لیس گے ایک اور چوزہ۔ بابا نے لا جواب ہو کر کہا۔ حرا کا چہرہ خوشی سے متمنا نے لگا۔ تو پھر چلیں۔۔۔ اب بابا ذرا پریشان ہوئے۔ بیٹا ابھی میں مصروف ہوں۔ پھر کسی وقت چلیں گے۔ بابا نے ٹالتے ہوئے کہا۔ بابا! مصروف تو آپ ہر وقت ہی ہوتے ہیں۔ میں تو ابھی چوزہ لوں گی۔ ابھی، ابھی۔۔۔ بابا نے حرا کے تیور بھانپ لیے اور ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔ اچھا ابھی اب تمہاری ضد سے کیسے لڑا جائے۔ جاؤ میرا بٹوہ لاؤ۔ حرا فوراً بٹوہ لے آئی۔ بابا نے جاتے جاتے یشل کی طرف دیکھا۔ بیٹا تم نہیں چلو گی چوزہ لینے۔ یشل نے ٹی۔ وی سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔ چلی تو جاؤں مگر میں اپنے فیورٹ کارٹون دیکھ رہی ہوں۔ بابا میں نے کتنی مرتبہ کہا ہے کہ ٹی۔ وی ایسا ہونا چاہیے جس میں کارٹون پروگرام ریکارڈ کئے جاسکیں۔ اب میں کارٹون چھوڑ کر کیسے جاسکتی ہوں اور وہ بھی ڈورے مون والے۔ او۔ کے بیٹا۔ میں اور حرا چوزہ لے آتے ہیں۔ بابا نے قدرے سکون سے کہا۔۔۔ آپی، آپی، پیارا سا چوزہ لانا۔ یشل نے حرا کو پکارتے ہوئے کہا۔۔۔ پیارا سا چوزہ کیا ہوتا ہے۔ بابا نے رکتے ہوئے جواب دیا۔ پیارا سا چوزہ بس پیارا سا ہوتا ہے۔ یشل نے بدستور کارٹون دیکھتے ہوئے کہا۔۔۔ ہاں، ہاں پیارا سا ہی لاؤں گی۔ حرا بولی۔

انکل! دیسی چوزہ دکھائیں۔ حرا کی بات سن کر بابا نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔ ہیں، تمہیں کیسے پتہ ہے دیسی اور ولایتی چوزے کا۔۔۔ مجھے پتہ ہے۔ سکول میں

68 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

میری دوستوں نے بتایا تھا۔ ولایتی چوزے جلدی مر جاتے ہیں۔ اس لیے میں دیسی چوزہ لوں گی۔ دکاندار نے مسکراتے ہوئے ایک پنجرے میں سے چوزہ نکال کر حرا کو تھما دیا۔ یہ لو دیسی ہے۔ حرا نے چوزہ ایسے پکڑا جیسے قارون کا خزانہ ہاتھ لگ گیا ہو۔ بابا! دیکھیں براؤن رنگ کا ہے۔ ہاتھ پھیریں اس پر۔ بالکل محمل جیسا ملائم ہے۔۔۔ حرا نے خوشی سے کہا۔ شکر ہے، تمہاری ضد تو پوری ہوئی۔۔۔ بابا! چوزے پر ہاتھ پھیرنے سے اس کے پر تو نہیں جھڑ جاتے۔ حرا نے گھر واپس آتے ہوئے پوچھا۔ نہیں، پر اتنے کمزور نہیں ہوتے۔ بابا نے تسلی دی۔ گھر میں گھستے ہی حرا نے یشل کو پکارا۔ دیکھو ہم کتنا پیارا چوزہ لائے ہیں۔ یشل بھاگ کر آئی اور حرا سے چوزہ لے کر اپنی گود میں بٹھالیا۔ دونوں نے چوزے کے ساتھ کھیلنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد انہیں اس کے کھانے کی فکر ہوئی۔ بریانی، پلاؤ، گوشت۔ ہر چیز جو فریج میں کھانے کے قابل تھی، چوزے کے سامنے بکھیر دی۔ لیکن اس نے ان کھانوں کی طرف توجہ نہ دی۔ حرا اور یشل رات گئے تک بار بار چوزے کو اٹھا اٹھا کر پیار کرتی رہیں۔ اگلے روز دونوں علی الصبح بغیر کسی جگائے ہی بیدار ہو گئیں اور پھر چوزے کے پاس آ بیٹھیں۔ بڑی مشکل سے بابا اور ماما نے انہیں اسکول بھیجا۔ سہ پہر کو وہ بازار سے چوزے کے لئے پنجرہ خرید لائیں۔ پنجرے کی سلاخوں کو مختلف رنگوں سے پینٹ کیا گیا۔ چوزے کے دانہ چگنے اور پانی پینے کے برتن بھی پنجرے میں رکھ دیے گئے۔ حرا اور یشل سارا دن چوزے کے ساتھ کھیلتی رہتیں۔ ہوم ورک کرتیں تو چوزے کو پاس بٹھا لیتیں۔ ہر جملہ لکھنے اور کتاب کا صفحہ پلٹتے ہوئے چوزے کو بتاتی جاتیں۔ میں نے اردو کا کام مکمل کر لیا ہے۔ ریاضی بہت مشکل ہے۔ انگریزی میں ڈاگ کو کتا کہتے ہیں۔ سوشل سٹڈیز کی بالکل سمجھ نہیں آتی۔ مئی، بابا کیوں ہمیں پڑھنے کے لئے کہتے رہتے ہیں۔ آج کھیلنے میں مزا آرہا ہے۔

چوزے کی آمد پر گھر کے سارے افراد خوش تھے سوائے بڑے چوزے کے۔ اس کو بابا اور ماما اب سینیئر چوزہ کہتے تھے۔ حرا اور یشل کو یہ نام پسند نہ آیا۔ وہ اسے بڑا

69 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

اور نئے چوزے کو چھوٹا چوزہ پکارنے لگیں۔ بڑا چوزہ چھوٹے چوزے کو چونچ مارتا۔ اس کے حصے کے دانے چگ جاتا اور اسے پانی بھی پینے نہ دیتا۔ اب حرا نے دونوں چوزوں کو ان کے پنخروں سے باہر نکالنے کے اوقات تبدیل کر دیے۔ جب ایک پنخروے سے باہر ہوتا تو دوسرا قید رہتا۔ چند دنوں کے بعد بڑے چوزے میں اتنی تبدیلی آئی کہ اُس نے چھوٹے چوزے کو مارنا چھوڑ دیا۔ اب وہ اس کے دانے بھی نہیں کھاتا تھا۔ یہ تبدیلی حرا اور یشل کے لئے بے حد خوشگوار تھی۔ ایک ٹھٹھرتی ہوئی شام کو حرا چوزوں کو دیکھنے کے لئے گئی تو اُسے بڑا چوزہ دکھائی دیا۔ وہ اپنے پنخروے کے اوپر چڑھا ہوا تھا۔ سردی کی وجہ سے اُس نے اپنے پر سمیٹے ہوئے تھے۔ حرا نے ادھر ادھر دیکھا، اُسے چھوٹا چوزہ نظر نہ آیا۔ اُس نے قدرے لا پرواہی سے بڑے چوزے کو بھگانے کی کوشش کی۔ بڑے چوزے نے پنخروے سے چھلانگ لگائی تو نیچے سے چھوٹا چوزہ نکل آیا۔ یہ منظر دیکھ کر حرا پہلے حیران ہوئی۔ جب اسے سمجھ آئی کہ بڑے چوزے نے چھوٹے کو سردی سے بچانے کے لئے اپنے پروں کے نیچے چھپایا ہوا تھا تو مارے خوشی کے اُس کی باچھیں کھل گئیں۔ بھاگی، بھاگی آئی اور اس نے یشل کو بتایا کہ بڑا چوزہ کس طرح سے چھوٹے چوزے کا دوست بن گیا ہے۔ اور وہ اسے سردی سے بچانے کے لئے اپنے پروں کے نیچے چھپا لیتا ہے۔ اس نے بابا، ممی کو بھی یہ منظر سنایا۔ رات کو وہ بار بار بابا کو بتا رہی تھی کہ بڑا چوزہ اپنے آپ کو چھوٹے چوزے کی ماما سمجھتا ہے۔

چھوٹے چوزے کے بہت سارے نام بھی رکھے گئے۔ حرا، یشل کو سمجھ ہی نہیں آرہی تھی کہ چوزے کا نام اردو میں ہونا چاہیے یا پھر انگریزی میں۔ ایک مرتبہ تو جا پانی میں بھی اس کا نام رکھا گیا۔ وہ کبھی اسے تاکا ہاشی کہتیں، کبھی یوشی۔ کبھی الزبتھ اور کبھی اس کا نام شاہجہاں ہوتا۔ ایک الجھن یہ تھی کہ وہ بڑا ہو کر مرغا بنے گا یا مرغی۔ اگر اس کی جنس کا پتہ چل جائے تو نام بھی رکھا جاسکتا ہے۔ حرا نے کئی مرتبہ بابا سے پوچھا کہ یہ مرغا بنے گا یا مرغی۔ بابا کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ حرا نے تجویز دی کہ وہ جس دکان

70 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

سے چوزہ خرید کر لائی تھی، وہاں پر شاپ کیپر انکل اسے بتا سکتے ہیں کہ چوزہ مرغا بنے گا یا مرغی۔ لیکن بابا اسے دکاندار کے پاس نہ لے کر جاسکے کیونکہ وہ مصروف تھے۔ ہر شام حرا اور یشل چوزے کی جنس پر بحث کرتیں۔ لیکن معمرہ حل نہ ہو سکا۔ آہستہ آہستہ چوزے کی کلغی نکلنا شروع ہو گئی۔ جس سے انہیں شک تھا کہ یہ مرغا بنے گا۔ نجانے کیوں اُن کی شدید خواہش تھی کہ وہ مرغی بنے اور انڈے دے۔ وہ دونوں اس کے دیے ہوئے انڈے اٹھانا چاہتی تھیں۔ چند دن گزرے تو چوزے نے شرارتیں کرنا شروع کر دیں۔ سردیوں کی ایک دوپہر بابا لان میں رکھی ہوئی نیلی رنگ کی کرسیوں پر بیٹھے دھوپ کا مزہ لے رہے تھے۔ انہوں نے وہیں لنچ منگوا لیا۔ حرا اور یشل نے بھی وہیں کھانا کھانا شروع کر دیا۔ چوزہ کبھی حرا اور کبھی یشل کے پاؤں کے پاس آتا۔ اور ایک ہلکی سی چونچ مارتا۔ یشل چوزے کے چونچ مارنے سے ڈرتی تھی۔ وہ لان چیمبر پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ حرا کھانا کھاتے ہوئے چوزے کو بھی روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ڈالتی جاتی۔ جونہی ایک ٹکڑا ختم ہوتا، چوزہ حرا کے پاؤں پر چونچ مارتا۔ حرا اسے ایک اور ٹکڑا دے دیتی اور ساتھ ہی اسے ڈالتی۔ چھوٹے چوزے مجھے کھانا کھانے دو۔ اچانک چوزے نے پوری طاقت سے ایک چھلانگ لگائی اور بابا کے بازو پر چڑھ گیا۔ اور چوں چوں کر کے روٹی مانگنے لگا۔ حرا اور یشل نے جب یہ دیکھا تو مارے ہنس ہنس کے ان کا برا حال ہو گیا۔ بابا چوزے کو بازو سے جھٹکنے کی بجائے بار بار اسے کہتے۔ چوزے نیچے اترو۔ نیچے اترو۔ لیکن وہ نیچے اترنے پر تیار ہی نہ تھا۔

ایک دن بابا اسٹڈی میں بیٹھے پڑھ رہے تھے۔ حرا لان میں گیند کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ چوزہ لان میں ادھر ادھر بھاگ دوڑ رہا تھا۔ اچانک بابا کو حرا کی چیخ سنائی دی۔ بابا بھاگ کر لان میں آئے جس کے ایک کونے میں سے ایک موٹے کالے رنگ کے بلبے نے چوزے پر چیتے کی سی تیزی سے حملہ کر کے اُس کی گردن دبوچ لی۔ چوزے نے ایک دردناک چیخ ماری۔ موٹے بلبے نے چوزے کو دبوچتے ہی دوڑ لگادی اور جب

71 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

بابا حرا کی چیخ سن کر لان میں پہنچے تو بلا اور چوزہ دونوں غائب تھے۔ حرا چیخیں مار مار کر ہلکان ہو رہی تھی۔ اُس نے بابا کو بتایا کہ بلا چوزے کو لے کر گھر کے بغلی راستے کی طرف گیا ہے۔ بابا بھاگ کر وہاں پہنچے لیکن وہاں چوزہ تھا نہ بلا۔ گھر کا عقبی صحن چھان مارا لیکن اُن دونوں کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ بابا واپس آئے اور حرا کو چپ کروانے لگے۔ انہوں نے اُسے کہا کہ حرا بیٹا مت رو۔ ہم ایک اور چوزہ لے لیں گے۔ حرا روتے روتے کہنے لگی۔ اُسے بھی بلا اٹھا کر لے جائے گا۔ مئی اور یشل بازار سے واپس آئے تو انہیں چوزے کا واقعہ سنایا۔ یشل نے بھی رونا شروع کر دیا۔ مئی نے حیرت سے پوچھا، بلے نے ایسا کیوں کیا۔ وہ تو جب بھی آتا تھا۔ میاؤں میاؤں کرتا تو ہم اسے کھانے کے لئے کچھ نہ کچھ دے دیا کرتے تھے۔ پھر بھی وہ چوزہ کھا گیا۔۔۔

72 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

ہم نے الیکشن لڑا



تو آج کل بھی تم پڑھتے ہی رہتے ہو۔ کم از کم چالیس سال ہو چکے ہیں۔ تمہاری پڑھائی ختم ہونے میں ہی نہیں آرہی۔ ایسی کون سی شے ہے جو سمجھ نہیں آتی اور تم مسلسل سرکھپاتے رہتے ہو۔ ویسے تم ہوانتہائی غبی۔ غضب خدا کا۔ اپنی عمر کا تین چوتھائی حصہ تم نے کتابیں پڑھنے، پڑھے ہوئے پر سردھننے اور نہ پڑھے ہوئے پر افسوس کرنے میں گنوا دیا اور اب بھی کہہ رہے ہو کہ تم تو علوم کے ابجد سے واجبی واقفیت پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔ زیارت نے ہماری زندگی بھر کی جدوجہد کا کچا چٹھا کھول کر رکھ دیا۔ وہ اور ہم اُس وقت ہم جماعت تھے جب دونوں اپنا اپنا نام لکھنا سیکھ رہے تھے۔ وہ زیارت 'ظ' سے لکھتا اور کبھی 'ض' سے۔ اور ہم تو صیف 'س' سے لکھتے تھے۔ ہماری س تو ایک دن کی پٹائی سے ص میں بدل گئی۔ لیکن اُس نے قریباً پورا سال ہی لگا دیا زیارت لکھنے میں۔ پہلے دن 'ظ' سے زیارت لکھنے پر اُس نے ڈانٹ کھائی۔ دوسرے دن 'ض' سے لکھنے لگا۔ ماسٹر شوکت ڈانٹ کے سترہ حملے کرنے کے قائل نہ تھے۔ سیدھا پانی پت کی تیسری لڑائی پر اتر آئے۔ اور ایک ہی معرکے میں 'ظ' اور 'ض' کا قلع قمع کر دیا۔ البتہ ابتدائی جماعتوں کے پورے پانچ سال وہ یہ نہ سمجھ سکا کہ زیارت 'ز' سے لکھا جاتا ہے یا 'ذ' سے۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے پانچویں جماعت کے سالانہ امتحان سے ایک ہفتہ پہلے اُس کو انہی ججوں کی وجہ سے ماسٹر شوکت نے مرغا بنایا۔ اس حالت میں پانچ منٹ تک بطور ابتدائیہ رکھا۔ اپنی ڈیڑھ فٹ لمبی بید کی چھڑی، جس میں ہر دو انچ کے فاصلے پر گانٹھیں پڑی ہوئی تھیں، سے زیارت کے کولہوں کے سب سے نرم رقبے پر نشان لگایا۔

74 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

پھر اپنی چھڑی، جسے ماسٹر شوکت مولا بخش کہا کرتے تھے، کو کولہوں سے ترچھے انداز میں پورے تین فٹ ہوا میں بلند کیا۔ تین مرتبہ اُس بلندی سے نہایت آہستگی کے ساتھ کولہوں کے نشان زدہ رقبے کو مولا بخش سے چھوڑا۔ چوتھی مرتبہ ہوا میں بلند کر کے پہلے فٹ کا فاصلہ قدرے ملائمت سے طے کیا۔ دوسرے فٹ کے دوران اپنی پوری قوت مجتمع کی۔ تیسرے فٹ میں قوت کے ساتھ غصہ اور آخری چھ انچ کے دوران اس ترکیب میں حقارت ملا کر کولہوں پر دے مارا۔ ساتھ ہی زیارت کی چیخ بلند ہوئی تو ماسٹر شوکت کو اپنے علم، فن، تربیت اور دلجمعی کی داد مل گئی۔ پھر انہوں نے پے درپے چھ مولا بخش برسا کر اپنا پہلا اور مکمل کیا۔ جس پر سب ہم جماعتوں کے اوسان خطا ہو گئے۔ زیارت کا البتہ کچھ معلوم نہیں۔ دفعتاً ماسٹر شوکت سزا سے لڑائی پر اتر آئے اور زیارت پر گھونسوں، تھپڑوں اور لاتوں سے حملہ کر دیا۔ وہ لڑھکتا اور قلابازیاں کھاتا ہوا دیوار سے جا ٹکرایا۔۔۔ سکول سے واپسی پر وہ اپنی سائیکل کی گدی پر بیٹھ نہ سکا۔ ہم اپنا سائیکل چلانے کے ساتھ اُس کے سائیکل کے ہینڈل کو پکڑ کر دھکیلتے رہے۔ ایک نظر اپنے، دوسری اُس کی سائیکل کے ہینڈل اور تیسری اپنی سائیکل کے پیڈلوں پر جماتے ہوئے چار مرتبہ راگیروں سے ٹکرائے۔ زیارت ہمارے ساتھ ساتھ پیدل چلتا اور ہر قدم پر ماسٹر شوکت کی ماں، بہنوں، پھپھیوں، چچیوں، خالاؤں کی ذاتی زندگیوں کے بارے میں مخفی معلومات دیتا رہا۔ آدھا فاصلہ طے کرنے کے بعد اُس کے جسم میں ایک نئی ٹیس اٹھی تو اُس نے بھی اپنی طرزِ فغاں بدلی اور یکا یک ماسٹر شوکت کی بیوی، سالیوں اور ساس کے بارے میں انکشافات کرنے شروع کر دیے۔ میں نے پوچھا تم اچانک ماسٹر شوکت کے خاندان سے پھدک کر اُن کے سسرال میں کیوں جا گھسے ہو۔ تو کہنے لگا۔ اس طرح ماسٹر شوکت کو زیادہ تکلیف ہوگی کیونکہ وہ اپنی زوجہ کو اپنا پیر و مرشد بھی مانتے ہیں۔۔۔ ہم نے یہ واقعہ زیارت کو یاد دلایا تو کہنے لگا اُس وقت میرے کندن بننے کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ خیر میں نے ماسٹر شوکت کا ادھار چکا دیا تھا۔۔۔ وہ کیسے، ہم نے قدرے حیرت

75 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

سے کہا۔۔۔ اس واقعے کے کچھ عرصے بعد صنعتی و دستکاری نمائش ہو رہی تھی۔ اور ساتھ ہی حکومت نے جشن بہاراں کا بھی انعقاد کر رکھا تھا۔ میں وہاں کھیل تماشے دیکھنے گیا ہوا تھا کہ اچانک میری نظر ماسٹر شوکت پر پڑی۔ وہ اپنی بیوی، جسے وہ اپنی محبوبہ بھی کہتے تھے، اور جوان بیٹوں اور بیٹیوں کے ساتھ بہت چلبے انداز میں انکھیلیاں کر رہے تھے کہ میں بھاگتا ہوا سیدھا اُن کے قدموں پر جا گرا۔ وہ سنبھل بھی نہ پائے تھے کہ میں نے رو رو کر کہا۔ ابا جان۔ ابا جان! دس روپے دے دیں، میں نے جھولا جھولنا ہے۔ ایک ہفتے سے آپ گھر نہیں آئے۔ امی رو رو کر ہلکان ہو گئی ہیں۔ ماسٹر شوکت کو کچھ سمجھ نہ آیا۔ انہوں نے مجھے دھکیلتے ہوئے کہا۔ کون ہو تم، یہ کیا بے ہودگی ہے۔ میں نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ ابا جان، میں آپ کا بیٹا ہوں۔ آپ مجھے نہیں جانتے۔ وہ ہکا بکا رہ گئے۔ میں نے فوراً جھپٹا مارا اور اُن کے جیب سے پچاس کا نوٹ نکالا اور بھاگ گیا۔ ماسٹر شوکت کی بیوی اور بچے اُن سے سخت ناراض ہو گئے۔ بیوی وہیں سے سیدھے اپنے میکے چلی گئی۔ انہوں نے بہت صفائی دی، بچوں کی جان کی قسمیں اٹھائیں لیکن اُن کی زوجہ یہ ماننے کے لئے تیار نہ ہوئی کہ انہوں نے خفیہ شادی نہیں کی ہوئی۔ یہ قضیہ دو ماہ سے زیادہ چلتا رہا۔ بالآخر ماسٹر شوکت کو اپنا پانچ مرلے کا آبائی گھر اپنے بیوی کے نام منتقل کروانا پڑا تب جا کر اُن کی بیوی واپس گھر آئی۔۔۔ ہماری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ یار زیارت یہ آئیڈیا تمہیں سوچھا کیسے۔ ہم نے پوچھا۔۔۔ یہ تمہارے جیسے کتابی کیڑوں کی سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔ اُس نے جواب دیا۔ پھر کہنے لگا۔ یار ویسے انگریزی بہتر زبان ہے۔ کیونکہ اس میں زیارت Z سے لکھا جاتا ہے کوئی ض، ظ، ذ، ز کا جھگڑا نہیں ہے۔ اُس کے ردِ عمل پر مجھے قدرے حیرت ہوئی۔ میں نے استفسار کیا۔ تم اب انگریزی میں بھی لکھ لیتے ہو۔۔۔ کہنے لگا، نہیں لکھتا تو اپنی زبان میں ہی ہوں البتہ دستخط انگریزی میں کرتا ہوں۔ ویسے بھی ہمیں اپنی زبان کی ترویج کے لئے اسی کو استعمال کرنا چاہیے۔۔۔ بالکل درست کہا تم نے زیارت۔ تم نے انگریزی

76 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

صرف اس لئے نہیں سیکھی کہ اس سے اپنی زبان کی دل شکنی ہوتی ہے۔ ہم نے لقمہ دیا۔۔۔ ویسے انگریزی زبان سیکھنے کا سیاست میں بہت فائدہ ہوتا ہے۔ زیارت نے بات جاری رکھی۔۔۔ کیا فائدہ ہوتا ہے۔ ہم نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔۔۔ یار یہ دفتری بابوؤں سے سارا دن واسطہ رہتا ہے۔ یہ کام کی بات انگریزی میں کرتے ہیں۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ میں اپنے کسی ووٹر کا کام کروا کر آیا ہوں، ہفتے بعد اُسے انگریزی میں جو چٹھی ملی ہے۔ اُس میں کام تو درکنار میرے ووٹر کو جرمانہ بھی ہوا ہے۔۔۔ ووٹر سے یاد آیا، زیارت تم نے تو الیکشن بھی لڑے ہیں۔ ہم نے چٹکی کاٹی۔۔۔ بالکل لڑے ہیں۔ اُس نے سینہ پھلا کر کہا۔۔۔ فائدہ اس کام کا، ہم نے سرسری نکتہ چینی کی۔۔۔ فائدہ تو بہت ہوا۔۔۔ زیارت قدرے توقف سے بولا۔ ہوا یہ کہ میرے محلے اور آس پاس کے تیس چالیس لڑکے بے روزگار تھے۔ ہم سب نے مل کر کرکٹ کی تین ٹیمیں بنا رکھی تھیں۔ گھر والے صبح سویرے ہی مجھے نیند سے بزورِ حالت بیداری و بے بیزاری و بے کاری میں لے آتے۔ دوپہر سے پہلے ہی ہم سب محلے کی گراونڈ میں جمع ہو کر شام تک کرکٹ کھیلتے۔ لیکن رات ڈھلنے کے بعد کرکٹ کھیلنا ممکن نہ رہتا۔ محلے کے ایک دکاندار سے ہم سب کی دوستی تھی۔ اُس کے پاس گپ شپ کے لئے چلے جاتے۔ انہی دنوں کونسلر کے الیکشن آگئے۔ چاچا لالٹین ہمیشہ کی طرح میدان میں تھا۔۔۔ چاچا لالٹین کیا نام ہوا۔ پوچھا۔۔۔ وہ ہمیشہ لالٹین کے نشان پر الیکشن لڑتا تھا، اس لئے لوگ اسے چاچا لالٹین کہتے تھے۔ اُس نے ہم سب دوستوں کو اپنی انتخابی مہم میں ہاتھ بٹانے کے لئے کہا۔ ہم نے رات کا کھانا اور ایک سو روپے فی کارکن کا مطالبہ کیا جو اُس نے لیت و لعل سے پورا کر دیا۔ انتخابی مہم کے دوران ہمارے ایک دوست نے تجویز دی کہ ہم میں سے ہی کسی ایک کو الیکشن لڑنا چاہیے۔ اُس کے خیال میں الیکشن لڑنے کے بعد ہم اپنے دوستوں کے لئے نوکری اور روزگار کا بندوبست کر سکتے تھے۔ اس تجویز کو سب دوستوں نے سراہا۔ لیکن ہم سب انتخابی اخراجات تو درکنار، انتخاب لڑنے کے لئے مقررہ

77 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

زرِ ضمانت بھی ادا نہیں کر سکتے تھے۔ کافی غور و خوض کے بعد طے ہوا جو روپے چاچا لائین نے ہم سب کو دیے تھے۔ اُسی کا چندہ کر کے سب دوست انتخابات کے لئے زرِ ضمانت مہیا کریں اور الیکشن لڑیں۔۔۔ ہیں یہ کیا، پیسے تو تم نے چاچا لائین سے لئے تو الیکشن کس کے خلاف لڑنا تھا۔ قدرے حیرانی سے پوچھا۔۔۔ الیکشن چاچا لائین کے خلاف ہی لڑنا تھا، دیگر امیدواروں کا تو ہمیں پتہ ہی نہیں تھا۔۔۔ شاید تمہیں یاد ہے۔ تم اُس وقت یونیورسٹی میں پڑھتے تھے۔ میں تمہارے پاس زرِ ضمانت کی رقم ادھار لینے کے لئے آیا تھا۔ لیکن قربان جائے تمہاری ثابت قدمی اور مستقل مزاجی پر۔ تمہارے پاس پھوٹی کوڑی اُس وقت تھی، آج ہے اور نہ کل ہوگی۔ الٹا تم نے مجھے لایعنی نصیحتیں بھی کی تھیں کہ الیکشن لڑنا تمہارے لئے ممکن نہیں اور تمہیں کوئی ڈھنگ کا کام کرنا چاہیے۔۔۔ خیر وہ تو تمہاری ہمیشہ کی عادت ہے۔۔۔ الیکشن لڑنے کے لئے مجھے صرف زرِ ضمانت ہی چاہئے تھی۔ پبلٹی میرا مسئلہ تھا ہی نہیں۔ میرے سارے دوست اور تینوں کرکٹ ٹیمیں اگر میری الیکشن مہم میں کام نہ کرتیں تو اور کیا کرتیں۔ الیکشن کا نتیجہ آیا تو میں ہار گیا۔ کیونکہ میرے اکثر حمایتیوں نے دوبارہ چاچا لائین سے نقد رقم وصول کر کے ووٹ اسے دے دیے تھے۔ لیکن اس شکست سے مجھے یہ اندازہ ہو گیا کہ میں الیکشن لڑ سکتا ہوں۔۔۔ کیسے؟۔۔۔ ایسے کہ الیکشن لڑنے کے لئے تمہاری زبان میں مستقل مزاجی اور سادہ لفظوں میں ڈھیٹ پن کے علاوہ کسی چیز کی ضرورت نہیں ہوتی۔ تو یہ خوبی میں نے اپنے اندر پیدا کر لی۔۔۔ دوسرا فوری نتیجہ یہ نکلا کہ میرے گھر والوں نے رات کے وقت میرے گھر میں قیام کرنے پر پابندی لگا دی۔۔۔ یعنی تمہیں گھر سے نکال دیا، ہم زیرِ لب مسکرائے۔۔۔ یہ تمہارا خیال ہو سکتا ہے۔ لیکن واقعہ یہ تھا کہ دن کے وقت میں کبھی گھر میں نہیں ٹکتا تھا، کھانے کے بارے میں کئی برس پہلے گھر والے مجھے بتا چکے تھے کہ وہ میرے معیار کا کھانا نہیں بنا سکتے، بس رات کا قیام ہی تھا جو اس الیکشن کے نتیجے میں ختم ہوا تھا۔ گھر والوں نے جب رات کو گھر آنے کی پابندی سے رخصت دے

78 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

دی تو میں مکمل یکسوئی سے دن رات سیاسی جلسوں، جلوسوں، ہنگاموں، ملاقاتوں، تھانوں، کچہریوں کا ہو کر رہ گیا۔ چند سالوں بعد دوبارہ الیکشن ہوئے تو میں منتخب ہو گیا۔ اب میرے گھر والوں نے میری مکمل سیاسی یکسوئی کے لئے گھر آنے پر جو پابندی لگائی تھی، وہ ختم ہو گئی۔۔۔ کیونکہ تم کونسلر بن گئے تھے؟ ہم نے حالات سے جانکاری حاصل کرنے کی کوشش کی۔۔۔ کونسلر سے تو انہیں اتنا فرق نہیں پڑتا تھا۔ اصل میں گھر کا بجلی کا میٹر بوجہ عدم ادائیگی واجبات منقطع ہو گیا تھا۔ اس معاملے سے بٹننے کے لئے انہیں مجھ سے زیادہ مناسب کوئی آدمی نہ مل سکا اور یوں یہ پابندی از خود ختم ہو گئی۔ میں نے کونسلر منتخب ہونے کے بعد پہلے سال میں میئر کے ساتھ سیاسی کشیدگی پیدا کر لی، جس سے میں حزب اختلاف کا نمائندہ سمجھا جانے لگا۔ حلقے کے ترقیاتی اخراجات میں سے بھی میں نے میئر کا حصہ نہ دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو سال کے بعد میئر نے مجھے کہا کہ کونسلر تو صرف چار سال کے لئے ہوتا ہے۔ میں تمہیں ملازمت دلا دیتا ہوں جو مستقل ہوگی۔ میں نے یہ پیشکش قبول کر لی۔ مجھے کارپوریشن میں انسپکٹر تعینات کر دیا گیا اور میرے حلقے میں میئر نے اپنے ایک قریبی ساتھی کو کونسلر بنا دیا۔ اب میئر میرا افسر تھا، میں اُس کے ساتھ لڑ جھگڑ نہیں سکتا تھا۔ ہمارے تعلقات بہتر ہو گئے۔ تیسرے الیکشن سے پہلے میئر گروپ کے مقابلے میں ایک طاقتور گروپ بن گیا جس سے وہ خوفزدہ تھا۔ ایک رات میئر نے مجھے اپنے گھر بلا کر کہا کہ میں اُس کے گروپ کی حمایت سے اگلے الیکشن میں حصہ لوں۔ مجھے بھی نوکری میں مزا نہیں آرہا تھا۔ میں نے حامی بھر لی لیکن اس شرط کے ساتھ کہ میں اپنی ملازمت سے استعفیٰ نہیں دوں گا۔ میئر نے الیکشن سے ایک مہینہ پہلے مجھے معطل کر دیا اور میں دوبارہ الیکشن لڑنے کے لئے تیار ہو گیا۔ یہ الیکشن بھی میں نے جیت لیا لیکن میئر مخالف گروپ نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کرتے ہوئے میری ملازمت بحال کروا دی جس سے میں خود بخود الیکشن کے لئے نااہل ہو گیا۔۔۔ بہت خوب، تو آجکل تم پھر کارپوریشن میں انسپکٹر ہو۔ ہم نے صورت حال کو سمجھنے کی کوشش

79 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

کی۔۔۔ نہیں، کونسلر کی سیٹ سے فارغ ہونے کے بعد جب میں ملازمت کے لئے پہنچا تو میونسپل کارپوریشن والوں نے طرح طرح کی قانونی مویشگافیاں پیش کیں اور میں تا حال کونسلر ہوں نہ انسپکٹر۔۔۔ خیر رزمِ حق و باطل میں ایسے مقامات آتے رہتے ہیں۔ ہم نے زیارت کی ڈھارس بندھائی اور ساتھ ہی کہا۔ اتنا ہی ابھرے گا جتنا کہ دبا دیں گے۔ تم اب اسمبلی کے الیکشن کا سوچو۔۔۔ یہ سنتے ہی اچانک زیارت کا چہرہ متمنا نے لگا۔ کہنے لگا، یار ویسے تمہیں انگریزی آتی ہے اور باتیں کرنا بھی، تم الیکشن کیوں نہیں لڑتے۔۔۔ کیا! الیکشن اور ہم۔ کیسی بے جوڑ بات کی ہے تم نے۔ ہرگز نہیں۔۔۔ تم نے آج تک کتابیں پڑھی ہیں، زندگی نہیں۔ باتیں کی ہیں کام نہیں۔ یہ جو تم سارا دن فرد، معاشرے کی ترقی کی بے معنی گفتگو سے میرا دماغ چاٹتے ہو، اس کا کیا فائدہ۔ الیکشن لڑو تاکہ اپنا یا کسی کا کوئی کام کر سکو۔ دیکھو میرا مشاہدے اور تجربے کا میدان تمہاری دیمک زدہ اخلاقی گفتگو سے کہیں بلند ہے۔ تم کمسنری بکس میں بیٹھ کر کھلاڑیوں پہ تنقید کرتے ہو۔ لیکن کیا اس طرح تم کھلاڑی بن سکتے ہو۔ چوکے چھلکے لگا سکتے ہو۔ خود کھلاڑی بننا تو بہت دور کی بات ہے، تم تو کسی اسٹار پلیئر کا انٹرویو بھی نہیں کر سکتے۔ اُس کے لئے بھی کسی تعلق اور رابطے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تمہاری کتابیں کیا کر سکتی ہیں۔ میدانِ عمل میں آؤ۔ نکلو اس کمرے اور ماحول سے تاکہ زندگی کی رنگا رنگی دیکھ سکو۔۔۔ ہمیں زیارت سے اس قسم کی گفتگو کی ہرگز توقع نہ تھی۔ زیارت کے جانے کے بعد اُس کے الفاظ بار بار ہمیں سنائی دینے لگے۔ کیا واقعی ہم نے عملی زندگی سے فرار اختیار کر رکھا ہے۔ پہلے تو اس خیال سے ہمیں اتفاق نہ ہوا لیکن یہ بات دماغ کے کسی کونے میں پیوست ہو گئی اور باوجود بھلانے کے ہمیں ہر روز یاد آنے لگی۔ سگوں بوہتا مینوں آوند ائیہہ میں جناں خیال بھلاندی آں ✽۔ کتابی دنیا سے اپنا رومانس برقرار رکھنے کے پورا شعر یہ ہے:

کڑیاں نال گلاں کر کر کے میں دل نوں آرے لاؤندی آں
سگوں بوہتا مینوں آوند ائیہہ میں جناں خیال بھلاندی آں

80 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

لئے ہم نے اپنے ایک ایسے دوست سے رابطہ کیا، جس کی صحبت نے ہمیں ہمارے موجودہ حال تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ کیونکہ ہم جب بھی گھر سے سودا سلف لینے نکلے ہیں، موصوف نے ہمیں سودا سلف خریدنے پر کتابیں پڑھنے کو فوقیت دینے کا مشورہ دیا ہے۔ نتیجتاً سودا سلف نہیں آیا اور زیارت کے سامنے ہم چاروں شانے چت بھی ہو گئے۔ پوچھا، کیا یہ درست ہے کہ کتاب اور مطالعے میں گم رہنے والے لوگوں کو عملی زندگی کا ادراک نہیں ہوتا۔ موصوف نے آنکھیں بند کیں، کافی دیر غور و خوض کیا پھر اپنی گول عدسوں والی عینک کو ناک کے اگلے حصے کی طرف ہلکے سے دھکیلا اور عینک کے اوپر سے ہماری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ماننا پڑے گا کہ یہ بات وزنی ہے۔ حیات کے نشیب و فراز کا ادراک عملی زندگی کی کشمکش سے ہی ہوتا ہے۔ کتاب اور مطالعہ سے نہیں۔۔۔ جی کیا کہا آپ نے، ہم ہکا بکا رہ گئے۔۔۔ آج سے قبل تو آپ نے کبھی یہ بات نہیں کی۔ آپ تو کہتے رہے کہ کتاب ہے تو سب ہے، کتاب نہیں تو کچھ نہیں۔ ہم نے احتجاج کیا۔۔۔ آپ نے کبھی یہ اشکال ہی پیش نہیں کیا۔ جواب ملا۔ دیکھئے یہ بھی فی الحقیقت ایک نظری مسئلہ ہے جس کو لوگ عملی معاملہ قرار دیتے ہیں۔ آپ یوں سمجھ لیجئے کہ آپ نے بجلی کا بل ادا کرنا ہے، ایک صورت یہ ہے کہ آپ کڑی دھوپ میں قطار میں کھڑے ہو جائیں، جہاں آپ کو پیاس بجھانے کے لئے پانی میسر نہ ہو۔ آپ کو دھکے دیے جائیں اور ساتھ لطف دو بالا کرنے کے لئے گالیاں بھی۔ جب آپ کی بل جمع کروانے کی باری آئے تو بینک کی کھڑکی اس اعلان کے ساتھ بند کر دی جائے کہ وقت ختم ہو گیا ہے۔ آپ کل تشریف لائیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ آپ کی بینک کے کسی اہلکار کے ساتھ جان پہچان ہو جو آپ کا بل جمع کروادے۔ اس مسئلے کا کتاب کے پاس حل یہ ہے کہ واجبات کی ادائیگی کا نظام آسان بنایا جائے لیکن زمینی صورت حال یہ ہے کہ کتاب آپ کی جگہ پر قطار میں کھڑی نہیں ہو سکتی اور عملے کے کسی اہلکار کے پاس جا کر بل جمع بھی نہیں کر سکتی۔ گویا، یہ کہنا درست ہے کہ کتاب عملی معاملات میں آپ

81 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

کی ویسی مدد نہیں کر سکتی جیسی آپ کو درکار ہے۔۔۔ صاحبو! اس وضاحت کے بعد ہم نے گفتگو ترک کر کے کسی نوکیلے پتھر کی تلاش شروع کی۔ جس سے موصوف کا سر پھاڑا جا سکے۔ ہمارے اس ارادے کو وہ فوراً بھانپ گئے اور کہنے لگے۔ دیکھیں، پتھر تو آپ کو اپنے سر میں مارنا چاہیے کہ اتنا معمولی اشکال آپ نے سالوں بلکہ دہائیوں پہلے کیوں پیش نہیں کیا۔۔۔ سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ ہماری برسوں کی ریاضت کے بارے میں ہمارے فکری و نظری مرشد و مربی کی اس رائے کا کیا کریں۔ واپس گھر آگئے اور لحاف اوڑھ کر سو گئے۔ شام کے بعد بیدار ہوئے۔ کتاب کھولنے کا ارادہ کیا لیکن کھول نہ سکے۔ اتنے میں زیارت پھر آن دھمکا۔ ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ ہمیں متوجہ نہ پا کر پوچھنے لگا۔ کہاں کھوئے ہوئے ہو۔۔۔ کہیں بھی نہیں۔ ایسے ہی طبیعت آج بشاش نہیں ہے۔۔۔ میرا خیال ہے کہ تم کسی کھد بُد میں لگے ہوئے ہو۔۔۔ تمہیں کیسے پتہ ہے۔۔۔ انسانوں کے درمیان رہنے والے کو انسانی رویوں کا اندازہ تو ہو ہی جاتا ہے۔ کتابوں میں وقت برباد کرنے والوں کا کچھ پتہ نہیں۔ زیارت نے ایک اور کاری وار کیا۔۔۔ اچھا فرض کرو کہ تمہاری بات مان لی جائے تو ہمیں کیا کرنا چاہیے، ہم نے دفاعی انداز اختیار کرتے ہوئے استفسار کیا۔۔۔ یہ کونسا مشکل کام ہے، انگریزی تم بولتے رہتے ہیں۔ معلوم نہیں، غلط بولتے ہو یا درست۔ لیکن کوئی بات نہیں غلط انگریزی سیاست اور الیکشن میں زیادہ کارآمد ہوتی ہے۔ بس فوراً سیاست میں کودو اور خدمت کرو۔۔۔ کس کی خدمت۔ ہم نے عجز اختیار کیا۔۔۔ کسی کی بھی، اپنی ہی کر لو تو بڑی بات ہے۔ بس خدمت کرو، یہی پہلا اور آخری درس ہے سیاست کا۔ باقی کچھ کہنا، سننا، سوچنا وقت ضائع کرنا ہے۔ ایک ہی بات خدمت اور بس خدمت۔۔۔ اے کو الف ترے درکار، ہم نے گرہ لگائی لیکن زیارت نے ہماری بات کو لائق توجہ و تبصرہ نہ سمجھا۔۔۔ تو پھر کب تم راہبانیت ترک کر کے عملی زندگی میں قدم رکھ رہے ہو۔ زیارت بولا۔۔۔ راہبانیت! کیا مطلب۔۔۔ یہ جو تم سارا دن اپنے کمرے میں مقید ہو کر

82 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

پڑھتے رہتے ہو، یہ راہبانیت نہیں تو اور کیا ہے۔۔۔ میری مانو، تیاگ دو ایسی زندگی کو اور آؤ عملی زندگی کی طرف۔۔۔ ہم نے چپ سادھ لی۔۔۔ تھوڑے توقف سے بولا۔

یار سنا ہے علامہ اقبال نے بھی مسلمانوں کو یہی سبق دیا تھا کہ عمل کی طرف آؤ۔ میری بات غلط ہو سکتی ہے لیکن علامہ اقبال کی نہیں۔۔۔ کیا کریں پھر، ہم نے بے زاری سے پوچھا۔ کرنا کیا ہے، سیاست میں آؤ اور الیکشن میں حصہ لو۔۔۔ کس الیکشن میں، ہم نے بالآخر پوچھ ہی لیا۔۔۔ زیارت اپنی فتح پر بے حد مسرور ہوا۔۔۔ یہ ہوئی نا بات۔ میرے دوست تم نے ثابت کر دیا کہ ابھی تمہاری راکھ میں چنگاری موجود ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ چنگاری الاؤ بن جائے اور تم بھی عمل کی زندگی کا مزہ چکھ سکو۔۔۔ ہوں! کیا پوچھا تھا تم نے۔ کونسا الیکشن۔ خوب سوال ہے۔۔۔ زیارت نے آنکھیں بند کیں۔ کچھ دیر چپ رہا۔ پھر سیگریٹ سلگائی اور دیر تک کش لیتا رہا۔۔۔ خوب، بہت خوب۔ کونسا الیکشن لڑا جائے۔۔۔ اسمبلی کے انتخاب کے لئے جو کچھ چاہیے، وہ تمہارے پاس اس جنم میں تو نہیں ہو سکتا۔ کونسلر کا الیکشن۔۔۔ ہوں۔۔۔ لیکن تمہارے بجلی، گیس کے بل تو میں جمع کرواتا ہوں۔ تم کیسے دوسروں کے کرواؤ گے۔۔۔ ٹریڈ یونین کا الیکشن۔۔۔ پر تم مٹھائی لینے جاؤ تو نمکو خرید لاتے ہو۔۔۔ ہوں، ہوں۔۔۔ تم بس محلے کی مسجد کمیٹی کے ممبر بن سکتے ہو، وہ بھی اگر چندہ رجسٹر نہ دیکھنے کا وعدہ کرو۔۔۔ چندہ رجسٹر دیکھنے سے کیا ہوتا ہے۔ ہم نے سوال کیا۔۔۔ چندہ اکٹھا کرنے والوں کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے اور سیاست میں حوصلہ شکنی کرنا سنکھیا کھانے کے مترادف ہے۔ یہ پہلا سبق ہے سیاست کا۔ اب تم خود ہی دیکھ لو کہ ساری عمر تم نے تپسیا کی ہے اور سیاست اور عملی زندگی کا پہلا سبق بھی تمہیں نہیں آتا۔ ابھی بھی تمہاری عمر کے چند سال باقی ہیں، ماضی کے وقت کے ضیاع پر پشیمانی اور ندامت اختیار کرو اور۔۔۔ اور کیا، ہم نے زیارت کو ٹوکا۔۔۔ اور یہ کہ کوئی ڈھنگ کا کام کرو۔ ورنہ یاد رکھو موت اٹل ہے اور کم از کم چار افراد چاہیں وہاں پہنچانے کے لئے جہاں سے سزا جزا شروع ہوتی ہے۔ اس کے بعد ہم میں تاب

83 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

گفتگو نہ رہی۔ زیارت نے بھی کسی جلوس میں نعرے لگانے تھے، سو وہ بھی سٹک گیا۔ ہم نے چائے پی، ایک کتاب کے چند ورق بے دلی سے کھنگالے۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے، لائنٹ آف کی اور سو گئے۔

رات کا پچھلا پہر ہوگا۔ موبائل کی گھنٹی بجنا شروع ہوگئی۔ ہم نے نیم بیداری میں فون دیکھا تو زیارت کی کال تھی۔ جی تو چاہا کہ اگر بندوق اور زیارت دونوں مل جائیں تو آج یہ قصہ تو پاک کر دیں۔ لیکن یہ دونوں موجود نہیں تھے۔ فون سنے بغیر ہی واپس رکھ دیا اور زیارت کے بارے میں وہی کہنا شروع کیا جو وہ ماسٹر شوکت کے خاندان کے بارے میں کہتا تھا۔ ایک منٹ کے بعد پھر زیارت کا فون آگیا۔ ہم نے فون خاموش کر دیا۔ اب ہر پانچ سیکنڈ کے بعد فون آنا شروع ہو گیا۔ اچانک خیال آیا۔ کہیں ایسا نہ ہو زیارت کا کوئی حادثہ ہو گیا ہو اور اُسے مدد کی ضرورت ہو۔ فوراً فون اٹھا لیا۔ ہیلو، ہم نے ڈوبے لہجے میں کہا۔۔۔ کدھر تھے تم، فون سن ہی نہیں رہے تھے۔ ساری رات سوتے اور سارا دن جاگتے رہتے ہو، خاک ایسی زندگی پر۔ زیارت کی آواز ہمیشہ کی طرح کھنک دار تھی۔۔۔ اچھا، تم تو ٹھیک ہی ہو۔ ہم سمجھے کہیں لڑھک گئے ہو گے۔ اس وقت کیوں فون کیا تم نے، نہایت درد بھرے لہجے میں گھگلیائے۔۔۔ میں ابھی جلوس سے فارغ ہو رہا ہوں۔ میرے دوست شیخ عبدالقادر کونسلر بلدیہ اور شجاع حمید گوندل سابق صدر مارکیٹ کمیٹی نکانہ صاحب نے ناشتے کے بعد محکمہ آبپاشی کے ایک کھال میں پانی چھوڑ کر اُسکا افتتاح کرنا ہے۔ اس سلسلے میں آبپاشی کے تمام بیلداروں کے سامنے انہیں تقاریر کرنی ہیں۔ جو تم انہیں لکھ کر دو گے۔ تمہاری سیاسی تربیت کے لئے ضروری ہے کہ تم یہ تقاریر لکھ لو کیونکہ میں نے، اپنے سیاسی کیریئر میں، تم جیسے پڑھے لکھوں کو عملی سیاست میں ناکامی کے بعد روزی کمانے کے لئے صرف تقریر لکھتے ہی دیکھا ہے۔ کل کا کچھ پتہ نہیں۔ تم اگر ناکام ہو گئے، جس کے امکانات کافی روشن ہیں، تو یہ ہنر تمہارے کام آئے گا۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ ناشتے میں شیخ صاحب کو نہاری، پائے اور نان۔

84 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

گوندل صاحب کو حلوہ پوری، پیڑے والی لسی اور مرغ چنے پسند ہیں۔ میری پسند کو تو تم بچپن سے جانتے ہی ہو۔ وہ بھی بنوا لینا۔ ہم فجر کی نماز کے فوراً بعد آرہے ہیں۔ شیخ صاحب اور گوندل صاحب کے پاس وقت کم ہے۔ تقاریر فجر سے پہلے ہی لکھ رکھنا۔ خدا حافظ۔۔۔۔۔ اب آخری مسئلے کی طرف آتے ہیں۔ زیارت نے ناشتہ ختم کرتے ہوئے کہا۔ شیخ صاحب اور گوندل صاحب! آپ دونوں حضرات نے سیاسی ماحول دیکھ رکھا ہے۔ آپ کے علم میں ہے کہ ہمارے انتخابات میں پڑھا لکھا ہونا سوائے شکست کی نشانی کے اور کچھ نہیں ہے۔ محض پڑھا لکھا آدمی بھی کچھ نہ کچھ کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ مروجہ سیاسی طریق کو سمجھے اور اپنی کتابوں اور باتوں سے اجتناب کرے، لیکن یہاں معاملہ ٹیڑھا ہے۔ میرے بچپن کے یار، یہ کہتے ہوئے زیارت نے ہماری طرف رحم بھری نظروں سے دیکھا، دن رات کتابی باتیں کرتے اور کتابوں کے راستے معاشرے کو سیدھا کرنے کے درپے ہیں۔ جبکہ میں نے انہیں الیکشن میں حصہ لینے کا مشورہ دیا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ حضرت کونسلر سے لے کر صدر مملکت کے انتخابات میں سے کسی کے لئے بھی موزوں نہیں ہیں۔ آپ لوگ بتائیں یہ کونسا الیکشن لڑ سکتے ہیں۔۔۔۔۔ ہوں، مسئلہ تو واقعی گھمبیر ہے شیخ صاحب نے اپنی چائے کی پیالی سے پرچ میں ڈالی ہوئی چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے غور و خوض کیا۔۔۔۔۔ لیکن حل اس کا بھی ہے۔۔۔۔۔ کیا، زیارت نے تجسس کا مظاہرہ کیا۔۔۔۔۔ کوئی ایسا الیکشن ڈھونڈو جس میں ووٹر، سپورٹر، امیدوار سب پڑھے لکھے ہوں۔۔۔۔۔ ایسا کنواں کہاں سے ملے گا جس کے گرد کتابوں کی دیواریں ہوں اور اندر ڈگریاں پاس کئے ہوئے مینڈک ٹرٹراتے ہوں۔ زیارت نے اپنی مایوسی کو ہرگز پوشیدہ نہ رکھا۔۔۔۔۔ یہ ڈھونڈنا تو تمہارے یار کا کام ہے۔ شیخ صاحب نے بال ہمارے کورٹ میں پھینک دی۔۔۔۔۔ ہاں بھئی، ہے کوئی ایسا کنواں، جزیرہ یا پاگل خانہ تمہاری نظر میں۔ زیارت نے ہم سے استفسار کیا۔۔۔۔۔ ہاں، وہ ہمارے پیشے کی ایک ملک گیر ایسوسی ایشن ہے جہاں سب لوگ میرے جیسے ہی ہیں۔ ہم نے زیارت کو اتھاہ

85 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

گہرائی سے نکالا۔۔۔ واقعی! وہاں تو خوب خیالی پلاؤ پکتا ہوگا، بحث اور لفاظی بھی ہوتی ہوگی۔ لیکن میں یقین سے کہہ سکتا ہوں۔ اس ایسوسی ایشن نے آج تک کسی کانٹکے تک نہ لگوا یا ہوگا اور یہ بھی پتہ نہیں ہوگا کہ پولیس کی وردی پر فیتی اور پھول چڑھ جائے تو کیا ہوتا ہے۔۔۔ زیارت! اے ہمدِ دیرینہ و وبالِ قدیمہ! بات تم نے صحیح کہی ہے۔ کبھی نلکہ لگوا یا ہے اور نہ پھول اور فیتی کے بارے میں سوچا ہے۔ ہم بڑبڑائے۔۔۔ تو، اس ایسوسی ایشن میں دیگر لوگ بھی تمہاری طرح کے ہی ہیں۔ زیارت نے کریدا۔۔۔ دنیا میں کوئی دو شخص ایک طرح کے نہیں ہیں کیونکہ۔۔۔۔۔ بھائی تم نے ناشتہ کروایا ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم صبح سویرے فلسفہ سنا کر ہمارا پورا دن خراب کر دو۔۔۔ سیدھی سی بات ہے کہ تمہارے ہم پیشہ تم جیسے ہی ہوں گے۔ اُس نے ٹوکا۔۔۔ چلو ایسے ہی کہہ لو یار۔ ہم نے ہتھیار ڈال دیے۔۔۔ واہ شیخ صاحب۔ آپ نے مسئلہ حل کر دیا۔ یہ ہوتی ہے دانائی۔ بس سوچ بچار ختم۔ عمل کی طرف آؤ۔ تم آنے والے انتخابات لڑو گے اور اپنی ایسوسی ایشن کے پلیٹ فارم پر سیاست کرو گے۔۔۔ لیکن مجھے تو کوئی مسئلہ درپیش نہیں ہے، میں کیوں الیکشن لڑوں گا۔ ہم منمنائے۔۔۔ مسئلہ ہے زندگی کی طرف لوٹنے کا تمہارا۔ کس ایشو پر سیاست کرنی اور کس کے خلاف اور کسی کی حمایت میں کرنی ہے یہ سب جزئیات ہیں جو تم جانو اور تمہارا کام۔ ہم نے مرض کی تشخیص کر دی اور دوائی بھی تجویز کر دی۔ اب ہم لوگ اپنے اپنے کاموں کے لئے نکلتے ہیں۔ خدا حافظ۔۔۔ زیارت کے جانے کے بعد ہم نے سکھ کا سانس لیا۔ نیند آرہی تھی، سو گئے۔ اگلے چند روز بے کلی سی رہی۔ جو ہم زندگی بھر کرتے تھے، کرتے رہے۔ لیکن ایک عجب خلش پیدا ہو گئی۔ ہم جس کام کو اپنا ایمان بنائے بیٹھے ہیں کہیں ایسا تو نہیں یہ سرے سے کام چوری ہی ہو۔ دلائل ہمارے پاس زیارت سے زیادہ بلکہ بہت زیادہ تھے لیکن جس راہ کے ہم مسافر تھے، تشکیک اُس کی زادِ راہ تھی۔ ہر نکتہ نظر کے مختلف زاویوں پر غور کرنا سالہا سال سے چھٹی خوئے بد تھی۔ حال تو ہمارا یہ تھا کہ نماز پڑھ لینے کے بعد اگلی نماز

86 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

تک یہ شک رہتا کہ کہیں وضو کئے بغیر تو نہیں پڑھ لی۔۔۔ صاحبو! خلش بڑھتے بڑھتے خدشہ بن گئی تو یونیورسٹی اور پیشے میں اپنے ہم جماعت و ہم راز عبد الحمید شیرازی ملتانی سے بات کی۔۔۔ یار ملتانی تیل کی قیمتیں کم ہوئے بھی مدت ہوگئی لیکن مہنگائی تھمنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ کم آمدنی والوں کا بھی کوئی پرسانِ حال ہے کہ نہیں۔۔۔ کم آمدنی والے اپنی آمدنی بڑھائیں، سوچو تم اور میرے جیسے بے آمدنی والوں کا کیا کیا جائے، ملتانی جواباً بولا۔۔۔ معاشرے کی مجموعی نفسیات میں چڑچڑے پن کا عمل دخل کیسے کم ہو سکتا ہے۔ ہم نے نیا پکوان پکایا۔۔۔ پیٹ خالی ہو تو خوش خلقی و وسیع القلبی کا مظاہرہ تمہارے جیسا چتر باز ہی کر سکتا ہے۔۔۔ بین الاقوامی سیاست میں ہنود و یہود کا گٹھ جوڑ بربادی کی نئی تاریخ رقم کرے گا۔۔۔ بربادی! ہاں، اُن کی پالیسی سے دوسروں کی ہو گی۔ تمہاری اور میری پالیسی سے ہماری اپنی ہی ہو جائے گی۔۔۔ کیا دہشت گردی نا انصافی اور حقوق سلبی کے بطن سے جنم لیتی ہے۔۔۔ حقوق سلبی تو دوسرے کرتے ہیں، ہم تو اپنے حقوق کی بات ہی نہیں کرتے بلکہ ہمیں یہ بھی علم نہیں کہ ہمارے حقوق ہیں کیا۔۔۔ یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو، ہم نے دورانِ گفتگو پہلی مرتبہ نئی زمین میں مصرع لگانے کی بجائے جواب الجواب داخل کیا۔۔۔ گھر کے تہہ خانے کے سب سے پوشیدہ کمرے کے کونے میں بیٹھ کر علمی، تحقیقی بلکہ تفتیشی مواد پڑھ کر رائے قائم کرنا، اُس پر چار دانگِ عالم کے ہم پیشہ و وطرہ احباب سے نقد و جرح لینا، پھر سالہا سال کے بعد ایک رائے بنا کر اس کھوج میں رہنا کہ کسی طریقے سے یہ بھی اگر غلط نہیں تو کمزور ہی ثابت ہو جائے اور بالآخر ایسی نتھری ہوئی رائے کو لکھ کر اپنے ہی صندوق میں بند کر لینا اور ناشر تک کو اس کی ہوا نہ لگنے دینا۔ کیا اس طرزِ عمل سے معاملاتِ زندگی میں بہتری لائی جاسکتی ہے۔۔۔ ملتانی کی رائے سننے کے بعد یہ جاننے میں ہمیں کافی وقت لگا کہ اُس کے منہ میں زیارت کی زبان لگ گئی ہے یا جسم میں اُس کی روح ہی حلول کر گئی ہے۔۔۔ کافی غور کرنے کے بعد کہا۔ چھوڑو ملتانی۔ مرغ چنے مزیدار ہیں، خاص تمہارے لئے بنوائے

87 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

تھے۔ تم نے پوری دیگ کھالی ہے مگر خوش ذائقہ کھانہ بے ذائقہ۔ اگر بد ذائقہ کہا تو پھر اگلی مرتبہ لکشمی سے کھاؤ گے اور پیسے بھی خود ادا کرو گے۔۔۔ بھائی یہ آخری چنے ہیں ہمارے، جن میں مرغ ہے اور وہ بھی اصیل اور پکے بھی دیسی گھی میں ہیں۔ آج کے بعد تو چکڑ چھو لے ہی کھائیں گے، انار کلی کے باہر فٹ پاتھ پر صف ہوگی اور وہاں تمام محمود وایاز چکڑ میں سے چھو لے ڈھونڈیں گے اور ابلے ہوئے انڈے ساتھ کھانے کی تمنا ہوگی جو کبھی پوری نہیں ہوگی۔ رہا مرغ، اصیل یا برائلر، اس کا تو نام ہی بھول جائیں گے۔۔۔ یار ملتانی آج بہت اکتائے ہوئے ہو۔ خیریت ہے، ہم نے اپنائیت کا گولہ مارا۔۔۔ خیریت نہیں ہے، دس برس سے زیادہ ہو چکے ہیں مجھے انجنیرنگ کونسل کی سیاست میں دھکے کھاتے ہوئے۔ مسائل بڑھتے جا رہے ہیں اور دور دور تک کوئی امکان نہیں ان کے حل ہونے کا۔۔۔ ہاں جدوجہد تو تم نے بہت کی ہے۔ کامیابی کیوں نہیں ہو رہی۔ پوچھا۔۔۔ بہت سرکھپائی کی اس سوال پر میں نے۔۔۔ تو نتیجہ کیا نکلا۔۔۔ نتیجہ یہ کہ جدوجہد کرنے والے معلومات کی کمی کا شکار ہیں، جو جانتے ہیں وہ تم جیسے اپنی بلوں سے باہر نہیں نکلتے۔ ایسے لوگ چاہئیں جن کے پاس دلائل کے انبار ہوں اور بات کرنے کا سلیقہ ہو، تب جا کر بات بنے گی۔ ورنہ عمر بھر کا یہ سفر رائیگاں ہی ہے۔ میرا سیاست میں اور تمہارا کاغذ کے اوراق کی سیاہی میں۔ ملتانی نے مایوس لہجے میں کہا۔۔۔ حل کیا سوچا تم نے۔ مکرر استفسار کیا۔۔۔ حل یہ ہے کہ تم ہمارے ساتھ آؤ۔ الیکشن سر پر ہیں۔ تمہارا ماضی داغدار نہیں ہے بلکہ تمہارا تو ماضی ہی نہیں ہے۔ لوگ تمہیں قبول کر لیں گے اور جدوجہد میں نئی جان پڑ جائے گی۔۔۔ گہرا سکوت چھا گیا، کھانا ختم ہو گیا۔ چائے پی لی۔ کرکٹ میچ بھی دیکھ لیا۔ ہار پر سب و شتم بھی ہو گیا۔۔۔ پھر ملتانی بولا، ہاں میاں! زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد۔ پہلی مرتبہ تم جیسے نمائندہ جمادات کو دیکھا ہے۔ جواب نہیں دیا تم نے میری تجویز کا۔۔۔ اچھا بھئی ملتانی جیسے تم خوش، ہم نے حامی بھر ہی لی۔ لیکن انتظامات تمہارے ذمے ہوں گے۔۔۔ یہ کیا

88 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

مطالبہ ہے۔ تم چاہو تو بھی کوئی انتظام نہیں کر سکتے۔ کام تو مجھے ہی کرنا ہوگا۔ تم بس سبھی ہوئی سیٹیج پر آ کر بیٹھ جایا کرو، باقی میں جانو اور میرا کام۔

اولیں سیاسی نشست میں معلوم ہوا کہ ملتانی کا انجنیرنگ کونسل کے اپنے ہی دھڑے میں ایک گمنام تھڑا ہے۔ جس کے لوگ تو اُس کی بات پر لبیک کہتے ہیں لیکن وہ ہیں کتنے۔۔۔ ہمیں تو وہ تعداد یک ہندی ہی معلوم ہوئی لیکن ملتانی کہتا تھا کہ سینکڑوں جانثاران ہیں۔ البتہ وہ ظاہر ہوں گے دجال کے ساتھ لڑائی کے عین بیچ۔ کونسل کے ارکان پورے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ رائے دہندگان کی کل تعداد ایک لاکھ سے متجاوز ہے۔ ایک چوتھائی سے کم کے نام، پتے، قماش معلوم ہیں، باقی کہاں سے ڈھونڈے جائیں گے، معلوم نہیں۔۔۔ تو پہلا مرحلہ ہے کہ ہمارے لئے ایک عدد نامزدگی حاصل کی جائے ملتانی کے دھڑے کی جانب سے۔ جس کو پارٹی ٹکٹ کہتا تھا میرا یا ملتانی۔۔۔ ٹکٹ حاصل کرنا تو سرے سے کوئی کام نہیں ہوگا ملتانی تمہارے لئے اپنے دھڑے کی طرف سے۔ ہم نے چہ میگوئی کی۔۔۔ ٹکٹ حاصل کرنا الیکشن جیتنے سے زیادہ مشکل ہے۔ جس نشست پر تم امیدوار ہو گے۔ اس پر تو سینکڑوں لوگ آس لگائے بیٹھے ہیں۔۔۔۔۔ سینکڑوں! کیا مطلب۔ تمہارے دھڑے کے ارکان کی تعداد کتنی ہے۔ یقیناً ہزاروں میں ہوگی، ہم نے اپنی انتخابی معلومات کے کینوس پر پہلا سٹروک لگایا۔۔۔۔۔ ارکان ہزاروں نہیں، سینکڑوں ہی ہوں گے۔ جواب ملا۔۔۔ سینکڑوں ہی ارکان ہیں اور سینکڑوں ہی ٹکٹ کے امیدوار ہیں۔ ہم نے اپنا سر کھجایا۔۔۔۔۔ جی ہاں۔ سینکڑوں تو دھڑے کے ارکان امیدوار ہیں، باقی ملا کر ہزار سے اوپر ہی ہوں گے۔۔۔۔۔ باقی کون؟۔۔۔۔۔ باقی وہ جو دھڑے سے باہر ہیں، وہ بھی امیدوار ہیں۔۔۔۔۔ آپ لوگ اپنے دھڑے کے ارکان کی موجودگی میں کسی دوسرے کو بھی ٹکٹ دے سکتے ہیں۔ ہمیں حیرت ہوئی۔۔۔۔۔ ہاں یہ ممکن ہے، بلکہ کئی مرتبہ ایسا کرنا پڑتا ہے۔۔۔۔۔ کیوں؟۔۔۔۔۔ اس لئے کہ بیرونی امیدوار بھی اہم ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ کیسے؟۔۔۔۔۔ اُن میں سے کچھ اپنی ذاتی حیثیت

89 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

میں الیکشن جیت سکتے ہیں۔ اُن کو ٹکٹ دے کر ہمیں سرخروئی ملے گی ورنہ رسوائی۔ کچھ ایسے ہوتے ہیں جو ہمارے امیدواران کے انتخابی اخراجات بھی برداشت کر سکتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو بھی ایڈ جسٹ کرنا پڑتا ہے۔ نہ کریں تو ہمارے اصلی امیدوار اپنے الیکشن کے اخراجات کیسے اٹھائیں۔ اور کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اوپر سے وارد ہو جاتے ہیں۔۔۔ اوپر سے یعنی آسمان سے۔۔۔ آسمان ہی کہہ لو، ان کا کچھ پتہ نہیں ہوتا، وہ کون ہیں، کیوں ہیں، کہاں سے ہیں مگر وہ ہیں۔ اور بس ہیں۔۔۔ اور کیا ہوگا ٹکٹ لینے کے لئے؟۔۔۔ کچھ بھی نہیں۔ تمہاری طرف سے ایک درخواست لکھی جائے گی۔ ٹکٹ کمیٹی اس کی جانچ پڑتال کرے گی؟۔۔۔ وہ کیسے؟۔۔۔ وہ، ایسے کہ تمہیں اپنے آپ کو موزوں ترین امیدوار ثابت کرنا ہوگا۔۔۔ کس بنیاد پر؟۔۔۔ بنیاد یہ ہوگی کہ تمہارے اپنے شعبے کے لوگوں کے ساتھ بہترین اور دیرینہ تعلقات ہوں تاکہ تم ووٹ لے سکو، دوم، الیکشن کے اخراجات برداشت کر سکو، سوئم، اپنی پارٹی کے منشور کے مطابق کام کر سکو اور پارٹی کے تمام ارکان خصوصاً سینیئر ارکان کے ساتھ اچھے روابط قائم کر سکو۔۔۔ یہ سب یہ خاکسار کرے گا کیا؟۔ دریافت کیا۔۔۔ ان کے علاوہ بھی کچھ چیزیں ہیں، وہ پھر کسی وقت دیکھ لیں گے۔ لیکن پریشانی کی ضرورت نہیں، چند چیزیں تم کر لینا، باقی میں دیکھ لوں گا۔۔۔ اوہ میں بھول ہی گیا۔ امیدواران کا انٹرویو بھی ہوگا۔ اُس کے لئے تیار رہنا۔۔۔ کیا پوچھیں گے انٹرویو میں؟۔۔۔ کوئی خاص بات نہیں، یہی کہ الیکشن لڑنے کا کتنا تجربہ ہے۔۔۔ تجربہ کیا، ہم نے تو آج تک اپنا حق رائے دہی بھی استعمال نہیں کیا۔ ہمارے پاس تجربہ کہاں سے آگیا۔ ہم نے لجاجت سے عرض کیا۔۔۔ اسی لئے تو تم بہترین امیدوار ہو گے۔۔۔ کیا مطلب؟۔۔۔ جو امیدوار پہلے الیکشن لڑ چکے ہیں، اُن سے کہیں نہ کہیں کوئی غلطی ضرور ہوئی ہوگی۔ جو اُن کے لئے مسئلہ پیدا کرے گی۔ تم نے الیکشن لڑا نہ ووٹ ڈالا۔ جب کیا ہی کچھ نہیں تو غلطی بھی کوئی نہیں۔ تمہارے پاس سیاست کا سب سے کارگر ہتھیار ہے۔۔۔ ہیں! وہ کیا؟۔۔۔ وعدہ

90 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

فردا، بندہ پرور وعدہ فردا۔ بس ساری توجہ اس پر مرکوز کرو اور بہترین خیالی منصوبہ بندی کرو اور انٹرویو میں ایسی تصویر کشی کرو کہ سب یہ سمجھنے لگیں کہ انہوں نے آج تک جو کیا سب غلط تھا، نالائق تھی، وقت کا ضیاع تھا۔ اور جو نیا منصوبہ تم پیش کرو، اگر اس سے پہلو تہی کی گئی تو دنیا و آخرت دونوں برباد ہو جائیں گی۔ زور زیادہ دنیا کے معاملات پر دینا، ساتھ میں بات میں چٹ پٹاپن پیدا کرنے کے لئے آخرت کا بھی ذکر کر دینا۔۔۔ لیکن ملتانی یہ کیسے ممکن ہے اور بالفرض ایسا منصوبہ بنا بھی لیا جائے تو اس کے نتائج کی ضمانت کون دے گا۔۔۔ تم اور کون دے گا۔۔۔ لیکن اگر میں وہ نتائج پیدا نہ کر سکا تو۔۔۔ وہ تو جب نہیں ہوں گے، تب دیکھا جائے گا۔۔۔ ویسے بھی ٹکٹ بہترین منصوبہ بندی کی بنیاد پر تھوڑی دیے جائیں گے۔۔۔ پھر کیا فائدہ منصوبہ بندی کرنے کا۔۔۔ یا تم منصوبہ بندی کرو بس، باقی مجھ پر چھوڑو۔۔۔ اچھا۔۔۔ ملتانی تم اس گورکھ دھندے کو بہتر سمجھتے ہو۔۔۔ انٹرویو کون لے گا؟۔۔۔ ایک پینل ہوتا ہے جس کی صدارت کونسل کے صدر کریں گے کیونکہ ہمارا تعلق انہی کے گروپ سے ہے۔ نام ہے اُن کا عبدالجبار شاہ صاحب۔ وہ قومی اسمبلی میں اپوزیشن لیڈر کے بڑے بھائی ہیں۔ اُن کا خاندان دہائیوں سے قومی سیاست میں سرگرم ہے۔ قومی معاملات کی بہت سمجھ بوجھ رکھتے ہیں اور نہایت خوش مزاج شخصیت ہیں۔۔۔ لیکن تم نے تو کہا تھا کہ یہ ایسوسی ایشن ایک پیشہ ورانہ تنظیم ہے۔ یہ قومی سیاست کہاں سے آگئی یہاں۔۔۔ محترم صدر صاحب کا تعلق ہمارے پیشہ سے ہے، اسلئے وہ ہماری تنظیم میں بے حد فعال کردار ادا کرتے رہے ہیں ساری عمر۔ اور ان کے یہاں موجودگی کی وجہ سے ہم حکومت کے ساتھ بھی رابطے میں رہتے ہیں۔۔۔ اور یاد آیا، ہمارے ہم جماعت کافی متحرک ہیں اپنے اپنے اداروں میں اور ان کی تعداد بھی کافی ہے۔ ایسا کرتے ہیں ان سب کو ملا کر ایک تنظیم بناتے ہیں۔ پھر اس تنظیم کے ارکان کے ووٹ کی تعداد کی بنیاد پر ٹکٹ طلب کی جائے گی۔۔۔ ملتانی! یہ تو ایک بالکل نیا منصوبہ ہے۔۔۔ تنظیم بنائے کون، چلائے کون،

91 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

اخراجات کا کیا ہوگا۔ اور یہ سب ہو بھی جائے تو سب ہم جماعتوں کا ہمارا ہمنوا ہونا کیا لازمی ہے۔ ہم نے ایک نیا پنڈورا بکس کھلتے دیکھا۔۔۔ یہ سب معمولی باتیں ہیں۔ میں آج سے ہی تنظیم بنا رہا ہوں۔ اور ابھی اسی وقت تمہارے سامنے اس تنظیم کی بنیاد کا اعلان کرتا ہوں۔ ملتان کا عزم اور فراست دونوں لائق تعریف بلکہ تعزیر تھے۔ ہم مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔۔۔ کیا نام ہوگا اس تنظیم کا، کتنے ارکان ہیں۔ بجٹ کہاں سے آئے گا، کیا کام کرے گی۔ ہم نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر دیے اس یقین کے ساتھ کہ ایک ایک سوال کا جواب ڈھونڈنے میں ملتان کو کم از کم ایک ہفتہ لگ جائے گا۔ یعنی تنظیم سازی میں ایک ماہ لگے گا اور ٹکٹ کا فیصلہ ہونے میں دو ہفتے رہتے ہیں۔ اس چال سے ہم الیکشن کے کھیل میں ملتان کے کورٹ میں بال پھینک کر کھسک جائیں گے۔۔۔ نام ہے تنظیم احباب، بنیادی ارکان ہوں گے ہمارے تمام ہم جماعت اور ثانوی ارکان ہوں گے تمام ہم جماعتوں کے ہم جماعت اور احباب۔ تنظیم کی رکن سازی ہمارے ہم جماعت اور ان سب کے ہم جماعت ہونے کی بنیاد پر از خود ہوگی، کسی سے تنظیم میں شمولیت کے لئے کوئی فارم نہیں بھروایا جائے گا اور نہ ہی کوئی فیس ہوگی۔ بجٹ فراہم کریں گے تمام ارکان اپنے پلے سے یا جہاں سے بھی وہ لیں آئیں۔ کام ہوگا، اپنے پروفیشن کی بہتری میں کردار ادا کرنا۔ چیرمین ہونے کے لئے تنظیمی امور کا ماہر ہونا لازمی ہوگا۔ عبوری دور کے لئے چیرمین کا نام ہے عبدالحمید شیرازی ملتان جو تمام عہدیدار چننے کا پابند ہوگا۔ اسکے علاوہ عبوری چیرمین باقاعدہ چیرمین منتخب کر کے دینے کا بھی پابند ہوگا۔ نیز عبوری چیرمین تنظیم کے باقی ارکان کی طرح باقاعدہ چیرمین بننے کا اہل بھی ہوگا۔ تنظیم کا آئین اس کے پہلے اجلاس میں اطلاع کے لئے پیش کر دیا جائے گا ان ارکان کو جو آئین میں دلچسپی رکھتے ہوں لیکن اس پر مباحثہ وقت کی قلت کے باعث نہیں ہوگا۔ تاسیسی اجلاس آنے والے ویک اینڈ پر مقامی فائو سٹار ہوٹل میں ہوگا۔ اس اجلاس میں تمہیں باقاعدہ طور پر تنظیم کی طرف سے ایسوسی ایشن کا

92 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

نامزد امیدوار بنادیا جائے گا۔۔۔ سورج کی روشنی کو بھی زمین پر پہنچنے میں چند منٹ درکار ہوتے ہیں لیکن ملتانی تو اس سے بھی زیادہ سبک رفتار نکلا۔۔۔ لو سارا کام تو میں نے کر دیا، اب تھوڑا سا حصہ تم بھی ڈالو، اُس نے ہماری تنظیمی صلاحیت کو لکارا۔۔۔ اب کیا رہ گیا؟ پوچھا۔۔۔ تم صرف یہ کرو کہ تمام ہم جماعتوں کو تاسیسی اجلاس کے لئے دعوت نامے جاری کرو۔ سب احباب کی شرکت لازمی بناؤ اور ڈنر کا بندوبست کرلو، بس۔۔۔ ہاں مہینو تم سے نہیں بنے گا، وہ میں تمہیں بنادوں گا۔ اللہ اللہ خیر سلا۔۔۔ مجھے ایک اور تنظیم کے اجلاس میں شرکت کرنا ہے، چلتا ہوں۔ خدا حافظ۔ ملتانی نے گئیر لگایا اور گاڑی دوڑادی۔

احباب کو فارغ التحصیل ہوئے ایک عرصہ گزر چکا تھا۔ اکثریت نے اس عرصے میں ایک دوسرے کی شکل تک نہ دیکھی تھی۔ سب نے موقع غنیمت جانا اور مع اہل و عیال و اقربا شرکت کے لئے پہنچ گئے۔ ہال کھپا کھچ بھر گیا۔ ہوٹل کی لابی بھی کم پڑ گئی۔ لوگ برآمدوں، لان حتیٰ کے پارکنگ میں ہی ایک دوسرے کے ساتھ خوش گپیاں لگاتے رہے۔ ہمارے ایک دوست اپنے پوتوں، نواسوں، بہوؤں، دامادوں اور سمدھیوں سمیت لگ بھگ دس کاروں کے قافلے میں شرکت کے لئے پہنچے۔ ہم سے بغلگیر ہوتے ہی سب کا تعارف کروایا اور ہمارے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنے خاندان کے سامنے سینہ تان کر کہا۔ یہ ہے وہ میرا جگری یار جس کی باتوں سے میں آپ لوگوں کو پچھلی دودھائیوں سے محظوظ کرتا رہا ہوں۔ زمانہ بدل گیا، نہیں بدلی تو ہماری یاری نہیں بدلی۔۔۔ واہ، واہ۔ یہ تو بہت ہی خوب ہوا کہ آپ کے سارے خاندان سے آج ملاقات ہو گئی۔ زہے نصیب۔ ہم نے منحنی آواز میں استقبال کیا۔۔۔ ایک اور ہم جماعت جنہوں نے اپنی کمپنی بنا رکھی تھی، اپنا سارا سٹاف ازراہ شفقت و سرپرستی لے آئے۔ ڈنر میں پانچ سو لوگ مدعو تھے۔ لیکن یہاں تعداد دو ہزار سے بھی زیادہ تھی۔۔۔ ملتانی نے مائیک سنبھالا اور ایک مختصر خطاب کرتے ہوئے سب کو خوش آمدید کہا، تنظیم بننے کی اطلاع دی۔ اپنی

93 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

ذمہ داری بتائی، تمام احباب کے مسائل کا اجمالاً ذکر کیا اور ایسوسی ایشن کے الیکشن کی اہمیت اجاگر کرتے ہی ہمیں امیدوار نامزد کر دیا۔ کسی کو کچھ سمجھ نہ آیا۔ لیکن بقول ملتانی ہم تنظیم احباب کے نامزد امیدوار بن گئے۔۔۔ اگلے دو تین روز میں تمام ہم جماعتوں کو صورتِ حال کا علم ہوا تو فون کالز اور پیغامات کا تانتا بندھ گیا۔ کسی نے ہمیں مبارک باد دی۔ کسی نے پھٹکار سے نوازا کیونکہ وہ ایسوسی ایشن کے باقی دھڑوں سے منسلک ہو چکے تھے۔ کسی نے وقت کی چال پر آہ بھری کہ ہم جیسا سیاست سے بھاگنے والا بھی لوٹ کھسوٹ میں حصے کا طالب بن چکا ہے۔ کچھ نے سرے سے ہماری نامزدگی کو ہی چیلنج کر دیا اور کہا کہ ہم اُن کے نمائندہ نہیں ہیں۔۔۔ لیکن ملتانی کا موقف اٹل تھا کہ نامزدگی ہو چکی ہے اور آئین کے مطابق صرف چیرمین اس میں تبدیلی کا مجاز ہے۔ ہما شما کو رائے دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ عبوری چیرمین تنظیم احباب نے لیٹر پیڈ چھپوا کر اپنے دستخط کے ساتھ ہماری نامزدگی کو درخواست کے ساتھ منسلک کر دیا اور انٹرویو کی تیاری کا حکم صادر کر دیا۔

انٹرویو شروع ہوئے تو امیدواران اپنے اپنے حمایتیوں کے جلو میں پہنچ گئے۔ اسی دوران وہ چہرے منڈلانے لگے جن کی زیارت ہم صرف ٹی وی پر کیا کرتے تھے۔ اراکینِ اسمبلی، مشیر، وزیر، اعلیٰ عہدیداران و افسران۔ ہمارے لئے یہ منظر بالکل غیر متوقع تھا۔ ملتانی سے پوچھا۔ یہ سب کیوں ہیں یہاں پر۔۔۔ ٹکٹ دلوانے کے لئے اپنے اپنے امیدواران کو۔ اُس نے بتایا۔۔۔ لیکن ان سب کا ہماری ایسوسی ایشن سے کیا تعلق؟۔۔۔ تعلق تو ہوتا ہے یہ سب لوگ ملک میں ہونے والے معاملات سے لا تعلق تو نہیں رہ سکتے اور اگر ایسا کرنا بھی چاہیں تو امیدواران ایسا کرنے نہیں دیں گے۔۔۔ اس صورت میں ہمیں تو ٹکٹ ملنا نظر نہیں آتا۔ ہم نے قدرے مایوسی کا مظاہرہ کیا۔۔۔ ٹکٹ کے لئے میں نے بھی اپنے گھوڑے دوڑا رکھے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ مل جائے گا۔ اور اگر نہ مل سکا تو ہم ٹکٹ ملنے والے کے حق میں دستبردار ہو جائیں گے۔ وہ ہمارا ممنون

94 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

رہے گا۔ اور مستقبل میں کام آتا رہے گا۔ اس بلند خیالی تک ہم کبھی بھی نہیں پہنچ سکتے تھے اگر ملتان ہمارے انگلی نہ پکڑتا۔۔۔ ہماری نشست کے لئے امیدوار تو درجن سے زائد موجود تھے لیکن دو امیدوار اپنے لاؤ لشکر سمیت آئے ہوئے تھے۔ پہلے کا انٹرویو ہوا تو خبر آئی چیرمین صاحب ناراض ہیں۔ امیدوار نے کچھ عرصہ قبل مخالف دھڑے کے ساتھ راہ ورسم پیدا کرنے کی کوشش تھی۔ چنانچہ انہیں انکار کر دیا گیا۔ جو یہی خبر ان کے حمایتیوں تک پہنچی، انہوں نے دوسرے امیدوار کے لشکر پر دھاوا بول دیا۔ گالیاں، نعرے، گھونسے، لاتیں۔ جس کے پاس جو کچھ تھا اُس نے جنگ میں جھونک دیا۔ ابھی یہ میدان کارزار گرم ہی تھا کہ خبر ملی دوسرے امیدوار کو بھی رد کر دیا گیا جس سے کشمکش کی جگہ کنفیوژن نے لے لی کہ دونوں اہم امیدوار ان کو رد کر دیا گیا ہے، اب ٹکٹ کسے ملے گا۔ اتنے میں ہماری باری آگئی۔ اور ہم بحضور صدر محترم پیش ہو گئے۔ انٹرویو پینل میں آٹھ دس افراد شامل تھے۔ مختصر تعارف کے بعد پوچھا گیا۔ الیکشن لڑنے کا تجربہ کتنا ہے۔ اور اگر ٹکٹ دے دیا جائے تو کتنے اخراجات برداشت کر سکتے ہیں۔۔۔ دونوں کا جواب نفی میں تھا۔۔۔ پورے پینل کو سانپ سونگھ گیا۔۔۔ کیا مقاصد ہیں الیکشن میں حصہ لینے کے؟۔۔۔ معاً ہمیں زیارت کا پڑھایا ہوا سبق یاد آیا۔ کہا۔ خدمت۔۔۔ کس کی خدمت؟۔۔۔ سب کی بلکہ ہم سب کی۔۔۔ پینل کے افراد کے چہروں پر ناگواری بالکل عیاں تھی اور قریب تھا کہ ہمارا شکریہ ادا کر دیا جاتا کہ صدر مجلس کو ایک فون کال آگئی۔۔۔ وہ کچھ دیر سنتے رہے، اتنے میں اُن کے نائب نے کہا کہ ہمارے لئے ممکن نہیں کہ آپ کو۔۔۔۔۔ جی۔ ٹھیک ہے۔ صدر ذی وقار نے فون بند کیا اور بولے۔۔۔ جی، ہمیں آپ جیسے لوگوں کی سخت ضرورت ہے جن کے دامن پر کوئی دھبہ نہ ہو۔ آپ تنظیم احباب کے نامزد امیدوار ہیں۔ تجربہ نہیں تو نا سہی۔ اب آجائے گا تجربہ۔ اس نشست پر آپ ہی ہمارے امیدوار ہوں گے۔ آپ الیکشن کے لئے بھرپور تیاری کریں۔ اللہ آپ کا مددگار ہو۔ بہت شکریہ۔ اگلی نشست کے امیدوار ان کو

95 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

بلائیں۔۔ پینل کے اراکین اور ہم دم بخود رہ گئے۔۔ باہر نکلتے ہی ملتانی نے نتیجہ پوچھا۔ بولے، یار انٹرویو میں تو ہم فیل تھے کہ ایک فون آیا اور ٹکٹ ہمیں مل گیا۔۔۔ مبارک میرے دوست مبارک، ملتانی نے کچی گولیاں نہیں کھیلیں۔۔۔ کیا مطلب؟۔۔ اصل میں ہماری صدر محترم کی زوجہ کے ساتھ علیک سلیک ہے۔ وہ آجکل دبئی گئی ہوئی ہیں۔ ہم نے ایک دوست کے ذمے اُن کی مہمان نوازی لگائی تھی اور اُن سے درخواست کی تھی کہ یہ ٹکٹ ہمیں دلوادیں۔ وہ فون کال انہوں نے کی تھی اور بعد میں ہمیں کنفرم بھی کیا تھا، تم اُس وقت انٹرویو کی بھٹی میں پگھل رہے تھے۔۔۔ باہر دونوں مسٹر دامیدواران کے حمایتیوں کو معلوم ہو چکا تھا کہ ٹکٹ دیا جا چکا لیکن سب ایک دوسرے کو پوچھ رہے تھے کہ یہ کون صاحب ہیں۔ ملتانی واش روم میں چلا گیا۔ اتنے میں ہم باہر نکلے تو عجب سماں تھا۔ لوگ اُس شخص کو ڈھونڈ رہے تھے جس کو ٹکٹ ملا تھا۔ دو تین نے ہم سے بھی پوچھا کہ یہ کون صاحب ہیں۔ البتہ یہ خبر پھیل چکی تھی کہ عبدالحمید شیرازی ملتانی کے حمایت یافتہ امیدوار کو ٹکٹ مل چکا ہے۔ لوگ ملتانی کو تلاش کر رہے تھے۔ ہم نے اُسے صورتِ حال سے بذریعہ موبائل فون آگاہ کر دیا۔ مجمعے میں ہم نے قریباً آدھ گھنٹا گزارا۔ ملتانی سے رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ بالآخر گھر کی راہ لی۔ راستے میں اُس کا پیغام آیا کہ وہ مری کے لئے روانہ ہو چکا ہے اور اگلے تین دن فون بند رہے گا۔

اگلے روز اخبارات میں ہمارے انتخابی پینل کا اعلان کر دیا گیا۔ دوسرے دھڑوں کے امیدوار پہلے ہی سامنے آچکے تھے۔ اب ہمارے پینل کے بارے میں ہلکی پھلکی موسیقی شروع ہو گئی۔ مخالف دھڑے تو ایک طرف، اپنے بھی چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ کسی نے اخبار میں خبر لگوا دی کہ ہمارے پینل میں ایسے ایسے گمنام لوگوں کو بھی امیدوار بنا دیا گیا ہے جن کے گھر والے بھی نہیں جانتے کہ یہ الیکشن لڑ رہے ہیں۔ ہم نے اس طعنے پر غور کیا تو اس کی صداقت سے انکار نہ کر سکے۔ کسی نے کہا کہ الیکشن میں ضمانتیں ضبط ہوتی رہتی ہیں لیکن اس دفعہ الیکشن کمیشن ہمارا نام بیلٹ پیپر میں شامل ہی نہیں

96 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

کرے گا چاہے بعد میں اس بات کو نادانستہ غلطی ہی قرار دینا پڑے۔ ایک صاحب نے ہماری موجودگی میں ہمارے بارے میں کہا کہ انہیں ووٹ دینا تو درکنار، گھروالے ان کو کھانا بھی دوسروں کے بعد دیتے ہیں۔ لوگوں کی اس قدر جامع معلومات سن کر حیرت اور ناگواری تو نہیں ہوئی، البتہ پریشانی بہت تھی کہ نہ جانے اور کیا کچھ جانتے ہیں ہمارے بارے میں۔ ملتانی نے ہمیں مشورہ نہ حکم دیا کہ اب تنظیم احباب کا کنونشن بلایا جائے۔ پوچھا، اب کیا ضرورت ہے۔۔۔ پہلا مقصد تو اپنے دھڑے کے لوگوں کو یہ پیغام دینا ہے کہ ہم مضبوط امیدوار ہیں۔۔۔ ملتانی ایک بات تو سمجھاؤ۔ ابھی تک اس کارِ خواری میں ہم نے اپنے مخالف امیدواران اور اُن کے دھڑوں اور کاموں کے حوالے سے کچھ کیا نہ سوچا۔ ہمارا سارا زور اپنے دھڑے کے اندرونی معاملات پر رہا ہے۔ الیکشن تو ہم دوسروں کے خلاف لڑ رہے ہیں اور کام اپنے دھڑے کے حوالے سے کرتے ہیں۔۔۔ مشاہدہ اچھا ہے تمہارا، ملتانی نے مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔۔۔ انٹرا پارٹی پالیٹکس ہی اصل سیاست ہے۔ اور ہر سیاسی جماعت کے کارکنان یہی کرتے ہیں۔ اگر کبھی اس سے فراغت مل جائے تو دوسری پارٹی کے مقابلے میں بھی کچھ نہ کچھ کر لینا چاہیے۔ کوئی حرج نہیں۔ تمہارے سمجھنے کے لئے عرض ہے کہ اپنی پارٹی کی اندرونی سیاست لازمی مضمون ہے اور دوسری پارٹی کے حوالے سے سیاست کرنا اختیاری مضمون۔ لازمی مضمون کے بغیر پاس نہیں ہوا جاسکتا، اختیاری میں سہولت ہے کہ یہ تبدیل کیا جاسکتا ہے۔۔۔ اور دوسرا مقصد تنظیم احباب کے کنونشن کا الیکشن فنڈز اکٹھا کرنا ہے۔۔۔ الیکشن فنڈز یعنی چندہ مانگا جائے گا۔۔۔ یار ویسے یہ مشکل کام ہے اور کسی حد تک شرمناک بھی۔ ہم نے گھبراہٹ کا مظاہرہ کیا۔۔۔ شرمناک کیسے ہو گیا۔ مسجد، مدرسے، یتیم خانے کے لئے بھی تو چندہ ہی اکٹھا کیا جاتا ہے۔۔۔ وہ تو خیر اور انسانیت کے کام ہیں۔۔۔ شرم بھی نہیں پھیلا رہے اور کام بھی سماجیات کا ہی کر رہے ہیں۔ ملتانی نے خفیف خفگی کا اظہار کیا۔۔۔ دراصل تم جیسے کوزہ بند دانشور خیرات کو نیکی اور نظام ٹھیک

97 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

کرنے کو سیاست کہتے ہیں۔ حالانکہ نظام درست کر لیا جائے تو خیرات کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ اور دان دینے کا تکبر اور لینے کا عجز دونوں ختم ہو سکتے ہیں۔۔۔ ٹھیک ہے ملتانی، تمہارے اندر کا انقلابی بیدار ہو چکا ہے۔ لیکن میرے لئے آسان نہیں الیکشن فنڈ اکٹھا کرنا۔۔۔ اگر یہ اتنا ہی گھٹیا کام ہے تو امریکی صدارتی امیدوار کیوں یہ کام کرتے ہیں۔ تمہاری دقیانوسی معلومات اور تہذیب و اطوارِ قبل از تاریخ کے لئے عرض ہے کہ امریکہ میں وہی صدر بن سکتا ہے جو سب سے زیادہ الیکشن فنڈ اکٹھا کر سکتا ہو۔۔۔ تم جو چاہو کہہ لو، ہم اس کام کے لئے چندہ اکٹھا نہیں کر سکتے۔ ہم نے بھی فیصلہ سنا دیا۔۔۔ ہوں، ہوں۔۔۔ ملتانی نے چند لمحے غور کیا۔۔۔ مسئلہ حل ہو گیا۔۔۔ کیسے۔۔۔۔۔ تم نے کنونشن میں تقریر کرنی ہے کہ کیسے نظام ٹھیک کیا جاسکتا ہے اور کیسے تم اس کام کے لئے موزوں ہو اور باقی امیدوار کیونکر یہ کام نہیں کر سکتے۔ بس تمہارا کام ختم۔ اس کے بعد الیکشن اخراجات کا تخمینہ لگا کر کس کس کی جیب سے پیسے نکالنے ہیں، یہ میرا کام ہے۔ فنڈ اکٹھا میں کروں گا اور خرچ بھی، تم ان دونوں کاموں کے لئے نہیں بنے ہوئے۔۔۔۔۔ تنظیم احباب کے اجلاس کے موقع پر ملتانی نے دس لاکھ کا الیکشن بجٹ پیش کر دیا۔ اور تمام دوستوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا۔ کیا ہمارا نظام درست کام کر رہا ہے، یقیناً نہیں۔ اس پر بے تکلف احباب نے آواز لگائی۔ نظام ٹھیک کام کر رہا ہے تم اپنے آپ کو ٹھیک کرو۔ ملتانی نے جواب دیا۔ مذاق بعد میں کریں گے فی الحال کام کی بات کریں اور نظام کی خامیوں اور اصلاح کے طریقوں کے بارے میں غور و خوض کریں۔ تو یہ طے ہے کہ اس بوسیدہ نظام کو بدلنا ہے۔ جس کے لئے وسائل درکار ہیں۔ آپ وسائل فراہم کریں بصورتِ دیگر آپ کو اسی بوسیدہ نظام کا پاسبان قرار دیا جائے اور اگلے اجلاس میں نہیں بلایا جائے گا اور کھانا بھی نہیں کھلایا جائے گا۔۔۔ صاحبو! یہ دھمکی کارگر ہوئی اور ایک شخص بھی موجودہ نظام کے پاسبان ہونے کا طعنہ اپنے سر لینے کے لئے تیار ہوا، نہ چندہ دینے پر۔۔۔ اب ملتانی کی زنبیل سے دوسرا ہتھیار برآمد ہوا۔

کسی کو برسوں پرانی دوستی کا یاد دلایا، کسی کی بیلنس شیٹ بھری محفل میں سنا کر بتایا کہ بہت مالدار ہو چکے ہیں۔ انہیں معاشرے کو انصاف فراہم کرنے اور نظام کی اصلاح کے لئے آگے بڑھنا چاہیے۔ چند قریبی دوستوں کو بخیل امرا کے کھاتے میں ڈال کر اخروی دنیا میں اس عمل کی دردناک سزا کی وعید دی تو کام بن گیا۔ آدھی رقم نقد اور چیک کی شکل میں موقع پر ہی وصول ہو گئی، بقیہ کے وعدے ڈائری میں نوٹ کر لئے گئے۔ آخر میں ملتانی نے نوید سنائی کہ ہم اپنا کام ادھورا نہیں چھوڑیں گے۔ ہم کسی صورت میں آنے والی نسلوں سے یہ شکوہ نہیں سنیں گے کہ ہم نے کام مکمل نہیں کیا۔ ہماری جدوجہد نظام کی تمام خرابیاں دور کرنے تک جاری رہے گی۔ الیکشن سے پہلے بھی، بعد میں بھی۔ بلکہ آنے والے تمام الیکشن میں یہ جدوجہد بلا توقف جاری رہے گی۔ آپ حضرات صرف وسائل فراہم کریں۔ جنگ ہم لڑیں گے۔ اللہ ہمارا حامی و ناصر ہو۔ ڈنر کا بل بھی ملتانی نے اسی چندہ کی رقم سے ادا کر دیا۔

الیکشن مہم کا آغاز نسبتاً شائستگی، نرم گفتاری اور آہستگی سے ہوا لیکن دیکھتے ہی دیکھتے یہ کرختگی، شعلہ بیانی اور طوفانی صورت اختیار کر گئی۔ ہم سمجھتے تھے کہ یہ پروفیشنل لوگوں کی تنظیم ہے۔ اور اس کے انتخابات میں بھی یہی رنگ ہوگا۔ مگر یہاں پروفیشنل کم اور پیشہ ور زیادہ دکھائی دیے۔ تمام رائے دہندگان کو قائل کرنے کے لئے مہم کی منصوبہ بندی کی جانے لگی۔ قریباً ہر روز فجر تا تہجد یہ مہم جاری رہتی۔ انتخابی اعتبار سے مؤثر لوگوں کی فہرستیں بنائی گئیں، اُن سے کیسے رابطہ کیا جائے گا، کون کرے گا۔ رائے دہندگان پورے ملک میں پھیلے ہوئے تھے۔ اُن سب کو کیسے ڈھونڈا جائے گا۔ کون سے ایشوز اہم ہیں اور اُن پر کیا موقف اختیار کیا جائے گا۔ یہ سب منصوبہ بندی کے اہم نکات تھے۔ ہمارے ایک دوست ایک بڑے محکمے کے سربراہ تھے۔ ہم نے تجویز دی کہ ایک وفد کی صورت میں اُن کے دفتر جا کر انہیں قائل کیا جائے کہ وہ اپنے محکمے کے ووٹ حاصل کرنے میں ہماری مدد کریں۔ وفد کی صدارت ہماری ایسوسی ایشن کے صدر نے کی۔

ہمارے میزبان بڑے تپاک سے ملے۔ محنتی، حد درجہ ایماندار، قنوطی اور اپنے کام سے خبطی لگاؤ کی وجہ سے اپنے محکمے میں بے حد ناپسند کئے جاتے تھے۔ اُن سے انتخابات میں مدد مانگی تو انہوں نے اپنے ووٹ کا وعدہ کر لیا لیکن قانون کے مطابق اپنے محکمے کے دیگر رائے دہندگان سے بات نہ کرنے کی مجبوری بیان کر دی۔ جس سے ہمارے وفد کو مایوسی ہوئی اور ہمیں انتخابی ناتجربہ کاری کے تمنغہ امتیاز سے نوازا گیا۔ ایک دوسرے دوست بھی اسی محکمہ میں کام کرتے تھے۔ ہم نے اُن سے رابطہ کر کے یہ روداد سنائی تو کہنے لگے۔ شکر کرو کہ ہمارے افسرِ اعلیٰ نے عذر کیا۔ اگر وہ تمہارے پینل کے لئے چند افراد کو بھی کہہ دیتے تو پورا محکمہ تمہارے خلاف صف آرا ہو جاتا۔ سربراہ محکمہ کے دفتر سے نکلے تو پچاس ساٹھ افراد کے ایک غول نے ہمیں گھیر لیا۔ کہنے لگے کہ صاحب نے پچھلے برسوں میں ملازمین کے ساتھ بہت برا رویہ اپنائے رکھا۔ ہماری یہ انجمن آپ حضرات سے مطالبہ کرتی ہیں کہ ہمارے غصہ شدہ حقوق دلوائے جائیں۔۔۔ پوچھا، کونسے حقوق مارے گئے اور کیوں ایسا ہوا۔ بتایا، سربراہ نے ہم پر غیر حاضری، کام چوری، نالائقی اور خرد برد کے ناجائز الزامات لگائے ہیں۔ حالانکہ ہم سب لوگ محکمے کے معمول کے مطابق ہی کام کرتے ہیں، کوئی غیر معمولی کام نہیں کیا۔۔۔ اب ہمیں واپس صدر محکمہ کے پاس جانا پڑا اور متاثرین باہر انتظار کرنے لگے۔ انہوں نے تمام فائل منگوا لیں اور ایک ایک معاملے کے متعلق ایسے ایسے حقائق بتائے کہ ہم نے چپ سادھ لی۔ دوبارہ چائے کی پیالی پی اور ہمیں متبادل راستے سے باہر نکالا گیا اور ساتھ ہی صاحب موصوف اپنے دفتر کو اندر سے لاک کر کے خفیہ راستے سے باہر نکل گئے۔۔۔

شام ڈھلے دفتر کے باہر متاثرین کو خبر ہوئی تو وہ ایک ٹی وی چینل والوں کو بلا کر لے آئے۔ جنہوں نے ساری روداد ٹی وی پر نشر کر دی اور ساتھ ہم سب دھوکے بازوں کی تصویریں بھی دکھائی گئیں۔ ہر روز کسی نہ کسی گروپ کا جلسہ ہوتا۔ جلسوں کی ترتیب، ٹائمنگ، باتیں، الزامات، جوابات، لعن طعن، دھمکیاں حتیٰ کہ کھانے کی اشیا میں

100 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

ایسا ربط پایا گیا کہ ہمیں شک ہوا کہ مختلف گروہوں کی مہم کوئی ایک شخص ہی چلا رہا ہے۔ ایک پارٹی لاہور میں جلسہ کرتی تو دوسری کراچی میں۔ ایک الزامات عائد کرتی تو دوسرے پہلے اُن کا جواب دیتے پھر اپنے الزامات بیان کرتے جن کا جواب اگلی نشست میں آتا۔ جس پر عدم اطمینان کے بعد طعنہ زنی ہوتی، جو دھمکیوں اور گالی گلوچ پر اختتام پذیر ہوتی۔ پھر دوسرا دور شروع ہوتا۔ نئے الزامات اور نئے جوابات۔ جوں جوں انتخاب قریب آیا۔ الزامات اور بحث میں بھی تنوع پیدا ہوا۔ شروع میں بات کسی پیشہ ورانہ معاملے پر ہوتی جو رفتہ رفتہ ذاتی، گھریلو اور خاندانی معاملات تک جا پہنچتی۔ ایک امیدوار کے بارے میں کہا گیا کہ پندرہ سال قبل اپنی شادی کی تیاری کے دنوں میں انہوں نے ایک دوسرے امیدوار کے سالے کی دکان واقع اچھرہ بازار سے سوٹ خریدے۔ جن کی نصف ادائیگی کی گئی اور بقیہ دوستی کا واسطہ دے کر مؤخر کروائی گئی جو آج تک نہ ہو سکی۔ الزام لگانے والے امیدوار نے یہ بھی بتایا کہ اُن کے مخالف امیدوار کے سالے نے اُن کے گھر ڈیرے ڈال دیے اور جب وہ ادائیگی نہ کر سکے تو اُن کی زوجہ روٹھ کر میکے چلی گئی۔ یہ قضیہ پانچ سال تک چلتا رہا۔ اور بالآخر انہیں دوسری شادی کرنا پڑی۔ مزید یہ کہ پانچ سال انہوں نے جان بوجھ کر پیسوں کا بہانہ بنائے رکھا کیونکہ اُن کا اپنے محلے میں ایک دوسری لڑکی سے رابطہ ہو گیا تھا۔ جس سے انہوں نے جنڈیالہ شیر خان جا کر خفیہ شادی کی۔ کیونکہ اُن کے مرشد نے انہیں یہ ٹپ دی تھی کہ اگر وہ وارث شاہ کے مزار کے احاطے میں شادی کریں گے تو یہ کامیاب ہو گی۔ جب اس شادی کا علم پہلی بیوی کو ہوا تو وہ لاؤ لشکر کے ساتھ اپنے گھر واپس آ گئی۔ گویا یہ معاملہ پیسے کی ادائیگی کا نہیں اُن کے کردار سے متعلق تھا۔ مہم کے ایک مرحلے میں کسی ستم ظریف نے ہمارے صدر محترم کو مشورہ دیا کہ آپ نے پچھلے دور میں جو شاندار کام کئے ہیں، آپ وہ تقریر کے ذریعے بتاتے رہتے ہیں لیکن رائے دہندگان کی توجہ کھانا اور چغلی کھانے کی طرف رہتی ہے۔ اگر الیکشن جیتنا ہے تو اپنے کارناموں

101 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

کے پوسٹر اور ہینڈ بل چھپوائیں اور ہر شخص کو پہنچائیں۔ تاکہ لوگوں کو یہ اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ آپ نے گزشتہ دور میں کیا کارہائے نمایاں سرانجام دیے ہیں۔ یہی پوسٹر دیواروں اور نوٹس بورڈ پر بھی لگائے جائیں۔ جناب صدر کو یہ مشورہ پسند آ گیا۔ انہوں نے پوسٹر، ہینڈ بل چھپوائے اور راتوں رات تقسیم کر دیے۔ اگلے روز ہمارے گروپ کے امیدوار اور جماعتی اس کارنامے پہ بے حد مطمئن نظر آئے۔ دو روز بعد ہمارے مخالفین نے بھی سرخ اور سیاہ رنگوں میں پوسٹر چھپوا کر بانٹے۔ جس میں ہمارے پینل کے ایک ایک کارنامے کے پس پردہ معاملات کو بیان کیا گیا۔ الزامات لگانے والوں نے دفتری انداز میں چٹھیوں، اطلاع ناموں، احکامات کے حوالوں سے رشوت، چور بازاری، اقرباً پروری، اختیارات کا ناجائز استعمال، نالائقی اور نجانے کن کن تہمتوں سے نوازا۔ ہمارے صدر محترم کو اس انداز سے پیش کیا گیا کہ جو کوئی انہیں ووٹ دے گا، وہ جنرل یحییٰ خان کا ساتھی ہوگا۔ اُن کے پینل کے ارکان کو بھی اس ملک میں ہونے والی تمام خرافات کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔ ہمارے بارے میں اُن کے پاس کوئی معلومات موجود نہیں تھیں تو ایک بالکل نئے انداز سے عزت افزائی کی گئی۔ لکھا گیا کہ ہم پچھلے ادوار میں زیر زمین رہ کر تمام کرتوتوں میں شامل رہے ہیں اور دلیل یہ ہے کہ کسی بھی متعلقہ و غیر متعلقہ شخص کو بھنک تک نہیں ہے کہ ہمارا ماضی سیاست کے حوالے سے کیا ہے۔ خفیہ ماضی کی ایک وجہ ہمارا ہمسایہ ممالک کے ساتھ رابطہ بھی ہو سکتا ہے۔ ہمارے گروہ نے پوسٹر اس لئے چھپوائے تھے کہ لوگوں کو زبانی کہی بات یاد نہیں رہتی تھی، مخالفین نے اشتہارات چھپوانے کے بعد ہر جلسے میں انہیں بار بار یوں پڑھا کہ وہ ہر ووٹر کو ازبر ہو گئے۔ بہت سٹپٹائے کہ کم از کم ہم نے کچھ ایسا نہیں کیا جو کہا جا رہا ہے۔ لیکن بقول ملتانی کے، الزام ہمیشہ یاد رہتا ہے، صفائی یا جھوٹ سچ کا کسی کو پتہ نہیں ہوتا۔ اس لئے اپنے اوپر لگے الزامات کا جواب دینے کی بجائے ایسے الزامات ڈھونڈو جو چٹخارے دار ہوں، پھر دیکھو مخالفین کے غبارے سے کیسی ہوا نکلتی ہے۔ ایک اور تماشا بھی ہوا۔ ہمارے

مخالفین نے ہر جلسے میں راگ الاپنا شروع کیا کہ صدر ایسوسی ایشن نے پچھلا انتخاب بدترین دھاندلی سے جیتا تھا۔ بظاہر انتخابی سیاست میں ایسے الزامات کی کوئی خاص حیثیت نہیں ہوتی بالخصوص پچھلے انتخاب اور اُس کے ذریعے منعقد ہونے والی انتظامیہ کا دورانیہ ہی جب ختم ہو چکا ہو تو اس الزام کا ذکر ہی عجیب تھا لیکن یہاں معاملہ کچھ اور ہی نکلا۔ مخالفین نے کہا کہ موجودہ انتخاب میں جناب صدر کے ساتھ جو گروہ اتحاد میں ہیں، اُن میں سب سے بڑا جتھا پچھلے انتخابات میں اُن کا مخالف تھا اور وہ پورے چار سال تک جناب صدر پر انتخابی دھاندلی اور دھوکہ دہی کا الزام لگاتا رہا بلکہ اُن کے خلاف عدالتوں میں برسرِ پیکار رہا۔ اس دوران جو مقدمات انہوں نے صدر کے خلاف دائر کئے وہ ابھی بھی زیرِ سماعت ہیں اور اُن کا فیصلہ نہیں ہوا ہے۔ یہ عجیب صورتِ حال ہے کہ وہی جتھا اس وقت جناب صدر کے ساتھ مل کر الیکشن لڑ رہا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ پچھلے الیکشن میں مبینہ دھاندلی کے حوالے سے صدر موصوف کے خلاف قانونی جنگ بھی کر رہا ہے۔ اس بات کا جواب ہمارے پینل کے جلسوں میں نہ دیا گیا البتہ ہمارے مشاورتی اجلاس میں یہ بات زیرِ گفتگو رہی تو معلوم ہوا کہ جنہوں نے صدر محترم کے خلاف مقدمات بنوائے، ان کا خیال تھا کہ جناب صدر اس مرتبہ بھی یہی کام کریں گے اور یہ حضرات اگلے چار سال بھی حزبِ مخالف کے طور پر جوتے گھساتے پھریں گے اور صرف جلسوں میں ہی کتھارسس کریں گے۔ لیکن اپنے جتھے کو بچانے اور چلانے کے لئے انہیں بھی اقتدار میں حصہ ملنا چاہئے تھا۔ سو وہ صدر محترم کے ساتھ اتحاد میں شامل ہو گئے۔ ایک دوسری توجیہ بھی خفیہ طور پر سنی گئی کہ اس گروہ کو خدشہ ہے کہ وہ اس مرتبہ بھی ہار جائیں گے یعنی اصل معاملہ جناب صدر کی انتخابی کاریگری کم ہے جبکہ ان صاحبان کو اپنی شکست کا خدشہ بلکہ یقین تھا۔ اس لئے انہوں نے یہ حکمتِ عملی بنائی کہ اس مرتبہ بھی جناب صدر دھاندلی کریں اور تنقید سنیں اور بھگتیں جبکہ ہم اقتدار سے اپنا حصہ وصول کریں۔ انتخابی مہم میں ایک مقام ایسا آیا کہ ہمارے مخالفین مہم پر چھائے

103 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

ہوئے نظر آنے لگے، اس وقت ہمارے گروہ کے اجلاسوں کی سائیڈ لائن پر پوچھا گیا کہ کیا صدر محترم نے انتخاب جیتنے کے لئے ویسا منصوبہ بنالیا ہے جیسا گزشتہ الیکشن میں بنایا تھا۔ کسی کے پاس اس کا کافی وشفانی جواب موجود نہیں تھا۔ تو پھر ہمارے گروہ کے حمایتی جھنجھلاہٹ کا شکار ہوتے۔ مایوس ہونے لگتے تو سینئر اراکین اُن کی ڈھارس بندھاتے اور انتخابی مہم پر توجہ مرکوز رکھنے کی تلقین کرتے۔ اندرون خانہ اکثریت کو یقین تھا کہ صدر محترم کچھ نہ کچھ جنتر منتر پھونکیں گے۔ اور ایسا ابر نیساں بر سے گا کہ سیپ میں موتی، کیلے میں کافور اور بانس میں بنسلو چن بنے گا۔ صاحبو! ایسی مہم تھی کہ انتخابی ناشتہ لاہور میں ہوتا، دوپہر کی خواری ملتان میں اور رات کو ڈیرہ غازی خان میں سونے کے لئے چار پائیاں ڈھونڈی جاتیں۔ اگلی صبح اندرون سندھ سے ہوتے ہوئے حیدر آباد، کراچی جانتے۔ وہیں سے حکم ہوتا کہ پشاور میں مخالفین نے کہرام مچا رکھا ہے، فوراً وہاں پہنچو۔ ابھی یہاں کی نمک منڈی کا ذائقہ بھی نہ چکھا ہوتا کہ اسلام آباد میں کسی کی منت سماجت عرف انتخابی مہم کے لئے نکلنا پڑتا۔ یہاں ناز برداری ہو ہی رہی ہوتی تو کوئٹہ اور خضدار والے ہمارے مخالفین سے اپنا معاملہ پکا کرنے لگتے۔ وہاں پہنچ کر پرانے تعلقات کے ذریعے رائے دہندگان کو راہِ راست پر لانے کی سعی کرتے تو گلگت اور مظفر آباد سے SOS آجاتا۔ اہل خانہ ہماری شکل کو ترستے اور ہم دوستوں کے سامنے زوجہ کا فون بھی اٹینڈ نہ کرتے۔ موبائل فون پر پیغامات آتے رہتے جن سے موسمی حالات و تغیرات، بوندا باندی، گرج چمک، آندھی طوفان حتیٰ کہ سونامی کا پتہ چلتا رہتا۔ دورانِ مہم، ہم نے ملتانی سے پوچھا کتنے برس بیت گئے ہیں عملی زندگی میں ہمیں قدم رکھے ہوئے۔ کہنے لگا، سات دن کم ایک مہینہ۔

بالآخر فیصلے کی گھڑی آپہنچی۔ الیکشن سے ایک روز پہلے ملتانی نے کہا کہ ہر امیدوار نے ایک پولنگ اسٹیشن کے معاملات سنبھالنے ہیں۔ شام ہونے سے پہلے ہم چند دوستوں کے ہمراہ میدانِ کارزار کے معائنے کے لئے پہنچے۔ رائے دہندگان کو بہلانے

پھسلانے بلکہ بہکانے اور اکسانے کے لئے ایک انتخابی کیمپ لگایا گیا۔ جس میں جنریٹر کے ذریعے بجلی کا بندوبست کیا گیا۔ کرائے پر صوفے، میز، کرسیاں لائے گئے۔ ناشتے، دوپہر کے کھانے میں طرح طرح کی ڈشیں بنوائی گئیں۔ ہم نے استاد محترم جناب عبدالحمید شیرازی ملتانی سے پوچھا۔ رات کے کھانے کے بارے میں آپ نے کوئی رہنمائی نہیں کی۔ بولے، وہ تو پولنگ کا وقت ختم ہونے کے بعد ہوگا۔ تمام رائے دہندگان کو شام سے پہلے اپنے گھر چلے جانا چاہئے اور اپنے خاندانوں کے ساتھ وقت گزارنا چاہئے۔ اور کھانا گھر میں ہی کھانا چاہئے یہ ان کی ذمہ داری ہے۔ گھر کی دال روٹی، باہر کے پلاؤ، بریانی سے بہتر ہوتی ہے۔۔۔ جی، ہاں بشرطیکہ اہل خانہ اس شام کو دال روٹی فراہم کر دیں۔ ہم نے آہ بھری۔۔۔ اگلی صبح پہنچے تو پولنگ اسٹیشن پر میلے کا سماں تھا۔ ہر پارٹی نے اپنے اپنے انتخابی کیمپ لگا رکھے تھے۔ ہمارا کیمپ ملتانی کے زیر انتظام سب سے بہتر تھا۔ سخت گرمی کے موسم میں ائر کنڈیشنر کا بندوبست بھی تھا۔ میوزک اور لاؤڈ سپیکر بھی جس پر گانوں کے وقفے کے دوران انتخابی ترانے بھی نشر ہوتے تھے۔ چار پانچ نوخیز کلیاں نجانے کہاں سے وارد ہوئیں اور ہر وہ شخص جس پر رائے دہندہ ہونے کا شبہ ہوتا، اُس کو گھیر کر ہمارے کیمپ لائیں، ووٹر لسٹ میں اُس کا نام ڈھونڈتیں، ایک پرچی اُسے تھماتیں اور ہمارے حق میں رائے دینے کے لئے عشوہ و ادا کے وار کرتیں۔ ملتانی کے حسن انتظام کا ایک زمانہ معترف ہو گیا۔ ناشتے میں حلوہ پوری، نہاری، نان، چنے، چائے، جوس کا انتظام تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے مخالف کیمپ ویران ہو گئے اور ہمارے یہاں تل دھرنے کی جگہ نہ رہی۔ پولنگ کا عمل کمپیوٹر کے ذریعے منظم کیا گیا۔ جب کوئی ووٹر آتا۔ اُس کے شناختی نمبر کی کمپیوٹر کے ذریعے پڑتال کی جاتی۔ ملک بھر کے تمام پولنگ اسٹیشن ایک مرکزی نظام کے ذریعے منسلک کئے گئے تھے جس کا فائدہ یہ تھا کہ رائے دہندگان کسی بھی پولنگ اسٹیشن پر جا کر رائے شماری میں حصہ لے سکتے تھے۔ اس نظام کے ذریعے ہر پولنگ اسٹیشن سے یہ پتہ چلایا جاسکتا

تھا کہ کونسا ووٹ کس علاقے میں ڈالا جا چکا ہے۔ پولنگ سٹاف نے بتایا کہ یہ نظام تجرباتی طور پر یہاں استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس کے نتائج جانچنے کے بعد اس کو ملک کے عام انتخابات کے لئے استعمال کیا جائے گا جس سے ہمارے انتخابی طریقہ کار میں شفافیت پیدا ہو جائے گی۔ اس لئے ہمارے اس انتخابی عمل کو ملک کے تمام اہم اور خفیہ ادارے مانیٹر کر رہے ہیں۔ اپنے پولنگ اسٹیشن کا افتتاحی ووٹ ہم نے ڈالا، ساتھ ہی ہمارے مخالف امیدوار نے بھی ووٹ ڈالنے کے لئے اپنا شناختی نمبر دیا۔ لیکن اُس کے ووٹ نمبر کی تصدیق ہونے میں کافی وقت صرف ہو گیا۔ آدھا گھنٹہ گزرنے کے بعد کمپیوٹر پر معلومات ظاہر ہوئیں جن کے مطابق اُن کا ووٹ جنوبی پنجاب کے ایک دور افتادہ پولنگ اسٹیشن سے بھگتایا جا چکا تھا۔۔۔ یہ منظر دیکھ کر پہلے تو سب لوگ حیران ہوئے پھر حیرانی پریشانی، تلخ کلامی، زبان درازی اور ہاتھ پائی میں بدلی اور دو گھنٹوں کے بعد احتجاج شروع ہو گیا۔ ہمارے مخالف گروہ نے الزام عائد کیا کہ صدر محترم نے دانستہ ایسا نظام ترتیب دیا ہے جس کے تحت اُن کے مخالفین کے ووٹ تصدیق کے عمل میں ہی معلق ہو جائیں۔ ہمارے حامیوں کے اکثر ووٹ بآسانی بھگتائے جا رہے تھے البتہ اکا دکا مواقع پر ہمیں بھی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن ہم اسے برداشت کرتے اور مخالفین کو یہ باور کرواتے کہ کمپیوٹر کے ذریعے رائے شماری کا یہ پہلا تجربہ ہے۔ اس میں خامیاں ہو سکتی ہیں۔ جن کو اگلے انتخابات میں درست کر لیا جائے گا اور یہ بڑے اعزاز کی بات ہے کہ اس نظام کے کامیاب تجربے کے بعد اس کو ملک کے عام انتخابات میں استعمال کیا جائے گا، جس سے ہمارے انتخابی نظام میں شفافیت پیدا ہوگی اور عوام کے اس نظام پر اعتماد میں اضافہ ہوگا۔ ملک میں سیاسی استحکام ہوگا تو سماجی اور معاشی ترقی کی راہیں کھلیں گی۔ اور ہم تاریخ میں اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر پائیں گے۔ عالمی منظر نامے میں مستقبل ہمارا اور صرف ہمارا ہوگا۔ یہ باتیں سن کر ہمارے مخالف کہنے لگے گویا آپ کے مطابق ہمارے ملک کو سپر پاور اس طرح بنایا جاسکتا ہے کہ آپ

کو آج کے انتخاب میں کھل کھلنے دیا جائے۔ ایسی سپر پاور سے ہم لنڈورے ہی بھلے۔ دوپہر سے پہلے اطلاعات آنا شروع ہوئیں کہ پورے ملک میں ایسے کی واقعات ہوئے ہیں جن میں ووٹر کے پولنگ اسٹیشن پر پہنچنے سے پہلے ہی اُن کے ووٹ ڈالے جا چکے تھے۔ ملتانی نے صدرِ محترم سے اس سلسلے میں بات کی تو معلوم ہوا کہ الیکشن کے تکنیکی کام کسی کاروباری کمپنی کو سونپے گئے تھے لیکن اُس کمپنی نے عین پولنگ کے دوران تسلیم کر لیا ہے کہ وہ یہ کام معیار کے مطابق نہیں کر پائے۔ یہ خبر پورے ملک میں پھیل چکی تھی۔ اور ہمارے مخالف گروہ نے الیکشن کا بائیکاٹ کرنے کے بعد مختلف شہروں میں جلوس نکالے اور پریس کانفرنس میں الیکشن میں دھاندلی کے الزامات عائد کر دیے۔ اس صورتِ حال میں الیکشن ملتوی کرنا پڑا۔ ہمارے صدرِ محترم نے جوابی پریس کانفرنس میں الیکشن کے التوا کا کریڈٹ لیتے ہوئے کہا کہ پولنگ کے دوران چند تکنیکی خامیوں کی وجہ سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ الیکشن کو ملتوی کر دیا جائے اور انتخابی عمل کی خامیوں کو دور کر کے دوبارہ انتخاب کروایا جائے۔ گویا صدرِ محترم نے مخالفین کے احتجاج کی بجائے نظام کی اصلاح کے لئے یہ قدم اٹھایا ہے۔ اس پر ہمارے مخالفین بہت ٹپٹائے۔ اُن کا کہنا تھا کہ نجانے اگلے انتخابات میں صدرِ محترم کونسا گرا آزمائیں گے۔ جسے وہ خامیوں کی اصلاح کہیں گے۔ دوپہر تک ہمارا ٹینٹ اجڑ چکا تھا۔ ہمیں انتخابی عمل کے ادھورا رہ جانے کا شدید افسوس اُس وقت ہوا جب یہ معلوم ہوا کہ دوبارہ الیکشن میں صرف پولنگ دوبارہ ہوگی۔ امیدواران اور باقی سارا انتظام یہی رہے گا۔ اب ہم چاہیں بھی تو الیکشن سے دستبردار نہیں ہو سکتے۔ جبکہ ملتانی سمیت دیگر حضرات شفافیت، دھاندلی، اگلا الیکشن جیسے موضوعات کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔

چند روز کے لئے انتخابی عمل میں تعطل پیدا ہو گیا۔ کیونکہ دونوں گروہوں نے حکومت، عدالت، اخبارات، ٹی وی سے رجوع کرنا شروع دیا اور ہم جیسے نچلے درجے کے امیدوار اس سارے مرحلے پر غیر اہم ہو گئے۔ اعلیٰ سطحی کشمکش میں وفاقی وزاراً بھی

کو دپڑے حتیٰ کہ معاملہ وزیر اعظم کے دفتر پہنچ گیا۔ نتیجتاً جناب صدر کو عدالت نے اُن کے عہدے سے ہٹا دیا اور ایک نگران کمیٹی بنائی گئی جس کا کام الیکشن کروانا تھا۔ دوبارہ الیکشن کی تاریخ مقرر ہوگئی لیکن انتخابی مہم میں وہ شدت نہ پیدا ہو سکی جو پہلی مرتبہ تھی۔ جلسے، جلوسوں کے لئے دستیاب پیسے ختم ہو چکے تھے۔ اور نئے انتخابات کے لئے کفالت کرنے والے بدلتی ہوئی صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جب انتخابی تاریخ قریب آ پہنچی تو صدر محترم نے ہمیں فون کر کے ایک جلسہ کرنے کا حکم صادر کیا۔ اب اُن کے نام کے ساتھ سابقہ کالاحقہ بھی لگ چکا تھا۔ ہم نے جلسے کے لئے ایک ہزار لوگوں کی گنجائش والا ہال کرائے پر لیا۔ اسٹیج، سجاوٹ و آرائش اور کھانے کے انتظامات ادھار لے کر کئے گئے۔ جلسے سے ایک دن پہلے ملتان سے بھی آنے کی حامی بھر لی۔ جلسے کی شام بادل برسنے لگا تو انتظامات میں کافی دقت ہوئی۔ صدر محترم اپنی گاڑیوں کے قافلے کے ہمراہ قریباً ایک گھنٹہ تاخیر سے پہنچے۔ ہم نے آگے بڑھ کر استقبال کیا۔ ہال کا درازہ کھولا۔ جناب صدر نے ایک قدم اندر رکھا تو فوراً واپس پلٹے۔ باہر نکلتے ہی کہا۔ کہ ہال تو بالکل خالی ہے۔ جلسہ اور تقاریر کس کے لئے ہوں گی۔ ہم نے صورتِ حال پر غور کیا۔ ہمیں تو صدر محترم کی بات درست معلوم نہیں ہوئی کیونکہ ہال میں پندرہ بیس لوگ تو یقیناً ہوں گے۔ خدمتگاروں کو ملا کر۔ صدر مجلس کے ارشاد پر ایک بغلی کمرے میں جلسہ منتقل کیا گیا۔ اتنے میں ملتان سے بھی پہنچ گیا جس نے بذریعہ فون لوگوں سے رابطے کر کے تیس آدمیوں کی گنجائش والا کمرہ کھپا کھچ بھر دیا۔ چند دنوں کے بعد دوبارہ انتخابی دنگل سبج گیا۔ اس مرتبہ ناشتے میں نہاری، پائے کی کمی محسوس ہوئی۔ ہمارے انتخابی کیمپ میں گہما گہمی تو رہی لیکن پہلی مرتبہ جیسا جوش و خروش دیکھنے میں نہ آیا۔ اس الیکشن میں کمپیوٹر سے صرف بیلٹ پیپر چھاپنے کا کام لیا گیا۔ ملتان کو اپنے تایا زاد کی منگنی کے سلسلے میں جوہر آباد جانا پڑا، اتنا اہم کام وہ پولنگ کی خاطر تو نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ ہم صبح سے شام ہونے کی دعا مانگتے رہے۔ یہ دعا شام کو پوری ہوگئی۔ رائے دہندگان اور باقی لوگ اپنے

اپنے گھروں کو چلے گئے۔ ہم ووٹوں کی گنتی کے دوران پولنگ عملے کے پاس بیٹھے تماشاے اہل کرم دیکھتے رہے۔ گنتی مکمل ہوئی تو عقبی دروازے سے نکل کر گھر پہنچ گئے۔ کیونکہ سامنے والے راستے پر انتخابی کیمپ کے ٹینٹ لگانے والے اخراجات کی ادائیگی کے لئے ہمارے انتظار میں موجود تھے۔ رات کے پچھلے پہر ملتان کا فون آیا۔ اُس کے پاس حتمی نتیجہ تھا۔ چھوٹے ہی کہنے لگا ہم جیت نہیں سکے کیونکہ ہمارے مخالف جیت چکے ہیں اور الیکشن قوانین کے مطابق اگر ایک فریق جیت جائے تو دوسرا نہیں جیت سکتا۔ اگلی صبح نو منتخب صدر کی پریس کانفرنس ہوئی جس میں انہوں نے سب کا شکریہ ادا کیا، بالخصوص انہوں نے چند نام لئے جن کی وجہ سے جمہوری عمل کو تقویت ملی تھی۔ ہمارا نام بھی اُن میں شامل تھا۔ ہمارا بھی شکریہ ادا کیا گیا۔ اس پریس کانفرنس میں ملتان نے نئے عزم کے ساتھ مسائل کے حل کرنے کا وعدہ کیا۔ وہ نو منتخب صدر کے برابر والی نشست پر بیٹھا ہوا تھا۔ شام گئے زیارت کو خبر ملی تو وہ مٹھائی کا ٹوکرا لے کر ہمارے ہاں آ گیا۔ ہمیں مبارک باد دی۔ ہم دم بخود رہ گئے۔ ہمیں اپنے بچپن کے ساتھی پر بے حد پیار آیا کہ وہ اس غلط فہمی میں ہے کہ ہم الیکشن جیت چکے ہیں۔ زیارت کو چائے پلاتے ہوئے بتایا کہ شائد تم نے اخبار پڑھا یا پڑھوایا نہیں، ہم الیکشن جیت نہیں سکے۔ اُس نے بڑے اطمینان سے اپنی ہی لائی ہوئی بالوشا ہی کھاتے ہوئے کہا۔ مجھے علم ہے کہ تم جیت نہیں سکے۔۔۔ تو پھر یہ مٹھائی اور مبارکباد کس چیز کی ہے، ہم نے استعجاب سے کہا۔۔۔ زیارت نہایت رसान سے بولا، مٹھائی تمہارے عملی زندگی میں آنے کی ہے اور مبارکباد ہے کہ تم اگلا یا اُس سے اگلا الیکشن جیت جاؤ گے، شرط صرف یہ ہے کہ عملی زندگی میں ڈٹے رہو۔

یہ ہم کیا کر بیٹھے



آٹھ دس برس پرانی بات ہے کہ ہماری یونیورسٹی نے لاہور کے نواح میں ایک نیا کیمپس بنانے کا منصوبہ بنایا۔ اور صدر شعبہ کے لئے نظر انتخاب ہمارے سنگی سنگتی علامہ دہرو عالم بے بدل عبدالحمید شیرازی ملتانی پر پڑی۔ جس پر یار لوگوں نے اپنی اپنی زمین میں مصرعے لگائے۔ کسی نے کہا ملتانی مین کیمپس میں تو صدر شعبہ نہ بن سکا، البتہ نئے کیمپس میں پیشکش ہوئی ہے۔ دوسرے نے کہا جی ہاں۔ یہ پیشکش اُس وقت تک تو ہوگی جب تک نیا کیمپس کام کرنے کی جگہ نہیں بن جاتا۔ ایک اور نے کہا۔ یہ دراصل موصوف سے جان چھڑانے کی کوشش ہے۔ لیکن ملتانی نے ان باتوں کو حسدِ رقیباں قرار دیتے ہوئے نہ صرف اس پیشکش کو قبول کیا بلکہ یارانِ بدخواہ کے سینے پر مونگ دلنے کے لئے یونیورسٹی سے گاڑی، ڈرائیور، انتظامی و مالی اختیارات، اضافی تنخواہ اور لچکدار اوقاتِ کار مانگ لئے۔ بقولِ رقیبانِ روسیہ مالی اختیارات کے ہوتے ہوئے اضافی تنخواہ کا مطالبہ بالکل ہی نامناسب بات تھی۔ لیکن ملتانی کا کہنا تھا کہ مذاکرات میں آپ کے پاس لین دین کے لئے کچھ آپشن ہونے چاہئیں۔ اگر انتظامیہ نے اس فہرست میں سے کسی چیز کو نکالا تو میں اضافی تنخواہ کو ہی قربان کر سکتا ہوں، باقی مطالبات اصولی نوعیت کے ہیں، ان پر بات نہیں کی جاسکتی بالخصوص مالی اختیارات کے بغیر تو کوئی بھی منصوبہ پایہ تکمیل تک پہنچ ہی نہیں سکتا۔ ہمیں تو خیر اندازہ تھا ہی کہ ملتانی کے تمام مطالبات تسلیم کر لئے جائیں گے لیکن یہاں تو معاملہ اس سے بھی آگے بڑھا کہ انتظامیہ نے مطالبات ماننے کے علاوہ اُس کے جذبہ ایشار اور کام کی لگن کو ایک سرکاری

111 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

چٹھی کے ذریعے سراہتے ہوئے تمام مطالبات کے سامنے بصد شوق سر تسلیم خم کر دیا۔
 -- ہمارے یارِ خاص نے جذبہ حب الوطنی سے کام لیتے ہوئے نئے کیمپس کی تعمیر کا
 بیڑا اٹھانے کا عہد کر لیا۔ نئے کیمپس کے لئے زمین کا حصول، عمارات کی تعمیر،
 ٹھیکیداروں اور شعبہ مالیات و حساب کتاب کے ساتھ بیک وقت تعلقات کار کو نبھانا بس
 ملتانی کا ہی کام تھا۔ دو تین سال بعد اس نے خوش خبری دی کہ تعمیراتی و ترقیاتی کام مکمل
 ہیں اور ساتھ ہی جامعہ کو اس نواحی کیمپس سے آگے، کہیں بہت آگے، کسی دور دراز قصبے
 میں ایک اور کیمپس بنانے کی تجویز دی۔ اس تجویز پر پھر حاسدوں نے کہا کہ دور دراز
 کے قصبات میں من مانی کرنا آسان ہوتا ہے۔ لیکن ملتانی نے کہا کہ چھوٹے قصبات کو
 ترقی دینا ریاست کی ذمہ داری ہے اور وہ تعمیر وطن کی ایک نہ بچھنے والی پیاس رکھتا ہے۔
 جی بھی تو لاہور کی پر رونق زندگی چھوڑ کر دور دراز جانے کے لئے تیار ہے۔ جس پر یاروں
 نے کہا کہ تم رہتے تو لاہور میں ہو، دفتر بھی لاہور میں ہی رکھتے ہو۔ جن قصبات میں تم
 کیمپس بنوانا چاہتے ہو، وہاں کیوں نہیں چلے جاتے۔ ملتانی لا جواب ہونے والا کہاں
 تھا، بولا۔ تمام مالی اور انتظامی محکمے اور دفاتر لاہور میں ہی ہیں۔ قصبات میں تعمیر و ترقی
 کے لئے لازمی ہے کہ کام وہاں ہو اور رابطے کے لئے دفتر لاہور میں ہو۔ اور ہاں جو لوگ
 دیہات و قصبات میں کیمپس کی تعمیر پر معترض ہیں، وہ دراصل پس ماندہ علاقوں کو ترقی
 دینے کے خلاف ہیں جو ایک سراسر غیر آئینی اور قابلِ مواخذہ سوچ ہے۔ ایسی سوچ حب
 الوطنی سے عاری ملک دشمنوں کی ہی ہو سکتی ہے۔ اس دلیل پر اُس کے مخالفین کا دھڑن
 تختہ ہو گیا۔ اور ان کے پاس وطن دشمنی سے بچنے کے لئے دو ہی راستے رہ گئے۔ ملتانی
 کی تجویز کی حمایت کریں یا کم از کم خاموشی اختیار کریں، تو انہیں چُپ ہی سادھنا پڑی
 اور یوں ملتانی اپنے اگلے منصوبے پر روانہ ہو گیا اور نواح لاہور کے کیمپس میں صدرِ
 شعبہ کی نشست پھر خالی ہو گئی۔ جاتے جاتے اُس نے اپنا پنڈ چھڑانے کے لئے خالی
 نشست کے لئے ہمارا نام تجویز کر دیا۔ اور ساتھ ہی یہ اطلاع پہنچا دی۔ کہ ہم اُس کے

پرانے اور جگری یار ہیں تو یہ اس نے عنایت کی ہے ہمارے حال پر۔ اس اچانک افتاد پر ہم دم بخود رہ گئے۔ بہت کوشش کی کہ ہم سے زیادہ قابل لوگوں کی موجودگی میں ہمیں اس منصب سے نوازنے کی ہرگز ضرورت نہیں لیکن انتظامیہ نے بات سنی ان سنی کرتے ہوئے قیامت کا ایک نامہ ہمارے پتے پر بھجوا دیا۔ جس میں نئے منصب پر تعیناتی کی اطلاع دی گئی، پھر اس کے ساتھ مبارکباد دی گئی اور اس توقع کا اظہار کیا گیا کہ ہم اپنی پوری توانائی اور دلجمعی کے ساتھ فرائض منصبی انجام دیں گے۔ اگلے بند میں دوبارہ تاکید کے ساتھ بتایا گیا کہ نئے کیمپس میں نہ جانے کی صورت میں آپ سے ملازمت کی ذمہ داریاں واپس لے لی جائیں گے اور آجر اور اجیر کے درمیان جو کچھ دھاگے سے بندھا ناٹہ ہے، وہ ٹوٹ جائے گا۔ اب بات یہاں آن پہنچی کہ نئے کیمپس کو ہی دارالامان قرار دینا پڑا۔

ملتان نے نئے کیمپس کے بارے میں کہا کہ وہاں فرانس اور امریکہ کی جامعات سے بہتر سہولیات فراہم کرنے میں اُسے دن رات کام کرنا پڑا۔ وسط جون کی ایک چلچلاتی دوپہر کو جب ہم نئے کیمپس پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہاں ہمارے یا کسی اور کے بیٹھنے کے لئے کوئی کرسی، چارپائی، دری یا صف تک موجود نہیں ہے۔ توضیح اس کی یہ کہ ملتان سمجھتا ہے کہ بلاوجہ زمین کے اوپر کسی چیز کو بچھانا اور وہ بھی صرف اس لئے کہ بیٹھنا یا لیٹنا مقصود ہے فضول خرچی اور تضييع اوقات اور بے زبان زمین کے ساتھ ظلم ہے جس سے انسان کے روحانی درجات میں کمی آنے کا خدشہ رہتا ہے تو کیوں ایسے جھنجھٹ میں پڑا جائے۔ دوسرا معاملہ یہ ہوا کہ لکھنے، پڑھنے کے لئے کوئی کاغذ، قلم، روشنائی بھی موجود نہیں۔ اس ضمن میں ملتان نے وضاحت کی کہ ہمارے اسلاف کا طریق یہی تھا کہ علمی معاملات میں حافظے سے کام لیا جائے۔ لکھنے پڑھنے سے یہ سقم آشکار ہو سکتا ہے کہ ہمارا حافظہ کمزور ہے۔ اس لئے اراداً یہ اہتمام کیا گیا کہ تمام کام حافظے کے بل بوتے پر سر انجام دیے جائیں۔ تیسرا مسئلہ یہ درپیش آیا کہ پینے کے لئے پانی بھی میسر نہ تھا۔ جس کا

جواب یہ ملا کہ صبح گھر سے پی کر آئیں اور شام کو وہیں جا کر پیئیں۔ دورانِ اوقاتِ کار پانی پینے پر وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے اور ساری توجہ کام پر مرکوز رہنی چاہئے۔ کس کام پر، ہم کسمسائے۔ جواباً ملتانی نے ہمیں ہڈ حرامی، کج بخشی اور بدنیتی کے تمنغے عطا فرمائے۔ ملتانی کی اس عالمی معیار کی سہولیات کو مقامی معیار تک لانے کے لئے ہمیں جو پا پڑ بیٹے پڑے وہ ایک الگ داستان ہے۔ دو تین برسوں میں کاروبارِ درس و تدریس کچھ چل پڑا تو ہمیں ایک نیا خیال سوچھا۔ ایک صبح ہمیں چٹھی موصول ہوئی جس میں ہمارے اسٹوڈنٹس کو اندرونِ پختونخواہ میں واقع جامعہ میں منعقد ہونے والے ایک مقابلے کی دعوت دی گئی۔ اس خیال سے کہ ہمارے اسٹوڈنٹس کو اپنی صلاحیتیں دکھانے کا موقع ملے گا، ہم نے انہیں اس مقابلے میں شریک ہونے کی ترغیب دی۔ ہمارے نومولود کیمپس کے طلباء و طالبات بلکہ اساتذہ کے لئے بھی یہ ایک نیا تجربہ تھا۔ طلباء و اساتذہ نے اس مقابلے کے لئے دن رات اتنی محنت کی کہ اگر اس سے نصف بھی پڑھائی کے لئے کی جاتی تو کوئی بھی دوئم نہ رہتا، سب اول ہی آتے۔ طلباء و اساتذہ نے آخری وقت میں ہمیں بھی ساتھ چلنے پر قائل کر لیا۔ مقابلے میں ہمارے طلباء و طالبات کی کارکردگی اس لئے بہتر تھی کہ دیگر شرکاء اسے معمول کا ایک مقابلہ سمجھتے ہوئے تیار ہو کر آئے جب کہ ہمارے یہاں اس پر سردھڑ کی بازی لگا دی گئی تھی۔ مقابلے کے بیشتر انعامات ہماری ٹیم نے جیت لئے تو واپس آ کر کئی روز تک جشن جاری رہا۔ اور اس مقابلے کا تذکرہ تو شائد نصف صدی تک ہوتا رہے گا۔ چند دن گزرے تو ہمارے طلباء نے کہا کہ ہم بھی ملکی سطح کا ایک ایسا ہی مقابلہ منعقد کرنا چاہتے ہیں۔ طلباء و اساتذہ کے غیر نصابی سرگرمیوں کے ذریعے کردار سازی کے جذبے سے ہم بہت متاثر ہوئے کیونکہ ہمارا راسخ عقیدہ تھا اور ہے کہ نصابی سرگرمیاں انسان کو ایسا گدھا بنا دیتی ہیں جو سنگلاخ چٹانوں میں سبز گھاس کی تلاش کر رہا ہو۔ فتنہ و فساد اور اپنی ملازمت کے ڈر سے ہم اس بات کا اظہار نہیں کر سکتے تھے۔ طلباء و اساتذہ نے جب یہ کہا کہ اگر مضافات کی جامعات ملکی سطح کے مقابلے

114 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

کروا سکتی ہیں تو ہم کیوں نہیں۔ بس اس جملے نے ہمارے اندر کا کھانڈرا طالب علم بیدار کر دیا۔۔۔ ملکی نہیں، ہم بین الاقوامی سطح کا مقابلہ منعقد کروائیں گے۔ ہم نے کہا۔۔۔ اس پر طلباء و اساتذہ اس قدر جذباتی ہوئے کہ ہمارے حق میں نعرے لگانا شروع کر دیے۔ کچھ نے ہمارے ہاتھ کو بو سے بھی دیے۔ ایک طالب علم اس موقع پر کنٹینر سے مٹھائی لینے چلا گیا۔ آدھ گھنٹے بعد وہ ٹوکرا بھر کر پکوڑے لے آیا کیونکہ نئے کیمپس کی کنٹینر پر صرف یہی دستیاب تھے۔ شعبے کے تمام طلباء و اساتذہ نے بین الاقوامی غیر نصابی مقابلے کے فیصلے کا استقبال پرانے اخباروں میں لپٹے ہوئے نیم گرم پکوڑے کھا کر کیا۔ اساتذہ سمیت سب خوش گپیوں میں مشغول رہے اور اگلے دو پیریڈ کسی نے پڑھے نہ پڑھائے۔ اس خوشی میں ہاسٹل میں رات کو مرغ کڑاھی اور فرنی کی دعوت کی گئی۔ لڑکے ساری رات تاش کھیلتے رہے۔ پختون طلباء نے پشتو فلم دیکھتے ہوئے نسوار کھائی۔ نسوار نے جب رنگ دکھایا تو انہوں نے خشک رقص بھی کیا۔ جس سے طلباء کی اکثریت محظوظ ہوئی لیکن محسود قبیلے کے طلباء نے اسے اپنی بیٹی سمجھا اور اپنے قبیلے کے رقص کا مظاہرہ کر دیا۔ اس پر مقامی طلباء بھی تاؤ کھا گئے اور بھنگڑا ڈالنے لگے۔ یہ مقابلہ رات گئے تک جاری رہا۔ اگلے روز بھنگڑا لو طلباء اپنی پنڈلیوں میں درد اور سوزش کی دوا ڈھونڈتے پائے گئے۔

چند روز کے بعد ہم نے طلباء و اساتذہ کی میٹنگ میں کہا کہ ہمارے پیشے کی ایک بین الاقوامی تنظیم ہے جو ہر سال طلباء و طالبات کے غیر نصابی مقابلے کرواتی ہے۔ ان مقابلوں کی بین الاقوامی تشہیر بھی کی جاتی ہے۔ ہم اس تنظیم سے رابطہ کر کے انہیں قائل کرنے کی کوشش کریں گے کہ وہ اس سال کا مقابلہ ہمارے کیمپس میں کروائے۔ اس سلسلے میں طلباء و اساتذہ پر مشتمل ایک کمیٹی بنا دی گئی جس کے ذمے مقابلے کی منصوبہ بندی کرنا تھی۔ ہر سال ایشیاء کی مختلف جامعات اس پیشہ ورانہ مقابلے کے انعقاد کے لئے اپنی دلچسپی کا اظہار کرتی ہیں۔ ایک مفصل تجویز کے ذریعے تنظیم کو قائل کرنے کی

کوشش کی جاتی ہے۔ جس میں جامعہ کی سہولیات اور مقابلے کے لئے موجود وسائل بھی بتائے جاتے ہیں۔ ہمیں اپنی جامعہ اور کیمپس کے حالات کے بارے میں کوئی غلط فہمی نہ تھی کہ ہم اُن سے مقابلے کے انعقاد کے لئے بجٹ مانگتے۔ ہم نے اپنے شعبے کے لیٹر پیڈ پر اپنے ہی دستخطوں کے ساتھ ایک سرٹیفیکیٹ جاری کیا کہ ہم اس مقابلے کے لئے کئی لاکھ روپے خرچ کر سکتے ہیں۔ اور ساتھ ہی اپنے طلباء اور اساتذہ پر واضح کر دیا کہ یہ رقم شعبہ کے سالانہ بجٹ میں موجود نہیں ہے۔ البتہ ہم سب لوگ اپنے ذاتی روابط کے ذریعے یہ رقم بطور چندہ اکٹھی کریں گے۔ دیگر سہولیات میں مہمانوں کے لئے رہائش، کھانے کا انتظام اور مقابلے کے انعقاد کے لئے انواع و اقسام کی سہولیات کی بھی حامی بھر لی گئی۔ لگ بھگ بیس جامعات نے اس تقریب کے انعقاد کے لئے اپنی تجاویز اور دلچسپی کا اظہار کیا۔ ماہرین کے ایک بورڈ نے فیصلہ ہمارے حق میں کر دیا، جس سے معلوم ہوا کہ ماہرین بین الاقوامی قد و قامت و ساخت کے ہی ہوں گے۔ اگر مقامی ہوتے تو یقیناً ہمیں اس تقریب کے انعقاد کی اجازت دینے کی بجائے سہولیات بہتر کرنے کی تلقین کرتے اور شاید چندہ بھی دیتے۔ اس فیصلہ نے ہمیں مزید حوصلہ دیا اور ہم حضرت علامہ کے بے تیغ سپاہی بن کر میدانِ کارزار میں اترنے لگے۔

اب اس بین الاقوامی مقابلے کے انعقاد کے لئے منصوبہ بندی شروع ہو گئی۔ ہر نشست میں شرکاء نئے، اچھوتے اور بالکل ناممکن العمل آئیڈیاز کی بھرمار کر دیتے۔ صرف بھرمار ہی نہیں، بلکہ اُن پر اصرار بھی کرتے۔ ایک شریک گفتگو نے موسیقی کا آئٹم نہ شامل کرنے کی صورت میں بائیکاٹ کرنے کا نعرہ لگایا تو ایک دوسرے نے کھلونا نما چھوٹے جہازوں اور ہیلی کاپٹروں کی پروازوں کی تجویز دی اور ایسا نہ کرنے کی صورت میں بین الاقوامی ماہرین کے بورڈ کو دستیاب سہولیات سے آگاہ کرنے کی دھمکی بھی دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مقابلے کی تقریب کا کینوس اس قدر وسیع ہو گیا کہ اسکی ابتدا و انتہا اپنی ہی وسعت و گہرائی میں گم ہو گئیں۔ مقابلے کے لئے تکنیکی، فنی، سماجی اور دیگر ہر قسم کے

116 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

موضوعات کے پوسٹر، پراجیکٹ، پریزٹیشن کا انتخاب کیا گیا۔ چھوٹے طیارے اور ہیلی کاپٹر بنانے اور اڑانے کو بھی مقابلے کا حصہ بنایا گیا۔ شرکاء اور منتظمین کے جسم و جاں کے رشتے کو برقرار رکھنے کے لئے طعام اور روح کی سیرابی کے لئے موسیقی کو بھی شامل کر لیا گیا۔

منصوبہ بندی ختم ہوئی اور عملی اقدامات کا مرحلہ شروع ہو گیا۔ ہر کام کے لئے پیسوں کی ضرورت تھی۔ فراہمی وسائل کے لئے طلباء اور اساتذہ مطمئن تھے کہ اُن کے خیال میں یہ واحد اور حقیر کام ہمارے ذمے تھا۔ ہم نے چونکہ شروع سے ہی سوچ رکھا تھا کہ پیسوں کا انتظام مختلف اسپانسرز سے کریں گے۔ تو ہم نے اپنے احباب سے رابطے شروع کر دیے۔ ہر دوست نے فون، ای میل کا بڑا پُر جوش جواب دیا۔ بہت عرصہ سے رابطہ میں نہ رہنے کا گلہ کیا۔ اسٹوڈنٹس، جامعہ، تعلیم، کردار سازی، پروفیشن، وطن، دنیا حتیٰ کہ کائنات کی فلاح کے لئے اس تقریب کے انعقاد کو عین وقت کی ضرورت قرار دیا۔ اور قریباً سب نے ہی وعدہ کر لیا ہفتے عشرے میں پیسے بھجوا دیے جائیں گے۔ ہم نے مختلف انتظامات کے لئے ہدایات دے دیں کہ ضروری اشیاء کی خریداری شروع کر دی جائے، پیسوں کی ادائیگی دو ہفتوں بعد ہو جائے گی۔ دو ہفتوں بعد کیوں۔ ہمارے نائب کے منصبِ جلیلہ پر فائز بے تکلف دوست ہاشمی نے استفسار کیا۔۔۔ اس لئے کہ زیادہ سے زیادہ دس دنوں میں اسپانسرز پیسے بھجوا دیں گے۔ اور تم تو اچھی طرح جانتے ہو کہ ہماری طبیعت میں احتیاط کی حدیں وہم سے ملتی ہیں۔ اس لئے دو ہفتوں کا وعدہ کر رہے ہیں۔ اور ہاں یاد آیا۔ کوئی گھٹیا چیز نہ خریدنا اور تمام رسیدیں جمع رکھنا۔ کوئی خریداری رسید کے بغیر نہیں ہوگی۔ ہم نے ہاشمی کو ہدایت کی۔ مالی معاملات میں شفافیت صرف سرکاری ضرورت ہی نہیں بلکہ ہمارے مزاج کا جزو لا ینفک ہے۔۔۔ ہاشمی زیر لب مسکرایا۔ جس پر ہمیں تاؤ آ گیا۔ قدرے سنبھل کر پوچھا۔ ہنس کیوں رہے ہو۔ کہنے لگا۔ شفافیت ہونے نہ ہونے کا سوال تو تب ہوگا جب پیسے آپ کے پاس ہوں

Contact for Thesis Composing and Final Setting | 0303-761-96-93

118 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

ہوگا۔ اس مقابلے کو چار سالوں کے لئے ملتوی کر دو۔ اگر تم چاہو تو میں چار سالوں بعد تمہارے اس مقابلے کے لئے پیسوں کی فراہمی کا وعدہ خط تمہیں بھیج دیتا ہوں۔۔۔ اب ہمیں یہ مشورہ کچھ مناسب ہی لگنے لگا۔ قریباً ایک مہینے کی بھاگ دوڑ کے بعد ہم اس مشورے کی اصابت کے قائل ہو چکے تھے۔ ہم نے ہاشمی اور دوسرے منتظمین کو بلا کر مقابلے کی تیاریوں کے بارے میں پوچھا۔ کہ شاید بلا ٹلنے کی کوئی سبیل تائید غیبی سے برآمد ہو جائے۔۔۔ تیاریاں آخری مراحل میں ہیں، مقابلے کے لئے خریداری مکمل ہو چکی ہے۔ اب شاید ہی کسی چیز کی خریداری کے لئے بازار جانا پڑے۔ آپ کی ہدایات کے عین مطابق ایک ایک چیز کی خریداری کی رسید موجود ہے۔۔۔ ہاشمی نے کارگزاری پیش کر دی۔ مگر پیسے کہاں سے لئے تم نے، ہم نے ذرا سنبھلتے ہوئے پوچھا۔۔۔ پیسے تو آپ نے ابھی دیے ہی نہیں ہیں۔ میں نے اپنے اور دیگر تمام منتظمین کے جس قدر جاننے والے پورے شہر میں مال بیچتے ہیں۔ سب سے ادھار لے لیا ہے۔ پیسوں کا تقاضا تو سب کرتے رہے لیکن میں نے بھی تہیہ کر لیا تھا کہ اس مرتبہ آپ کے گھسی پٹی سرکاری باتوں اور خط و کتابت کے طعنے کو دھو ڈالتا ہوں۔ آپ فکر نہ کریں۔ اگر مزید چیزیں بھی ادھار چاہیے ہوں گی تو بندوبست کر دوں گا۔ دس فیصد ادائیگی زائد کرنا ہوگی، ادھار پر خریدنے کی وجہ سے۔ لیکن کوئی بات نہیں۔ آپ کے بڑی بڑی کمپنیوں کے افسروں سے قریبی تعلقات ہیں۔ آپ کے لئے دس فیصد زائد ادا کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اصل بات مقابلے کا انعقاد ہے۔ ویسے بھی آپ کے مزاج کے مطابق چیزیں مہنگی خریدی ہیں تاکہ معیار پر کوئی مسئلہ نہ ہو۔۔۔ ویسے پیسے کب تک آجائیں گے، ادائیگی کرنا ہے۔ کوئی حتمی تاریخ بتا دیں۔۔۔ ہاشمی کا جواب سن کر کہا، ایک گلاس دینا پانی کا۔۔۔ پینے کے بعد بولے، جلد ہی۔۔۔ جی سر، وہ تو ٹھیک ہے پر دکانداروں کو تاریخ کیا دوں۔۔۔ جو نہی پیسے موصول ہوئے، ادائیگی ہو جائے گی۔ ہم نے خفگی سے کہا۔ اور ہاں کوئی کام دھندا بھی کیا کرو۔ سارا دن گپ لگاتے رہتے ہو۔ جاو جا کر

دیکھو تمام کلاسیں شیڈول کے مطابق ہو رہی ہیں۔۔۔ کلاسوں کا تو خیر کیا ہونا ہے۔ سب لوگ اپنے اپنے انداز میں مقابلے کی تیاری کر رہے ہیں، تیاریوں کا بھی ہر ایک کا اپنا ہی انداز ہے اور شیڈول بھی۔ ہاشمی بولا۔۔ اور یاد آیا جس دن سے یہ تیاریاں شروع ہوئی ہیں۔ سارے ڈے سکالرز طلباء و طالبات ہاسٹل میں ہی شفٹ ہو چکے ہیں۔ اُن کے میس اور کنٹین کا بل بھی مقابلے کے اخراجات میں شامل کر دیا ہے۔ اُن کی دیکھا دیکھی ہاسٹل والے سٹوڈنٹس بھی مطالبہ کر رہے ہیں کہ اُن کا بل بھی ہم ہی ادا کریں کیونکہ وہ بھی دن رات مقابلے کی تیاریوں میں ہی مشغول ہیں۔ ویسے ان کو گھر گئے ہوئے بھی ہفتے گزر گئے ہیں۔ لیکن خیر ان کے گھر والے گا ہے بگا ہے ان سے ملنے یہیں آ جاتے ہیں۔ اُن کا بل تو صاف ظاہر ہے ہمیں ہی دینا ہے، مہمانوں سے تو پیسے نہیں لئے جا سکتے۔۔۔ ویسے میں جا کر دیکھتا ہوں کلاسیں شیڈول کے مطابق ہو رہی ہیں کہ نہیں۔ یہ کہہ کر ہاشمی ہمیں دیکھے بغیر دفتر سے باہر نکل گیا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ہمیں اپنے منصوبے اور منعقد ہونے والے مقابلے کے بارے میں ایسی معلومات ملیں جن کے بارے میں ہمارے فرشتوں نے بھی سوچا نہ ہوگا۔ ملک کے کونے کونے سے برقی خط، پیغامات اور فون موصول ہونا شروع ہوئے تو ہمیں اندازہ ہوا کہ ہمارے طلباء و طالبات نے یہ خبر کہاں تک پہنچا دی ہے۔ گلگت والے آنے کو تیار بیٹھے ہیں تو روہڑی والے پوچھ رہے ہیں کہ اُن کا قیام کہاں ہوگا۔ بنوں والے مینارِ پاکستان دیکھنا چاہتے ہیں اور ژوب والے الحمرا تھیٹر میں رقص دیکھنے کی تیاری کئے ہوئے ہیں۔ مردان والے لبرٹی مارکیٹ اور خیر پور ٹامیوالی والے فورٹریس بھی جائیں گے۔ ہم ابھی ان حالات سے نبٹنے کے لئے اپنے آپ کو تیار کر ہی رہے تھے کہ پولیس آدھمکی۔ معلوم ہوا کہ بھوپال انڈیا کے طلباء و طالبات نے دہلی میں پاکستانی سفارت خانے سے ویزہ مانگ لیا ہے ہمارے اس مقابلے میں شرکت کے لئے۔۔۔ مگر انہیں کیسے پتہ چلا کہ یہاں یہ مقابلہ ہو رہا ہے۔ ہم نے چھوٹے تھانیدار سے

120 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

مذہبانہ سوال کیا۔ تو اُس نے ایک فائل ہمیں تھما دی کہ اس میں تمام تفصیلات موجود ہیں۔ تو پتہ چلا کہ ہماری پیشہ ورانہ بین الاقوامی تنظیم نے اس مقابلے کی تشہیر اپنی ویب سائٹ پر کی تو انڈیا کے طلباء نے اُن سے رابطہ کیا اور اُن سے ہی دعوتی خط منگوا لیا جس کے توسط سے ویزہ کے لئے درخواست دے ڈالی۔۔۔ اب ہمیں معاملے کی سنگینی کا احساس ہوا۔ پولیس کا اصرار کہ ہم اس مقابلے کی تمام تفصیلات انہیں دیں کیونکہ انہوں نے انڈیا کے طلباء و طالبات کے ویزے کے لئے کلیئرنس دینا تھی۔۔۔ تفصیلی پروگرام ہاشمی نے بنایا تھا۔ اُس نے ایک نقل پولیس کو بھی دے دی۔ پروگرام میں ہمارے طلباء نے چھوٹے کھلونا نما جہاز اور ہیلی کاپٹر اڑانے کا ایک مقابلہ بھی رکھا ہوا تھا۔ پولیس والے اب تفتیش پر اتر آئے۔۔۔ تو یہ چھوٹے جہاز اور ہیلی کاپٹر ہندوستانی سٹوڈنٹس بھی لائیں گے، پہلا گولہ داغا گیا۔۔۔ معلوم نہیں، ہو بھی سکتا ہے۔ ہم نے بے اعتنائی سے کہا۔۔۔ ہوں، ہوں۔۔۔ ہو نہیں سکتا، یقیناً یہی ہو گا۔ تو وہ چھوٹے جہازوں اور ہیلی کاپٹروں سے لاہور اور گردونواح کی تصاویر بھی لیں گے۔۔۔ علم نہیں وہ مقابلے کے اس حصے میں شرکت کریں گے یا دوسرے مقابلوں جیسے مشینوں کے نمونے اور پوسٹر وغیرہ تک ہی محدود رہیں گے۔۔۔ اچھا۔ مشینیں بھی ہیں۔۔۔ نہیں نہیں، پتہ نہیں انہوں نے اپنی مشینیں لانا بھی ہے کہ نہیں۔۔۔ تو آپ کے طلباء و طالبات مقابلے میں ہوں گے۔ چھوٹے تھانیدار کے عقب میں بیٹھے سپاہی نے پوچھا۔۔۔ صاف ظاہر ہے۔ وہ تو ہوں گے۔۔۔ اور اُن کی مشینیں، پوسٹر، ہوائی جہاز، ہیلی کاپٹر بھی ہوں گے۔۔۔ بالکل۔۔۔ اس کا مطلب ہے کہ ہماری ٹیکنالوجی بھی ہندوستانی چوری کریں گے اور علاقے کی تصویریں بھی لیں گے ہوائی جہازوں سے۔۔۔ اب ہم سے رہا نہ گیا۔۔۔ یہ سٹوڈنٹس کی بنائی ہوئی اشیاء ہیں، ان میں کیا ٹیکنالوجی ہے۔۔۔ اور علاقے کی تصویریں تو اب سٹیلائٹ کی مدد سے ہندوستان بیٹھے ہی لی جاسکتی ہیں۔ اُس کے لئے اب یہاں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم نے وضاحت کی۔۔۔ چلو ٹھیک ہے۔

121 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

آپ شام سات بجے تھانے آجائیں، تھانیدار صاحب خود بات کریں گے آپ سے۔۔۔ اور اگر شام کو آپ مصروف ہو گئے تو عشاء اور تہجد کے عین درمیانی وقت میں ہماری موبائل گاڑی آپ کو لے آئے گی۔ ڈرائیور کو آپ کے گھر کا پتہ ہے۔ کل ناشتہ اکٹھے ہی ہوگا۔۔۔ اللہ حافظ۔

مقابلے میں دو دن رہ گئے تو ہاشمی نے علی الصبح بتلایا کہ آج سے بیرون لاہور سے مقابلے میں شرکت کرنے والے طلباء و طالبات پہنچنا شروع ہو جائیں گے۔ ہمارا کیمپس لاہور شہر سے باہر ہے اور یہاں پہنچنا دشوار ہے۔ اکثر اوقات یہاں آنے کے لئے کوئی عوامی سواری میسر نہیں ہوتی۔ لاری اڈے، ریلوے اسٹیشن وغیرہ سے انہیں یونیورسٹی لانا پڑے گا۔ اس لئے آپ یونیورسٹی سے گاڑیاں مختص کروالیں۔ ہم نے جامعہ کی انتظامیہ سے بات کی تو انہوں نے کہا کہ ہماری گاڑیوں کا پہلا مسئلہ یہ ہے کہ ان کی حالت اچھی نہیں ہے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ کے مہمانوں کے لئے یہ زحمت بن جائیں۔ دوسرا یہ کہ ہمارے پاس اپنے سٹوڈنٹس اور سٹاف کے روزمرہ کے معمولات کے لئے ہی گاڑیاں کم ہیں۔ آپ کو کہاں سے دے دیں۔۔۔ دوسرے جواز کے بعد تو بات چیت ہی ختم ہو گئی۔۔۔ ہمارا لٹکا ہوا منہ دیکھ کر ہاشمی بولا۔۔۔ سر، میں کچھ کر لیتا ہوں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔۔۔ تھوڑی دیر بعد آکر کہنے لگا، بندوبست ہو گیا ہے۔ سب ٹھیک ہے۔۔۔ کیا بندوبست کیا ہے ہاشمی۔ ہم منمائے۔۔۔ سر، یونیورسٹی کی گاڑیاں ہی جائیں گی، ہم ادائیگی کر دیں گے۔ ہاشمی نے باوقار انداز میں بتایا۔۔۔ ادائیگی کس چیز کی۔۔۔ سر! ہمیں تقریباً ایک ہفتے کے لئے چار پانچ گاڑیاں کل وقتی بنیادوں پر چاہیے ہیں۔ یونیورسٹی کو ادائیگی تو کرنا پڑے گی۔ اس کے بغیر گاڑیاں نہیں ملیں گے اور گاڑیوں کے بغیر مقابلہ نہیں ہو سکے گا۔۔۔ تو ادائیگی کہاں سے ہوگی۔ ہم نے انجان بنتے ہوئے سوال کیا۔۔۔ وہ تو سر آپ ہی کریں گے، جہاں باقی سارے کاموں کی ادائیگی آپ کریں گے، وہیں یہ بھی کر دیں۔ بل جو بھی ہوگا۔ آپ کے سامنے آجائے گا۔ زیادہ سے زیادہ

122 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

ڈیڑھ دو لاکھ روپے۔ ویسے سر آپ مزے میں ہیں۔ صرف پیسے فراہم کرنا ہے آپ کو، باقی ہر کام میں میری شامت آئی ہوئی ہے۔۔۔

شام کی چائے پی رہے تھے گھر کے لان میں بیٹھ کر، فیملی کے ساتھ ہلکی پھلکی گپ شپ بھی چل رہی تھی۔ موبائل فون کی گھنٹی بجی۔۔۔۔۔ جی۔۔۔ کیا تین گھنٹے ہو گئے انتظار کرتے ہوئے اور ڈرائیور نہیں پہنچا۔۔۔ اچھا میں پوچھتا ہوں اُس سے۔۔۔ ہاں۔ اسلم کدھر ہو تم، اٹک سے آئے ہوئے اٹھارہ سٹوڈنٹس بسوں کے اڈے پر پریشان کھڑے ہیں تین گھنٹوں سے۔ اور تم تو صبح سے ہی اُن کو لینے چلے گئے تھے۔۔۔ وہ، وہ سر میں ذرا شاد باغ آگیا تھا۔ میرے بچے ننھیال جانے کی ضد کر رہے تھے، بس ابھی نکل رہا ہوں۔۔۔ ابھی کیسے نکلو گے، تمہاری بس کہاں ہے، ہم نے اسلم کو ڈانٹنے کی اداکاری کی۔۔۔ سر میں بس میں ہی شاد باغ آیا ہوں۔ میرے بچوں کے ساتھ بہن، بھائیوں کے بچے مل گئے۔ انہوں نے محلے کے بچوں کو بھی ساتھ ملا لیا۔۔۔ کیا! یہ اتنے سارے بچے لے کر شاد باغ تم اپنے سسرال چلے گئے ہو، عجیب آدمی ہو۔۔۔ سر، وہ اصل میں میرے سسرال کے گھر کے ساتھ ہی بچوں کے پنگھوڑے لگے ہوئے ہیں۔ یہ سارے بچے جھولے لینے آئے ہیں۔۔۔ آپ فکر نہ کریں۔ دس منٹ میں لے لیتا ہوں مہمانوں کو۔ اوکے سر۔۔۔ تو ہم نے فکر نہ کرنے میں ہی عافیت جانی اور پرانے گانے سننے شروع کر دیے۔۔۔ شاعری، سُر، لے، موسیقیت ہے تو پرانے گانوں میں۔ آج کل کے گانے تو صرف شور ہیں۔ ہم نے جھومتے ہوئے خود کلامی کی۔۔۔ منزلِ کمالِ لطف جب دو گام ہی رہ گئی تو موبائل فون کی کریمہ الصوت آوازوں نے مزا غارت کر دیا۔۔۔ ناچار فون سننا ہی پڑا۔۔۔ سر! مشین والا ٹرک ٹھوکر نیاز بیگ پہنچ چکا ہے۔ راہنمائی کریں کہ مشین ٹرک سے کیسے اتاریں اور کس طرح آپ کے کیمپس پہنچیں۔ ایک نامانوس آواز آئی۔۔۔ بھائی، کونسی مشین، کونسا ٹرک۔ کہاں فون کیا ہے آپ نے۔ بغیر سوچے سمجھے بات کر رہے ہو۔ لگتا ہے کسی کارخانے والے سے بات کرنا چاہ رہے ہو۔ ہم نے بھڑاس

123 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

نکالی۔۔۔ جی۔ کیا آپ کسی کارخانے سے بات کر رہے ہیں۔۔۔ ہم نہیں، آپ غالباً کسی کارخانے کو کوئی مشین دینا چاہ رہے ہیں۔ غلطی سے ہمارا نمبر ڈائل ہو گیا ہے۔۔۔ سر! میں تو طالب علم ہوں۔ گوجرانوالے سے آیا ہوں۔ آپ کے یہاں جو طلباً و طالبات کا مقابلہ ہو رہا ہے۔ اُس میں شرکت کے لئے۔ میرے ساتھ میرے گیارہ ہم جماعت اور سات مشینوں کے مستری بھی ہیں۔ ہم نے مقابلے میں شرکت کے لئے اندراج کروا رکھا ہے۔ فیس بھی ادا کی ہوئی ہے۔۔۔ اچھا، وہ تم۔۔۔ وہ مقابلے کے لئے آئے ہو۔ پر یہ مشین کہاں سے آگئی ہے۔ اور یہ مستری کہاں سے آگئے بیچ میں۔ حواس پر قابو رکھتے ہوئے پوچھا۔۔۔ سر یہی تو ہے جو آپ کے مشینیں بنانے والے مقابلے کے لئے لائے ہیں۔ اور سر، مشینیں مستری کے بغیر تو نہیں چل سکتیں۔ آپ تو طالب علموں سے بہت بہتر سمجھتے ہیں۔۔۔ ہیں۔ یہ کونسی مشین ہے۔ ہم نے ہمت کر کے پوچھا۔۔۔ سر! یہ اصل میں چارہ کاٹنے والی مشین کو ہم پچھلے تین سالوں سے بہتر بنا رہے ہیں۔ یہ عام مشینوں سے دس گنا زیادہ چارہ کاٹ سکتی ہے۔ لیکن اس کو چلانے کے لئے کم از کم سات مرد چاہیے، عورتوں ہوں تو پھر گیارہ۔ وزن اس کا ہے ساڑھے پانچ سو کلوگرام۔ لمبائی اٹھارہ فٹ، چوڑائی تیرہ فٹ اور اونچائی اکتیس فٹ ہے۔ آپ کے مقابلے میں شرکت کا جو دعوت نامہ آیا تھا ہمارے کالج میں۔ اُس میں لکھا تھا کہ مشینیں جو مقابلے کے لئے انعام کی حقدار ہوگی اُن کے لئے شرط ہے کہ بالکل اچھوتی اور نئی ہوں۔ اور معاشرے کے لئے اُن کی افادیت بھی ہو۔ ہمارے ملک کی دو تہائی سے زائد آبادی آج بھی گاؤں میں رہتی ہے جہاں جانوروں کے لئے چارے کا بندوبست سب سے بڑا مسئلہ ہوتا ہے۔ ہم نے اس مشین کی ایجاد کے ذریعے آبادی کی اکثریت کا مسئلہ حل کر دیا ہے۔ ہم واہنڈو گاؤں، ایمن آباد ضلع گوجرانوالا کے رہائشی طلبانے دن رات کام کیا ہے اس پراجیکٹ پر۔ لیکن سارے کام ہم اکیلے تو نہیں کر سکتے تھے۔ میرے بڑے بھائی کے سالے کی ورکشاپ ہے۔ انہوں نے ہماری مدد کی ہے اس کو

124 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

بنانے میں، چلاتے بھی ابھی مستری ہی ہیں۔ لیکن آئیڈیا زیادہ میرا اور کم، کم میرے یاروں کا ہے جو میرے ساتھ آئے ہیں۔ آپ خوش ہو جائیں گی اس کمال کی مشین ایجاد کی ہے ہم نے۔ وہ وقت ماضی ہوا، جب ایجادات یورپ، امریکہ، جاپان میں ہوتی تھیں۔ اب یہاں ہوں گی، ہمارے گاؤں واہنڈو، ایمن آباد میں اور میرے بھائی کے سالے کی ورکشاپ میں۔۔۔ تو بتائیں کیسے لائیں اس مشین کو آپ کی یونیورسٹی تک۔ کون سی گاڑی بھیجی ہے آپ نے اس کام کے لئے۔ سب سے بڑے سائز کا ٹرک چائیے اس کو ڈھونڈنے کے لئے۔۔۔ صاحبو! کچھ پتہ نہ چلا۔ آہ کہوں یا واہ۔ سنگ دے ماروں یا خشت۔ سر میں یا پشت پہ۔ مخاطب کو یا اپنے آپ کو۔

اہل و عیال نے رات کا کھانا ریستوران میں کھانے کا پروگرام بنایا ہوا تھا۔ لبنانی کھانوں کی لذت خوب تھی، لیکن مقدار کم۔ تو کھانا کھانے کے بعد طے یہ ہوا کہ کھانے کے لئے کسی ایسی جگہ جایا جائے جہاں شکم اور نیت دونوں بھر جائیں۔۔۔ تو بس اب صرف دیسی بلکہ لاہوری کھانا ہوگا۔ نہاری، مغز اور خمیری روٹیاں اور کولڈ ڈرنک کیونکہ دسترخوان پر زیادہ ڈشیں ہونا ہماری تہذیب میں اوچھا سمجھا جاتا ہے، اور ہاں سویٹ ڈش میں ہوگا سویوں والا قلفہ باداموں سمیت۔ پرانی انارکلی سے اور میٹھے پان بھی وہیں سے مل جائیں گے۔ کراچی سے تشریف لائے ہوئے ہماری بیگم کے چچا جان نے فیصلہ صادر کر دیا۔۔۔ چچا جان! زیادہ ڈشیں اوچھے پن کی علامت ہیں، ہم نے قدرے حیرانی سے پوچھا۔۔۔ بالکل، بالکل۔ ہماری تہذیب اور شرافت اس چیز کی اجازت نہیں دیتی کہ بیسیوں کھانے بیک وقت سجالے جائیں۔ اور یہ بھی کہ متعدد کھانے اس لئے بھی سجائے جاتے ہیں کہ مہمان بھوکے رہ جائیں۔ اسی شش و پنج میں کہ جو میں نہیں کھا رہا کہیں وہ زیادہ مزے کا تو نہیں۔ اب صرف نہاری کھاؤ اور خوب جی بھر کر۔ دوسری ڈش ہو اور نہ دھیان کسی اور طرف ہو۔۔۔ صاحب ایسی مسکت سسرالی دلیل کا کیا کرتے۔ فوراً نہاری کھانے پہنچے۔ ابھی چار لقمے بھی نہیں لیے ہوں گے کہ فون کی گھنٹی بجنا

125 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

شروع ہو گئی۔ ناقابلِ شناخت نمبر سے کال آرہی تھی تو ہم نے نہاری پر ہی توجہ کئے رکھی۔ چند منٹوں بعد پھر کال آئی، اب فون ہاشمی کا تھا۔۔۔ جی ہاشمی کوئی اور بری خبر۔ ہم نے پریشانی سے کہا۔۔۔ نہیں، نہیں سر!۔ وہ دراصل ہمارے مقابلے میں آنے والی کچھ طالبات آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔ میں نے بہت کہا کہ بات بتائیں۔ لیکن کہتی ہیں کہ کسی باختیار آدمی سے بات کروائیں۔ میں نے کہا میں ہی باختیار ہوں۔ بتائیں کیا بات ہے۔ جواب میں ٹھٹھے پر اتر آئیں کہ آپ نے تو پہلی گھنٹی پر ہی فون اٹینڈ کر لیا ہے۔ آپ تو آفس بوائے یا حد سے حد جو نیر کلرک ہوں گے۔ آپ سے کیا بات کریں۔۔۔ آپ کے صدر شعبہ کو فون کر رہے ہیں لیکن وہ سن نہیں رہے۔ اُن سے بات کروا دیں۔۔۔ سر! آپ کے بین الاقوامی مقابلے کا معاملہ تھا۔ میں چپ ہو گیا۔ وہ دوبارہ فون کریں گے آپ کو سر!۔ پلیز اُن کی بات سن لیں اور ویسے بھی سٹوڈنٹ اگر لڑکی ہو تو ڈیپارٹمنٹ میں بھی آپ خود ہی بات کرنا پسند کرتے ہیں۔ اور میری ڈیوٹی تو آپ نے وہاں بھی چوکیداروں اور خا کروبوں سے نبٹنے کی لگائی ہوتی ہے۔ تو مجھے تو تجربہ بھی کم ہی ہے صنفِ نازک سے بات کرنے کا۔ ہاشمی کی اس بے وقت برجستگی و بے تکلفی کو بھی کڑوا گھونٹ سمجھ کر برداشت کیا۔۔۔۔ فون کی گھنٹی بجنا شروع ہوئی۔ رسان سے ہیلو کہا۔ چچا جان کے سامنے ہم خوش مزاجی و خوش کلامی کا بھرم رکھنا چاہتے تھے۔ اور مخاطب کے سامنے بھی۔۔۔ ہماری دھیمی اور نیم سریلی ہیلو ہماری اہلیہ اور خواہرانِ نسبتی کے کانوں میں پڑی تو ایک قہقہہ بلند ہوا۔ منجھلی کی تو پلیٹ ہی الٹ گئی۔ اہلیہ کہنے لگی اور وہ بھی چچا کو ہی مخاطب ہو کر۔۔۔ ہم پورے دن کے بعد ایک فون کر لیں تو چھوٹے ہی کہتے ہیں۔۔۔ کوئی شخص اپنی بیوی کے ہوتے ہوئے کام کر ہی نہیں سکتا، جو بات ہے جلدی بتا ورنہ بعد میں بات کرتے ہیں۔ اور یہاں دیکھو کیسے انداز بنا کر کہتے ہیں۔ ہیلو۔۔۔ ایک اور قہقہہ۔۔۔ خیر پھر بھی ہم نے توازن قائم رکھتے ہوئے فون پر بات شروع کر دی۔۔۔ جی فرمائیں۔۔۔ جواباً نہایت کھردری آواز میں ہمارا نام ایسے کسی نے لیا جیسے

126 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

ہمارے دادا جان بلایا کرتے تھے۔۔۔ پھر بھی ہم نے کہا، جی۔۔۔ ہم لوگ یہاں ہیں،
 آواز آئی۔۔۔ ہم نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔۔۔ ہاشمی صاحب سے آپ نے کہا تھا
 بات کروانے کے لئے۔۔۔ ہاں۔۔۔ ہاں کے ساتھ 'جی' کے لاحقے کا شائبہ تک نہ
 تھا۔۔۔ مگر وہ تو کوئی لڑکی بات کر رہی تھی۔ اب ہم سے نہ رہا گیا۔۔۔ ساتھ ہی نہاری
 میں غرق سارے دھیان ہماری طرف متوجہ ہو گئے۔۔۔ لڑکی نہیں، وہ تو سارنگ تھا۔
 اُس کی آواز زنا نہ ہے۔ فون پر جواب ملا۔۔۔ سمو سے بیچنے والے نے چٹنی کم دی تھی،
 اُس سے دوبارہ مانگنے گیا ہے۔ ابھی آجاتا ہے۔۔۔ وہ سر! ہم آپ کے مقابلے میں
 حصہ لینے کے لئے سانگھڑ سے آئے ہیں۔ اور یہاں ہیں۔۔۔ یہاں کہاں؟۔۔۔ سر پتہ
 نہیں کہاں ہیں۔ بجلی بند ہے۔ دکھائی بھی کچھ نہیں دے رہا۔۔۔ سارنگ پوچھ کر آیا تھا۔
 کسی نے عجیب سا نام بتایا ہے۔ اس جگہ کا۔۔۔ کہتا ہے کہ اس اسٹیشن کا نام ہے پکا انا
 ۔۔۔ ہیں، پکا انا۔ یہ کہاں ہے لاہور میں۔۔۔ پتہ نہیں سر۔ پوچھ کر بتاتا ہوں۔۔۔ یہ
 لاہور میں، لاہور میں ٹوبہ ٹیک سنگھ کے پاس ہے۔ ہم اس وقت ریلوے اسٹیشن کے
 پلیٹ فارم پر کھڑے ہیں۔۔۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ، لاحول ولاقوۃ۔۔۔ وہ۔ وہ۔ وہاں کیا کر
 رہے ہو۔۔۔ سر! ہم سانگھڑ سے سکھر آئے تھے پرسوں۔ وہاں دریا کی مچھلی ایسی ملتی
 ہے کہ پورے سندھ میں نہیں ہے ایسی۔ دو دن مچھلی کھاتے رہے۔ سندھ کی مچھلی کا دنیا
 کیا جنت میں بھی جواب نہیں ہوگا۔ اور پنجاب والوں کو تو گائے اور بھینس کے فرق کا پتہ
 نہیں ہوتا۔ مچھلی کا تو انہوں نے نام بھی نہیں سنا ہوتا۔۔۔ وہاں سے ٹرین میں سوار
 ہو گئے۔ خانیوال آگیا۔ ہمارے کالج کے سر نے بتایا تھا۔ خانیوال سب سے بڑا اسٹیشن
 ہے۔ وہاں ٹرین کافی دیر رکتی ہے۔ اسٹیشن کا کھانا اچھا نہیں ہوتا، سر نے کہا تھا۔ ہم
 سب دوستوں نے پہلے سے ہی پروگرام بنایا ہوا تھا۔ ہم کھانا کھانے اسٹیشن سے باہر
 چلے گئے۔ جلدی جلدی کھانا کھایا۔ پھر بھی ڈیڑھ گھنٹا لگ گیا۔ جلدی میں مزہ بھی نہ
 آیا۔ بھاگ کر واپس پہنچے تو دیکھا، ٹرین جا چکی تھی۔ عجیب لوگ ہیں ریلوے والے۔

127 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

جاتے ہوئے ہم گاڑ کو بتا کر بھی گئے تھے کہ کھانا کھا کر آرہے ہیں۔ اُس نے انتظار ہی نہیں کیا۔ ویسے آٹھ آٹھ دن ٹرین نہیں پہنچتی۔ آج اُسے بھی جلدی تھی۔ سامان ہمارا اُسی ٹرین میں ہے۔ بائیس لوگوں کے بستر بند اور ٹرنک۔ مہینہ لاہور میں رہنا ہو تو سامان کے بغیر پردیس میں کیسے گزارا ہو سکتا ہے۔ وہ ذرا لاہور ریلوے اسٹیشن سے لے لیں۔ کسی آدمی کو بھیج دیں۔ تانگے ریڑھے پر رکھ کر لے آئے گا۔ لاہور میں تو آپ ہر کام کر سکتے ہیں۔ سندھ میں کام ہو تو ہمیں بتانا۔ چاہے ڈاکوؤں سے لوٹ کا سامان واپس لینا ہو، وہ بھی لے لیں گے۔۔۔ اگلی ٹرین مال گاڑی تھی۔ اُس میں ہم سارے دوست سوار ہو گئے۔۔۔ ابھی کسی نے بتایا ہے کہ یہ مال گاڑی کا روٹ مسافر گاڑی سے مختلف ہے۔ لاہور کے پاس ہی ہوں گے۔ پکا انا پہنچ گئے ہیں۔ یہاں اسٹیشن سے تین چار میل پیچھے مال گاڑی کا انجن فیل ہو گیا تھا۔ ہم لوگ پیدل پڑی کے ساتھ چل کر اسٹیشن پہنچ گئے ہیں۔ ہم نے تو سنا تھا پنجاب میں بہت ترقی ہوئی ہے، یہ تو ہمارے سانگھڑ سے بھی گیا گزرا لگ رہا ہے۔۔۔ آپ یہاں سے ہمیں لے لیں۔ بائیس لڑکے ہیں۔ یونیورسٹی کی بس بھیج دیں۔ اور اتنی دیر میں ہمارا سامان بھی ہمارے رہنے کی جگہ پہنچا دیں۔ کھانے میں چاول مرغی کے ساتھ راستہ کافی ہے۔ مچھلی تو یہاں ملے گی نہیں۔۔۔۔

اگلے روز یونیورسٹی سب سے پہلے ہم ہی پہنچے تاکہ مقابلے کے انتظامات کا حتمی جائزہ لے سکیں۔ لیکن ہاشمی ہم سے بھی پہلے پہنچا ہوا تھا۔ سلام، دعا کے بعد کہنے لگا۔ سر! وہ رات گئے میں نے آپ کو تنگ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ انڈونیشیا سے چھ طلباء، تین طالبات، دو اساتذہ اور ایک آدمی سٹاف کا رات پچھلے پہر فلائیٹ کے ذریعے پہنچے تھے۔ اچھا ہوا، ہمارے مقابلے کے بین الاقوامی ہونے کا بھرم رہ جائے گا۔ انڈیا والوں کو تو ویزے ہی نہیں مل سکے تھے۔ اطلاع تو مجھے پہلے سے تھی ان کے آنے کی۔ مصروفیت میں آپ کو بتانا بھول گیا تھا۔ اُن کو میں نے فورسٹار ہوٹل میں آپ کے نام کی بکنگ کروا کر ٹھہرا دیا ہے۔ فائوسٹار تو مہنگا ہے، ہم افورڈ نہیں کر سکتے۔ اُن کے کھانے کا

128 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

بندوبست بھی وہیں ہے۔ آج وہ ادھر ہی رہیں گے، ہوٹل والے انہیں لاہور کی سیر بھی کروادیں گے۔ بل آپ کو آج مل جائے گا۔ بڑی مشکل سے مانے ہیں بغیر ایڈوانس کے، وہ بھی اس لئے کہ ہوٹل کا چیف شیف میرا محلے دار ہے۔ اُس نے ضمانت دی تھی۔ سر آپ کی اور میری عزت کوئی دو تھوڑی ہیں۔۔۔ یہ سنتے ہی قلم رک گیا، قلم کیا یوں لگا قلب ہی رک گیا ہو۔ لگ بھگ پانچ منٹ ہاشمی کو گھورتے رہے۔ جو کپ سے چائے پرچ میں انڈیل کر 'سڑکے' لگا رہا تھا۔۔۔ پھر اٹھے اور دفتر سے نکل کر اپنے شعبے کے پچھواڑے میں گئے جہاں پتھر بکھرے ہوئے تھے۔۔۔ ہاشمی بھی پیچھے پیچھے آگیا۔۔۔ سر! یہاں کیا ڈھونڈ رہے ہیں۔۔۔ پتھر، ہم نے کر خنگی سے کہا۔۔۔ پتھر تو آپ کے پاس ہی پڑے ہیں۔۔۔ ہاشمی نے پندرہ بیس قدم دور سے کہا۔۔۔ نہیں۔ یہ نہیں۔ تیز نوکیلے پتھر چاہیے۔ انتہائی نوکیلے۔ جو تمہاری ایک کنپٹی پر لگے تو دوسری سے نکل جائے۔

مہان نوازی مشرق کی روایت ہے۔ جو طلباء و طالبات دوسروں شہروں سے پہنچے۔ اُن کو ہمارے ہاسٹل میں ٹھہرایا گیا۔ ہمارے طلباء نے ہاسٹل کے کامن روم میں اونگھتے ہوئے رات گزاری۔ تاش کھیلی۔ تاش کے ساتھ سگریٹ۔ سگریٹ کے ساتھ سُرلے سے آزاد گانا اور اُس کے ساتھ دھمال کا بھی چلن رہا۔ مقامی طلباء نے کنٹین والوں کو ایثار پر اکسایا اور مہانوں کو آدھی قیمت پر کھانا دینے پر آمادہ بھی کر لیا۔ پختون طلباء کے ایک گروپ نے رات کو کھانا کھانے کے بعد قیمت پوچھی تو مقامی طلباء سے آدھی بتائی گئی۔ ابھی وہ رقم ادا کرنے ہی لگے تھے کہ ساتھ بیٹھے ایک اور گروپ میں سے کسی نے ویٹر سے کہہ دیا۔ مرغی ٹھنڈی ہے۔ پختون طلبا طیش میں آگئے۔ کنٹین کے عملے کو زد و کوب کرنا شروع کر دیا اور کھانے کے دیگے بھی الٹ دیے۔ بیچ بچا و کروانے کے بعد معلوم ہوا کہ کنٹین والوں نے انہیں مردہ مرغی کھلائی ہے جبھی تو وہ آدھی قیمت وصول کر رہے ہیں۔ مردہ مرغی کا سن کر کنٹین والے سکتے میں آگئے۔ انہوں نے صاف انکار کر

129 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

دیا کہ مرغی مردہ تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ زندہ مرغی انہوں نے اپنی موجودگی میں حلال کروائی ہے۔ مردہ کیسے ہوگئی۔۔۔ پختون طلباء میں سب سے جوشیلے نے کہا کہ ہمارے برابر بیٹھے ہوئے مقامی طالب علم نے ویٹر سے کہا تھا کہ مرغی ٹھنڈی ہے۔ تو ٹھنڈی تو مردہ کو ہی کہتے ہیں پشاور میں۔ جب اُس مقامی طالب علم سے پوچھا کہ اُس نے مرغی کو ٹھنڈا کیوں کہا تھا تو اُس نے جواب دیا کہ مرغی کا سالن ٹھنڈا تھا۔ میں تو ویٹر سے کہہ رہا تھا کہ سالن گرم کروادیں۔۔۔

پچھلی رات کا وقت ہوگا کہ تھانے پہنچنے کی اطلاع ملی۔ معلوم ہوا کہ تیس چالیس طلبا کو بادشاہی مسجد کے عقبی محلہ سے آوارہ گردی کے الزام میں دھریا گیا ہے۔ بھاگم بھاگ وہاں پہنچے تو طلبا کے ساتھ ساتھ ہمارے نام بھی ایف آئی آر درج ہو چکی تھی۔ اپنا نام دیکھ کر بھونچکے رہ گئے۔ ہم نے کیا کیا ہے۔ استفسار کیا۔۔۔ آپ نے آوارہ گردی کرنے میں معاونت کی ہے۔۔۔ وہ کیسے۔۔۔ بس فراہم کی ہے اور غضب خدا کا کیسے استاد ہیں آپ، کہ پورے پاکستان سے رنگ برنگے طلبا اکٹھے کر کے، بس پر سوار کروا کے رات کو شاہی محلے پہنچا دیے۔ آپ پر تو زیادہ دفعات لگنی چاہیں۔۔۔ بس پر کس نے سوار کروائے۔ اور یہ سب یہاں پہنچے کیسے؟ ہم نے ڈرائیور کو ڈانٹا۔۔۔ سر! اسٹوڈنٹس نے مجھے کہا کہ بادشاہی مسجد میں نوافل پڑھنے ہیں۔ میں انہیں لے آیا، یہاں پولیس نے پکڑ لیا۔۔۔ کیا، تمہاری بس تو بادشاہی مسجد کی طرف گئی ہی نہیں۔ پچھلے چار گھنٹوں سے عقبی بازار میں کھڑی ہے اور تم اسٹوڈنٹس کے گائیڈ بن کر کوٹھے دکھا رہے ہو۔ تھانہ محرر نے ڈرائیور کی سرزنش کی۔۔۔ ہم نے ڈرائیور کو گھورا تو زمین کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔۔۔ سر، اسٹوڈنٹس کی ضد کے سامنے میں بے بس تھا۔۔۔ ہم نے اسٹوڈنٹس کو غصیلی نظروں سے دیکھا تو وہ جھینپ گئے۔۔۔ سر! ہمیں تو اس بازار کا علم ہی نہیں تھا۔ بادشاہی مسجد اور مینارِ پاکستان دکھانے کے بہانے ہمیں ڈرائیور ہی لے کر آیا اور راستے میں کہنے لگا اگر تم سب چندہ کر کے مجھے دو ہزار روپے دو تو میں تمہیں ایسی جگہ

130 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

دکھاؤں گا جو تم لوگوں نے فلموں میں بھی نہیں دیکھی ہوگی۔۔۔ کیا! ڈرائیور نے یہاں آنے کے تم سے پیسے بھی لیے ہیں۔۔۔ اب ہمارا پارہ بلند یوں کو چھونے لگا۔۔۔ سر! وہ تو میں نے ان سے اکٹھے کیے تھے کہ واپسی پر آئیں کریم کھلاؤں گا۔۔۔ بہت خوب۔ بڑی ہوشیاری دکھائی تم نے۔ تو کھلائی سب کو آئیں کریم۔۔۔ سر! وہ تو تھانے والوں نے تلاشی لیتے ہوئے نکال لئے تھے۔۔۔ دراصل یہ سٹوڈنٹس اور ڈرائیور بے خبر تھے، انہیں معلوم نہ تھا کہ یہاں کون کیا کرتا ہے، پولیس سمیت۔ ہم نے لجاجت بھرے لہجے میں تھانے دار سے درخواست کی۔ اور بمشکل سٹوڈنٹس کی کم عمری اور بے خبری کے سبب انہیں چھوڑنے پر آمادہ کیا، پانچ ہزار روپے نذر بھی کئے۔ اگر کم عمری کا بہانہ نہ ہوتا تو پچاس ہزار دینے پڑتے۔

مقابلے کا افتتاح ڈین آف فیکلٹی نے کرنا تھا۔ وقت مقررہ سے ایک گھنٹہ پہلے ہم نے فون پر انہیں یاد دہانی کروائی تو کہنے لگے میں طے شدہ وقت پر پہنچ جاؤں گا۔ افسر کی شان اور ماتحت کی نوکری دونوں اطمینان میں تھیں۔ ہم نے تازہ اخبار پڑھنا شروع کر دیا۔ خبریں، ادارے۔۔۔ سب کچھ معمول کے مطابق ہی ہے، ہم نے کوئی چٹپٹی خبر تلاش کرتے ہوئے زیر لب کہا ہی تھا کہ ہمارے دفتر کا دروازہ کھلا اور سامنے مقامی نمائندہ اسمبلی چوہدری اللہ رکھا صاحب کھڑے تھے۔۔۔ ہم نے کھڑے ہو کر استقبال کیا۔ چائے پیش کی۔ خیریت دریافت کی۔ مقامی اور ملکی حالات پر گفتگو کی۔ وہ سر ہلاتے اور ہم کھجاتے رہے کہ غرض آمد معلوم ہو سکے۔ اچانک گویا ہوئے۔ مجھے اجلاس میں شرکت کرنے جانا ہے۔ آپ اپنا کام جلدی کروالیں۔۔۔ ہم گڑبڑائے۔ کام! کونسا کام ہمارا!۔۔۔ یہی جو میلہ آپ کروا رہے ہیں، اس کا افتتاح۔۔۔ جی، افتتاح۔ وہ تو ہمارے ڈین کریں گے۔ ہم نے وضاحت کرنے کی کوشش کی۔۔۔ ڈین! وہ کس محکمے کے وزیر ہیں۔ چوہدری صاحب نے دے لہجے میں پوچھا۔۔۔ وزیر نہیں۔ وہ تو ہماری یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں اور ہمارے افسر ہیں۔۔۔ اچھا پروفیسر صاحب۔ اچھی بات

131 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

ہے۔ ان سے ملاقات ہو جائے گی۔ الیکشن سر پر ہیں۔ ان سے بھی درخواست کرنی ہے کہ اپنے شاگردوں سے ووٹ لے کر دیں۔ ان کا میرے ساتھ کھڑے ہونا بہتر ہوگا جب میں افتتاح کروں گا۔۔۔ وہ، وہ دراصل بات یہ ہے کہ میں ڈین صاحب کو کہہ چکا ہوں افتتاح کا اور وہ مقررہ وقت پر پہنچنے والے ہیں۔ اب کیسے ان کو کہہ دوں کہ وہ نہ آئیں۔ ہماری بے بسی سامنے آئی۔۔۔ وہ بالکل آئیں، ان کا یہاں ہونا تو بے حد ضروری ہے۔ افتتاح کی تصویر اخبارات میں چھپے گی تو میرے ساتھ معززین کا کھڑے ہونا ضروری ہے۔ چوہدری اللہ رکھا صاحب نے ہماری اصلاح کی۔۔۔ چوہدری صاحب! گزارش یہ ہے کہ قواعد کے مطابق یونیورسٹی سے باہر کا کوئی آدمی افتتاح نہیں کر سکتا۔ ہم نے اپنی مجبوری بتائی۔۔۔ جی میرے علم میں ہے، لیکن یونیورسٹی میرے حلقے میں ہے۔ اس لئے میں باہر کا آدمی نہیں ہوں۔ بلکہ یہ میری ذمہ داری ہے کہ یونیورسٹی کے معاملات کا خیال رکھوں۔ آپ نے میلہ کروایا ہے تو ہم نے اپنا حصہ ڈال دیا ہے۔ آپ کے شعبے کے عقبی میدان میں سرکس، موت کا کنواں، چڑیا گھر، عارضی تھیٹر، پنگھوڑے، جھولے، ڈھول بجانے والے سب پہنچ چکے ہیں۔ حلقے کے لوگوں کو اطلاع دے دی ہے۔ میلہ کامیاب ہوگا۔ آپ خوش ہو جائیں گے۔۔۔ تو ذرا جلدی کر لیں افتتاح کے بعد میں نے اسمبلی بھی پہنچنا ہے۔۔۔ چوہدری صاحب نے افتتاحی فیتہ کاٹا، دعا کی، اپنے حق میں نعرے لگوائے۔ اور اسمبلی روانہ ہونے سے پہلے اپنے معتمد خاص کو دھیرے سے ہدایت کی کہ سرکس یا دوسرے کھیل تماشے والوں سے ایک ہفتے کا جگہ کا کرایہ لے کر اسمبلی ہال پارکنگ پہنچو۔۔۔ افتتاح کے فوراً بعد ہمارے ڈین صاحب نے کھردرے لہجے میں ہمیں حکم دیا۔ کہ ہم اُن کے دفتر رپورٹ کریں۔۔۔ سر! کوئی خاص کام ہے۔۔۔ ہم نے بھی پوچھ ہی لیا۔۔۔ آؤ گے تو بتادیں گے تمہیں اور پوچھ بھی لیں گے تم سے۔۔۔

مقابلے میں طلباء و طالبات نے اپنے بنائے ہوئے پوسٹر آویزاں کر رکھے تھے۔

جنہیں دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ انہوں نے کتنی زیادہ محنت کی ہے اس کام پر۔ ایک سے ایک نیا آئیڈیا۔ کئی خیالات تو اسقدر منفرد اور مفید تھے کہ یورپ یا امریکہ میں ہوتے تو اُن پر باقاعدہ سائنسی تحقیق شروع کر دی جاتی۔ اس کے ساتھ ساتھ تفریحی پوسٹر بھی بالا کراہ مقابلے میں رکھنے پڑے۔ اس مقابلے میں کسی پوسٹر کو اول، دوم یا سوئم قرار دینا نہایت مشکل تھا۔ بڑی جانفشانی سے منصفین نے فیصلہ کیا کہ فلاں فلاں پوسٹر انعام کے حقدار ہیں۔ لیکن حیدر آباد سے شریک ٹیم اور اُن کے استاد بگڑ گئے کہ اول انعام تو اُن کا حق ہے۔ ہم نے اُن کے سامنے ساری تفصیل رکھی کہ کس بنیاد پر یہ فیصلہ کیا گیا ہے۔ وہ پڑتال کے طریقہ کار پر تو سوال نہ اٹھا سکے لیکن اول انعام کے دعوے سے ایک انچ پیچھے نہیں ہٹ رہے تھے۔۔۔ ہم نے حیدر آبادی ٹیم کے استاد کو علیحدگی میں سمجھانے کی کوشش کی تو کہنے لگے اس مقابلے کی شیلڈ جسے چاہیں دیں لیکن دس ہزار کی انعامی رقم تو ہمیں دلائیں۔۔۔ وہ میرے بس میں نہیں کیونکہ انعامی رقم کسی کمپنی نے فراہم کی ہے، وہ جس پوسٹر کو چاہیں دے دیں گے۔ ہم نے صورتِ حال واضح کی۔۔۔ استاد محترم بولے، پھر مجھے یہیں نوکری دلوادیں کیونکہ حیدر آباد تو صرف اسی صورت جا سکتا ہوں کہ زوجہ کی فرمائش کے مطابق لاہور لبرٹی مارکیٹ سے سوٹ خریدوں۔ دس ہزار آپ دے دیں تو گھر جانا ممکن ہے۔۔۔ اتنے میں ہاشمی کی آواز آئی سر! آپ ادھر کھڑے خوش گپیاں کر رہے ہیں۔ وہاں پوسٹر کے مقابلے میں ہمارے طلباء نے منصفین کے فیصلے کو ماننے سے انکار کر دیا ہے۔ وہ ایک عام سے پوسٹر کو اول قرار دینے کا کہہ رہے ہیں۔۔۔ کیوں؟ ہم نے بات سمجھنے کی کوشش کی۔۔۔ سر! وہ جس پوسٹر کا کہہ رہے ہیں وہ تو صدیوں پرانے بھاپ سے چلنے والے انجن کا خاکہ پیش کر رہا ہے جو کسی بھی انجینئرنگ کی کتاب کے پہلے باب میں دیا ہوتا ہے۔۔۔ تو اصرار کیوں کر رہے ہیں اس پوسٹر پر وہ؟۔۔۔ سر! وہ دراصل پوسٹر ان طلباء کا بھی نہیں۔۔۔ ہیں، اُن کا نہیں تو کس کا ہے؟۔۔۔ وہ اُن کی ہم جماعت لڑکیوں کا ہے۔۔۔ پھر کیا ہوا۔ اُن کا ہے

133 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

یا اُن کی ہم جماعت لڑکیوں کا۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ہم نے اخلاقی اصولوں کا بھاشن دینے کی کوشش کی۔۔۔ سر! اصل میں آپ ہیں تو بوڑھے لیکن لگتے ادھیڑ عمر ہیں۔۔۔ جوان یا نوجوان ہوتے تو سمجھ سکتے کہ اول پوسٹر آتا ہے یا پوسٹر بنانے والا۔ ہاشمی نے ہمیں ہماری اوقات یاد کروادی۔۔۔ ہاں میاں! جو چاہے کہہ لو۔ لیکن انعام میرٹ پر ہی دیا جائیگا۔۔۔ سر! لیکن انعامی رقم دینے والی کمپنی نے تو پوسٹر منتخب بھی کر لیا ہے۔۔۔ ہیں! کونسا پوسٹر؟۔۔۔ وہ ایک بے ہودہ نیم عریاں بڑے سائز کی کسی ہیروئن کی تصویر ہے جو پشتو فلم کے لئے بنائی جا رہی تھی، ابھی مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ طلباء زبردستی اٹھا کر لے آئے۔ مکمل ہو جاتی تو شاید پیئٹر کو ترس آ جاتا اور دو برش پھیر کر ہیروئن کو پورے کپڑے ہی پہنا دیتا۔۔۔ اب ہم میں تابِ گفتگو نہ رہی۔۔۔ اچھا تو کمپنی اس کو کیوں منتخب کر رہی ہے۔ جب کہ ہمارے ساتھ طے یہ ہوا تھا کہ بہترین پوسٹر کا فیصلہ ہمارے منصفین کریں گے۔۔۔ سر! طے تو ہوا تھا مگر کمپنی کا مینجر کہہ رہا ہے کہ دس ہزار روپے دوں گا تو صرف اس پوسٹر کو۔۔۔ مینجر کو کیا مسئلہ ہے؟۔۔۔ سر! وہ مردان کا رہنے والا ہے۔ کہتا ہے کہ منصفین کو کیا پتہ فوٹو کیا ہوتا ہے۔ مردان یا بنوں کے ہوتے تو عقل ہوتی اُن میں۔۔۔

مختلف اقسام کی مشینوں کے اسٹال بڑے قرینے سے سجائے گئے۔ طرح طرح کی مشینیں اور اُن کے ساتھ بڑی بڑی سکریٹوں پر ان مشینوں کی معلوماتی فلمیں دکھائی جا رہی تھیں۔ جس سے ایک طرف تو معلومات مل رہی تھیں اور دوسری طرف نوجوان طلباء و طالبات کو تحریک بھی کہ وہ مستقبل میں ایسی شاندار مشینیں بنائیں۔ ایک اسٹال کی سج دھج اور مشینوں کی تعداد تو ہر آنے جانے والے کے لئے کشش کا باعث تھی۔ ہم نے ایک گھنٹہ اسی اسٹال پر گزارا۔ مشروبات سے تواضع کی جا رہی تھی۔ لڑکے اور لڑکیاں بہترین اور چست لباس میں ملبوس ایسے مستعد دکھائی دیتے تھے جیسا بین الاقوامی نمائشوں میں ہوتا ہے۔ یہاں ایک اور خاص بات یہ تھی کہ بیس تیس ایسے چہرے بھی

134 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

دکھائی دیے جو مقامی نہیں لگتے تھے۔ کوئی افریقی نظر آتا تو کوئی چینی۔ کچھ گورے تھے یا لگ رہے تھے۔ پانچ چھ ملائشین یا تھائی لینڈ کے بھی تھے۔ زیادہ نہیں تو دس پندرہ مختلف ممالک کے لوگ نظر آرہے تھے۔ ہم نے سٹال مینجر سے ان کے بارے میں پوچھا تو کہنے لگا۔ ہمارے بین الاقوامی گاہک ہیں۔ ہم نے انہیں مدعو کیا تھا۔ ہم متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ فوٹو گرافر دھڑا دھڑا تصویریں بنا رہا تھا۔ کبھی سب کو اکٹھے کر کے، کبھی علیحدہ علیحدہ۔ اور کبھی وہ سب بکھر جاتے تب بھی۔ اتنے میں اسٹال مینجر نے فون پر کسی کو اطلاع دی۔ فوٹو بہت اچھے بن گئے ہیں۔ اسٹال بھی زبردست ہے۔ کوئی شک کر ہی نہیں سکتا کہ یہ فوٹو پاکستان کے ہیں یا دبئی کی نمائش کے۔۔۔ ہم نے اپنے منجر سے کہا کہ یہ کیا گفتگو ہے۔ قریباً گھنٹے بعد اُس نے اطلاع دی۔ سر! یہ کمپنی دراصل مارکیٹنگ کرتی ہے دنیا میں دیسی مصنوعات کی اور حکومت اس کام کا اس کو معاوضہ دیتی ہے۔ اس سٹال کو کاغذات میں دبئی کی نمائش میں دکھا کر معاوضہ لیا جائے گا۔۔۔ تو یہ اتنے غیر ملکی کہاں سے یہ لوگ لے آئے ہیں۔ کہنے لگا۔ سر! یہ وہ لوگ ہیں جو یہیں رہ رہے ہیں۔ اور اپنی روزی کے لئے اس طرح کے کام کرتے رہتے ہیں۔۔۔ تو ان سے اسٹال لگانے کا جو معاوضہ طے ہوا تھا، وہ لے لیا ہے تم نے۔۔۔ سر! وہ کہہ رہے ہیں کہ پیشگی ادائیگی کی پالیسی نہیں ہے ان کی کمپنی میں۔ اس مقابلے کے اگلے روز پیسے ادا ہو جائیں گے۔ آپ بے فکر رہیں۔۔۔ تو ہم مطلقاً بے فکر ہو گئے۔

اس مقابلے میں جس چیز پر سب کونا ز تھا۔ وہ کھلونا نما چھوٹے جہاز اور ہیلی کاپٹر تھے۔ عام طور پر جہاز کے لئے رن وے ہونا ضروری ہوتا ہے جبکہ ہیلی کاپٹر عمودی پرواز کی وجہ سے اس کے محتاج نہیں ہوتے۔ مقابلے سے مہینہ بھر پہلے ہم نے وائس چانسلر سے فٹبال گراؤنڈ میں پانچ سو فٹ لمبا اور ڈیڑھ سو فٹ چوڑا رن وے بنانے کی منظوری لی تھی بمع اخراجات کے۔ اس ضمن میں ہمیں چھوٹے ہوائی جہازوں کی افادیت اور اس کام میں اپنی مہارت کی تعریفوں کے پُل باندھنے پڑے ورنہ پیسوں کی

135 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

منظوری نہ ملتی۔ ہم نے دعویٰ کیا کہ یہ کھلونا نما جہاز اور ہیلی کاپٹر دراصل اصلی جہازوں کا ہی چھوٹا نمونہ ہوتے ہیں۔ اگر ہم اس کام میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو ہمیں دوسری جامعات پر تکنیکی برتری حاصل ہو جائے گی۔ یہ وہ دکھتی رگ تھی جس پر ریئس جامعہ نے ہماری بات سے اتفاق کیا تھا۔ کیونکہ جامعہ کی برتری کا سادہ مطلب ریئس جامعہ کی اعلیٰ کارکردگی ہوتا ہے۔ تو مقابلے سے قریباً ایک ماہ قبل رن وے کی تعمیر شروع ہوئی گئی۔ ہمیں اپنی بات پر اعتماد اس لئے تھا کہ پچھلے سال بھی ہم ایسا شو منعقد کر چکے تھے۔ جس کے چرچے زبان زدِ عام تھے۔ اُس اَرشو میں پندرہ بیس رنگ برنگے طیارے اڑے تھے۔ رن وے پہ گولی کی رفتار سے دوڑنا، ہوا میں بلند ہو کر قلابازیاں کھانا، مختلف رنگوں کا دھواں چھوڑتے ہوئے نیچی پرواز کر کے پھر اچانک عموداً اڑتے ہوئے آسمان کی بلندیوں کو چھونا۔ اور پھر تیز رفتاری سے ٹیکسی کرتے واپس آنا۔ یہ سب ایسے نظارے تھے جو بے حد پسند کئے گئے تھے۔ ہم نے ریئس جامعہ کو موجودہ مقابلے میں بطور مہمان خصوصی شرکت کی دعوت دی جو انہوں نے قبول کر لی۔ رن وے کنارے پر ٹینٹ سجا دیا گیا۔ کرسیاں میز بھی پہنچ گئے، مہمانوں کی مشروبات سے تواضع بھی کی گئی۔ بلند آواز میں موسیقی جاری تھی۔ یونیورسٹی کے اندر اور باہر سے سینکڑوں لوگ اپنی بیگمات اور بچوں سمیت مدعو تھے۔ جہاز رن وے پر دوڑنے کے لئے قطار میں کھڑے کر دیے گئے۔ اخبارات اور ٹی وی چینلوں کے نمائندے اور فوٹو گرافر تصویریں اور فلمیں بنا رہے تھے۔۔۔ ہاشمی نے ہمارے کان میں کہا۔ سر! ریئس جامعہ مہمان خصوصی ہیں لیکن وہ ابھی تک نہیں پہنچے۔ اَرشو شروع ہونے لگا ہے۔۔۔ ہاشمی! ذرا روکو اَرشو کو میں فون کر کے پوچھتا ہوں ریئس جامعہ سے۔۔۔ جی سر! آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔ تمام تیاریاں مکمل ہیں۔۔۔ او کے سر!۔۔۔ ہاشمی! وی سی صاحب سیکرٹری اور وزیرِ تعلیم کو ساتھ لئے آرہے ہیں۔ راستے میں ہیں، پندرہ منٹ کے فاصلے پر۔۔۔ تم ایک نظر تمام انتظامات کو دوبارہ اچھی طرح چیک کر لو۔۔۔ او کے سر! ہاشمی یہ کہہ کر چلا گیا۔ دس منٹ بعد واپس

آکر کہنے لگا۔ سر! تیاری سو فیصد مکمل ہے۔ مہمانوں کا استقبال، گلدستے، استقبالیہ مشروبات، موسیقی، طیارے، سکیورٹی۔ ہر چیز فرسٹ کلاس ہے سر۔ آپ بالکل بے فکر رہیں۔۔۔ مہمان پہنچے تو انتظامات دیکھ کر متاثر ہوئے۔ ہر چیز سلیقے سے کی گئی تھی۔

رئیس جامعہ، سیکرٹری اور وزیرِ تعلیم کو ایک ایک طیارے اور ہیلی کاپٹر کے بارے میں بریفنگ دی گئی۔ یہ طیارہ فلاں جنگی جہاز کا چھوٹا نمونہ ہے۔ اس کا سائز یہ ہے۔ یہ اتنی بلندی پر پرواز کرتا ہے۔ یہ ہوا میں فلاں فلاں کرتب کر سکتا ہے۔ یہ اسلحہ بارود بھی ساتھ لے کر جاسکتا ہے۔ یہ ہوا میں اپنے محل وقوع کو سمجھتے ہوئے فصلوں پر سپرے کر سکتا ہے۔ یہ ہوا سے معلوماتی کاغذات پھینک سکتا ہے۔ یہ فی سیکنڈ اتنی رفتار حاصل کر سکتا ہے۔ یہ فضا سے پورے علاقے کی تصاویر بنا کر نظام ترسیل کے ذریعے ہمیں معلومات فراہم کر سکتا ہے۔ جو کسی جنگی یا آفت زدہ علاقے سے متعلق ہوں۔۔۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹے میں تمام جہازوں اور ہیلی کاپٹروں کی معلومات بتائی گئیں۔ تمام مہمان بے حد خوش، متاثر بلکہ ہیبت زدہ تھے کہ ہماری یونیورسٹیوں میں کیسی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ وزیرِ تعلیم نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اعلیٰ تعلیم کے لئے بلاوجہ ہم لوگوں کو بیرون ملک بھجوا رہے ہیں۔ کروڑوں روپے خرچ ہو جاتے ہیں۔ بہتر ہوگا، آپ کے ہاں بھیج دیا جائے۔

میں وزیرِ اعلیٰ کو قائل کرنے کی کوشش کروں گا۔ رئیس جامعہ کا پُر اعتماد چہرہ لائق دید تھا۔۔۔ خوب، بہت خوب بھی۔ تم نے کمال محنت کی ہے۔ اب اُرشو شروع کرو۔ دیکھیں کیسے تمہارے بنائے ہوئے طیارے اڑتے ہیں۔۔۔ شکریہ سر۔ آپ تشریف رکھیں۔

ابھی پروازیں شروع کروا دیتا ہوں۔ تمام مہمان اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے اور بغیر آنکھ جھپکے پہلی پرواز کا انتظار کرنے لگے۔ ہم نے ہاشمی کو اشارہ کیا۔ اُس نے پائلٹ کو پرواز شروع کرنے کا کہا۔۔۔ پائلٹ نے سٹارٹر کے ساتھ پہلے جہاز کو سٹارٹ کرنے کے لئے کام شروع کیا۔۔۔۔۔ کئی منٹ گزر گئے، سٹارٹر آن نہیں ہو رہا تھا۔۔۔ ہم نے ہلکی مسکراہٹ سے پائلٹ کی طرف دیکھا۔۔۔ سر! ابھی ہو جاتا ہے۔ پائلٹ نے پُر اعتماد

137 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

انداز میں کہا۔۔۔ پانچ منٹ گزر گئے، دس منٹ گزر گئے۔۔۔ تم نے سٹارٹر چیک نہیں کیا تھا، ہم نے پائلٹ سے سپاٹ لہجے میں کہا۔۔۔ صبح سے تین دفعہ چیک کیا تھا۔ لیکن الیکٹرانک آلات کسی بھی وقت خراب ہو سکتے ہیں۔۔۔ خراب، کیا مطلب۔۔۔ جی سر! خراب ہو گیا ہے۔۔۔ پھر؟۔۔۔ کوئی مسئلہ نہیں۔ دوسرا سٹارٹر ہے احتیاطاً میرے پاس۔ وہ استعمال کر لیتے ہیں۔۔۔ ہاں، ہاں جلدی کرو۔ دوسرے سے سٹارٹ کر لو۔ او کے سر!۔۔۔ بس پانچ منٹ دے دیں۔ دوسرے سٹارٹر کو فٹ کر لیتا ہوں۔۔۔ پہلے ہی کر کے رکھنا تھا۔۔۔ سر گمان ہی نہ تھا ورنہ پہلے ہی کر لیتا۔۔۔ اچھا جلدی کرو۔۔۔ جی، جی۔ کر رہا ہوں۔۔۔ دس منٹ اور گزر گئے۔۔۔ رئیس جامعہ نے پوچھا۔ کیا ہوا۔۔۔ کچھ نہیں سر! وہ سٹارٹر کام نہیں کر رہا۔ دوسرے سٹارٹر سے سٹارٹ کرنے لگے ہیں۔۔۔ دوسرا سٹارٹر سٹارٹ ہو گیا۔ اُس سے طیارے کے انجن کی شافٹ کو گھمایا گیا۔ ایک مرتبہ، دو مرتبہ، تین مرتبہ۔۔۔ دسویں مرتبہ۔۔۔ کیا ہو گیا اب۔۔۔ سر! یہ سٹارٹر کم ہی استعمال کیا ہے۔ اس لئے اس کی طاقت کا صحیح اندازہ نہیں۔ لگتا ہے یہ کم طاقت سے شافٹ گھما رہا ہے۔ انجن سٹارٹ کرنے کے لئے کافی طاقت چاہیے ہوتی ہے۔۔۔ اب کیا ہوگا۔۔۔ سر! آپ پریشان نہ ہوں۔ ہمارے پاس پندرہ بیس طیارے ہیں۔ میں دوسرا سٹارٹ کر لیتا ہوں۔۔۔ ہاں، یہ ٹھیک ہے۔ جلدی کرو۔ مہمان بے تاب ہیں۔۔۔ او کے سر۔۔۔ دوسرے طیارے کے ساتھ پھر وہی مسئلہ ہوا۔۔۔ اب پائلٹ نے ایک نسبتاً چھوٹا طیارہ سٹارٹ کرنے کی کوشش کی۔۔۔ اس طیارے کو پوری طاقت سے گھمایا گیا۔ تو ایک دم دھماکے کی آواز آئی۔۔۔ سر! وہ زیادہ طاقت کی وجہ سے انجن ناکارہ ہو گیا ہے۔ ہماری سٹی گم ہو گئی۔۔۔ اب کیا کریں۔۔۔ جلدی جلدی نیا طیارہ لاؤ۔ ہاشمی نے بروقت مداخلت کی۔۔۔ تیز ہوا چل رہی تھی۔۔۔ سر! ویسے اتنی تیز ہوا میں طیارے کا اڑنا مشکل ہے۔ پائلٹ نے درمیانے سائز کا طیارہ سنبھالتے ہوئے تنبیہ کی۔۔۔ اڑنا مشکل ہے یا سٹارٹ ہونا۔ ہم نے خفگی کا مظاہرہ

138 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

کیا۔۔۔ سٹارٹ تو سراسر ابھی ہو جاتا ہے، یہ تو کوئی مسئلہ نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ تیز ہوا طیارے کو نقصان پہنچائے گی۔۔۔ جب نقصان ہو گا، دیکھا جائے گا۔ سٹارٹ تو کرو۔۔۔ اوکے سر!۔۔۔ پائلٹ نے شافٹ کو پوری طاقت سے گھمایا تو ایک دم طیارہ سٹارٹ ہو گیا۔ انجن کا شور سنائی دیا تو مجھے نے زبردست تالیوں سے بھرپور داد دی۔ ہمارے سانس میں سانس آیا۔۔۔ پائلٹ نے فاتحانہ انداز میں ہماری طرف دیکھا۔ سر! میں نے کہا تھا نا سٹارٹ کرنا پر اہم نہیں ہے۔۔۔ اچھا بھی، جلدی کرو۔ آدھا گھنٹہ گزر چکا ہے مہمانوں نے سانس کھینچ رکھا ہے۔۔۔ ساتھ ساتھ لاوڈ سپیکر پر کمٹری بھی جاری تھی۔ لیجیے۔ پہلی پرواز رن وے پر دوڑنے لگی ہے۔ یہ خوبصورت طیارہ تکنیکی اعتبار سے انتہائی ممتاز ہے۔ تیز ہوا میں بھی انتہائی مہارت سے مشن مکمل کر سکتا ہے۔ کمٹری پر ہمارے طیارہ کلب انچارج معلومات دے رہے تھے۔۔۔ پائلٹ نے طیارہ کو حرکت دی۔ وہ مہمانوں کے سامنے سے خراماں خراماں چلتے ہوئے آگے بڑھا۔۔۔ سو ڈیڑھ سو فٹ چلنے کے بعد، پائلٹ نے ریموٹ کنٹرول سے رفتار تیز کی تو وہ انتہائی تیز رفتاری سے رن وے پر بھاگنے لگا۔ کوئی تین چار سو فٹ فاصلے کے بعد اُس نے اپنی مطلوبہ رفتار حاصل کر لی۔ اب کسی بھی لمحے وہ ٹیک آف کر سکتا تھا۔ لیکن وہ اسی رفتار سے آگے بڑھتا گیا۔ ہم نے پائلٹ سے ٹیک آف کا کہا۔۔۔ کہنے لگا، سر میں تو کمانڈ دے رہا ہوں۔ لیکن ٹیک آف ہو نہیں رہا۔۔۔ رن وے کا دو تہائی فاصلہ طے ہو چکا تھا۔۔۔ طیارہ سرپٹ دوڑتا ہوا رن وے عبور کر کے گھاس پھوس میں جا گھسا۔۔۔ سب چپ سادھے بیٹھے تھے۔۔۔ وہ، وہ دراصل۔ ہوا انتہائی تیز ہے۔ اس موسم میں پرواز کرنا انتہائی مشکل ہوتا ہے۔ ہم نے صورتِ حال سنبھالنے کی کوشش کی۔۔۔ لیکن ہم نے تو سنا ہے کہ یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لئے۔ وزیرِ تعلیم نے جواب دیا۔ ساتھ ہی ایک قہقہہ بلند ہوا۔۔۔ اس کا مطلب ہے کہ طیارے سٹارٹ ہو کر رن وے پر تو بھاگ رہے ہیں لیکن جونہی فضا میں بلند ہوں گے، تیز ہوا ان کا توازن خراب کر سکتی

139 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

ہے اور یہ گر سکتے ہیں۔ چونکہ یہ چھوٹے طیارے ہیں، ان کا وزن کم ہے تو معمول سے ذرا زیادہ ہوا بھی انہیں پرواز نہیں کرنے دے گی۔ تو پھر اب تیز ہوا کا کیا حل ہے۔ ہم نے دماغ پر زور دیا۔۔۔ ہوا کا چلنا یا رکنا تو کسی انسان کے بس میں نہیں۔۔۔ پھر کیا کریں۔۔۔ دعا۔۔۔ جی، بس اب دعا ہی ہو سکتی ہے۔۔۔ اب ہم دل ہی دل میں ہوا رکنے کی دعائیں کرنے لگے۔ ساتھ ہی پائلٹ اور ہاشمی سے بھی کہا کہ تسبیح پڑھیں اور ہوا رکنے کی دعا کریں۔۔۔ دعا کی افادیت اور اثرات کے ہم قائل تو ہیں لیکن یہ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ ہماری دعا مستجاب ہو بھی جائے تو بھی ہوا کے رکنے میں وقت لگے گا۔ اور یہاں یہ حالت ہے کہ گھنٹے بھر سے صحافی، کیمرہ مین، رئیس جامعہ، سیکرٹری، وزیر اور سینکڑوں مہمان اور اُن کے بے صبرے بچے ہمیں خونخوار نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔۔۔ اس خوف سے ہماری دعا میں شدت اور رقت آگئی۔۔۔ ہوا کی رفتار کم ہونا شروع ہو گئی۔ پہلے تو ہمیں یقین نہیں آیا۔ اور خیال تھا کہ یہ ہمارا وہم ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ لمحوں میں ہوا کی رفتار کم ہو جائے۔۔۔ پانچ منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ ہوا بالکل بند ہو گئی۔ معجزہ ہو گیا۔ اب ہمیں اپنے مستجاب الدعوات ہونے کا گمان ہونے لگا۔۔۔ ہم نے نہایت پُر اعتماد لہجے میں رئیس جامعہ سے کہا کہ سر! اللہ کا شکر ہے ہوا بند ہو گئی ہے۔ چند لمحوں میں طیارے اڑانیں بھریں گے۔ جواب میں انہوں نے سیکرٹری اور وزیر سے آنکھ بچا کر ہمیں زہر آلود نظروں سے دیکھا۔۔۔ ہم نے فوراً ہاشمی سے پانی کا گلاس لانے کو کہا۔۔۔ پائلٹ بھائی جان! اب تو ہوا بند ہو گئی ہے۔ جلدی سے پانچ سات جہاز اڑادو۔۔۔ جی سر!، میں نے دوسرے سٹارٹر کے مطابق سات طیارے قطار میں لگائے ہیں۔ ایک کے بعد ایک طیارہ فضا میں جائے گا۔ پورا آسمان بھر جائے گا طیاروں سے۔ اُس نے ہماری لاج رکھتے ہوئے کہا۔۔۔ ہم دوبارہ رئیس جامعہ کے ساتھ والی نشست پر براجمان ہو گئے۔۔۔ پانچ منٹ گزر گئے۔ پہلا طیارہ ہی سٹارٹ نہ ہوا۔ ہم پھر پائلٹ کے پاس پہنچے۔۔۔ اب کیا ہوا۔۔۔ وہ سر! ارکرافٹ سٹارٹ نہیں ہو رہا۔

140 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

۔۔۔ وہ تو مجھے بلکہ پورے مجمع کو نظر آ رہا ہے۔۔۔ پر ہو کیوں نہیں رہا۔۔۔ سر! وہ سٹارٹر صحیح کام نہیں کر رہا۔۔۔ ابھی تو سٹارٹر نے طیارہ سٹارٹ کیا ہے۔۔۔ جی سر، پر اب نہیں کر رہا۔۔۔ تو۔۔۔ سر میں دوسرا طیارہ دیکھ لیتا ہوں۔۔۔ جلدی کرو۔۔۔ دوسرا دیکھو۔۔۔ سر! سر! یہ بھی نہیں ہو رہا۔۔۔ تیسرا، چوتھا اور باقی۔۔۔ جی سر! وہ، وہ بھی نہیں ہو رہے۔۔۔ ہمیں تو گویا سمندر میں غوطے آنے لگے۔۔۔ پھر دعا کی۔۔۔ اے شرم رکھنے والے! ہوا، تیز یعنی انتہائی تیز، نہیں بلکہ آندھی چلا دے۔ ایسی آندھی کہ مہمانوں کے سر پر لگا شامیانہ اکھڑ جائے اور آنکھوں میں ایسی گرد پڑے کہ کسی کو کچھ نظر نہ آئے۔ طوفان بھیج دے اور ایسی موسلا دھار بارش ہو جائے کہ رن وے پہ پانی کھڑا ہو جائے تاکہ تیرا یہ خاکسار کہہ سکے کہ کاش آج نومن تیل ہوتا تو آپ دیکھتے کیسے رادھا ناچتی۔۔۔ لیکن ہوا یہ کہ خاکسار کو مستجاب الدعوات سے خاکساری پر مامور کر دیا گیا۔

تو صاحبو! موسیقی جائز ہے یا ناجائز۔ مباح ہے یا حرام۔ جو بھی ہے پر اس کے بغیر طلباء و طالبات کی ہر تقریب حرام ہے۔ ہم نے بہتیرا سمجھایا کہ اس شیطانی کام سے بچو۔ لیکن طلباء و طالبات کیسے اپنی تقریب حرام کر سکتے تھے۔ طلباء نے کہا کہ ہم خود ہی گانے گائیں گے اور ہمیں میں سے کوئی ساز وغیرہ بھی بجالیں گے اور طالبات نے بھی تائید کی۔ ہم نے اجازت دے دی۔ کہ اگر وہ یہ حیلہ نہ کرتے تو اپنی روح کو شانت کرنے کے لئے ہمیں ہی ان کو اس کام کے لئے کہنا پڑتا۔۔۔ لیکن بہر حال ہم نے نہیں کہا، البتہ ان کی درخواست پر اجازت ضرور دی۔ ہماری ایک ساتھی، شیریں کہ شباہت و سکناات میں ملکہ پکھراج کی ہو بہو نقل ہیں، بہت عمدہ مذاق رکھتی ہیں شاعری اور موسیقی کا۔ وہ بضد تھیں کہ ستار دنیا کا سب سے سریلا ساز ہے۔ اگر انسانی آواز کی ملاوٹ کے بغیر سنا جائے تو مردہ بت میں بھی روح واپس آ سکتی ہے۔ اور یہ کہ دنیا میں اُن کے استاد جیسا کوئی اور ستار نواز نہ ہوگا۔ تو اُس نے اپنے استاد کو بھی اس مقابلے میں ستار بجانے کی دعوت دے ڈالی۔ اور ساتھ ہمیں یہ حکم نما درخواست بھی کی کہ جب استاد آئیں تو

Contact for Thesis Composing and Final Setting | 0303-761-96-93

142 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

ہم محو اور مسحور ہو گئے ہیں۔ مجمعے میں سے کسی نے کہا مسحور نہیں، مبہوت ہو گئے ہیں۔ جبکہ ہمارا خیال تھا کہ ہم مجبور ہو کر حنوط ہو چکے ہیں۔۔۔ درباری، مالکوس کے بعد بھیرویں شروع ہی ہوا تھا کہ تین طلباء گٹار اور پیانو پکڑے سیٹیج پر چڑھ کے گانے لگے۔ گانا تو خیر کیا تھا، شور کا بھی کوئی سلیقہ، قرینہ اور ردھم ہوتا ہے۔ یہ ایسا تھا جیسے سبزی منڈی میں اجناس کی بولی ہو رہی ہو۔۔۔ جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے۔۔۔ ستار بجانے والی پارٹی پہلے متعجب پھر ناراض ہوئی اس بے ہودگی پر۔۔۔ لیکن یہ اسقدر آنا فانا ہوا کہ کسی کو کچھ سمجھ نہ آئی۔۔۔ استاد اور ان کی پارٹی خفا ہو کر سیٹیج سے اتر گئی۔ ہم نے منانے کی کوشش کی اور استاد تیار بھی ہو جاتے لیکن لڑکوں نے سیٹیج چھوڑنے سے انکار کر دیا۔۔۔ تو ہم نے عافیت اسی میں جانی کہ ستار پارٹی کو کھانے کے لئے لے جائیں۔۔۔ کھانے میں بریانی، مرغ تورمہ، سلاد اور سبز چائے تھی۔ ذائقہ بھی لا جواب تھا۔ ہاشمی! کھانا مزیدار بنوایا ہے تم نے۔۔۔ جی سر! بطور خاص آپ کے مزاج اور ذائقے کے مطابق بنوایا ہے۔۔۔ شکر ہے یار کھانا تو اچھا ملا۔ ہم نے آخری لقمہ لیتے ہوئے کہا۔۔۔ سر! وہ گزارش یہ کرنا تھی۔ کہ کم از کم کھانے کی ادائیگی کروادیں۔۔۔ بھی ہو جائے گی۔ جہاں اتنا ادھار لیا ہوا ہے، یہ بھی سہی۔۔۔ وہ سر! لیکن اس کی بات اور ہے۔ یہ میری بیوی کے ماموں زاد ہیں جنہوں نے کھانا پکایا ہے۔ ادائیگی نہ ہوئی تو میں گھر نہیں جاسکوں گا۔۔۔

رات ڈھلتے ہی لالٹین والے کیسی غبارے اڑانے کا مقابلہ شروع ہو گیا۔ میوزک اس قدر تیز تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ اندھیرے میں جب ایک ساتھ سینکڑوں غبارے بلند ہوئے تو عجب سماں بندھ گیا۔ یہاں بھی مقابلہ تھا۔ ایک گروپ کی لالٹینوں کے شعلے رنگ بدلتے تھے۔ لال، پیلا، سفید، نیلا۔ ایک دوسرے گروپ کا دعویٰ تھا کہ ان کے لالٹینی غبارے ہوا میں سب سے بلند ہیں۔ تیسرے کا یہ کہ اُن کے غبارے زیادہ دیر فضا میں موجود رہیں گے۔ اس بحث میں سارے گروپ تلخ کلامی اور

143 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

پھر گالی پر اتر آئے۔ جنہیں میدانِ گالمِ گلوچ میں شکست ہوئی انہوں نے ہاتھ پائی شروع کر دی۔ تھپڑ، لاتیں، گھونسے، لاٹھیاں چلنا شروع ہو گئیں۔ ہم میدانِ کارزار میں کھڑے یہ نہیں سمجھ سکے کون کس کو مار رہا اور کس سے پٹ رہا ہے۔ فوراً ہاشمی سے کہا، اعلان کروادو کہ طلباء و طالبات کو لے کر جانی والی بسیں پانچ منٹوں میں روانہ ہو جائیں گی۔۔۔ لیکن بسوں کو تو کچھ طلباء زبردستی سینما دیکھنے لے جا چکے ہیں، جواب ملا۔۔۔ سر! اب کیا کریں، ہاشمی سہمی ہوئی آواز میں بولا۔۔۔ گھبراؤ نہیں۔ ہم ابھی آتے ہیں۔ ہم نے اندھیرے میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے اپنی گاڑی بھگادی۔۔۔

144 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

تا کہ حقیقت واضح ہو جائے



اولہو! عقل تمہارے ٹخنوں میں بھی نہیں۔ کدھر گائے بھینسوں کی طرح بلا مقصد گھوم رہے ہو۔ ہے تو تمہاری پیدائش و موت بے مقصد، پر ایک کام کر لو عقلمندی کا، بھلائی کا۔ کام تو تمہارے وہ بھی نہیں آئے گا، اگلے جہان میں۔ ہاں مگر یہ دعویٰ کر سکو گے کہ تم بھی انسان تھے۔۔۔ ایسی عزت افزائی اور وہ بھی ایسی آواز سے، جو پہلے کبھی نہ سنی تھی، ہماری تو سٹی ہی گم ہو گئی۔۔۔ عام حالات میں غصہ آنا چاہیے تھا مگر یہاں تو خوف سے ہماری جان پر بنی ہوئی تھی۔ ہم حضرت قبلہ و کعبہ والد گرامی کے ہمراہ ریلوے اسٹیشن پہنچے تھے اور ٹکٹ خرید ہی رہے تھے کہ یہ آواز آئی تھی۔۔۔ اولہو!۔۔۔ صاحبو! ہم نے جھجکتے، ڈرتے بلکہ قریباً بے ہوش ہوتے ہوئے قبلہ کی جلالتِ رخ پر ایک نظر ڈالی۔۔۔ رنگ متغیر ہو رہا تھا۔۔۔ پھر آواز آئی۔۔۔ اولہو! یہ خستہ خان ہے، ساتھ کھڑے بھاری بھر کم بارش حد درجہ جوان کی طرف اشارہ کیا۔۔۔ یہ کونٹہ سے ٹرین میں سوار ہوا تھا۔ راستے میں کسی نے اس کی جیب کاٹ لی ہے۔ ساڑھے تیرہ ہزار تھے اس کی جیب میں۔ اب کچھ بھی نہیں ہے۔ تین مہینے بعد گھر جا رہا ہے، بوڑھے باپ کو دیکھنے۔ اب گھر کیا دے گا۔۔۔ لیکن میں پورے کروں گا اس کے پیسے۔ نکال تو بھی پانچ سو روپیہ۔۔۔ پر تم ہو کون؟ ہم نے بمشکل استفسار کیا۔۔۔ لہو! اولہو! تجھے نہیں پتہ میں کون ہوں۔۔۔ او! تم نے تین مہینے یونیورسٹی میں برباد کر دیے۔ سارا دن لیکچر میں ہوتے ہو اور رات میں ہاسٹل میں اپنے کمرے میں۔ کبھی ارد گرد بھی دیکھا کرو۔۔۔ اور ہاں کبھی تم بھولا کنٹین آؤ، کسی کی مدد کرو، کسی مسئلے پر بحث کرو تو تمہیں پتہ ہو میں کون

Contact for Thesis Composing and Final Setting | 0303-761-96-93

147 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

کیفیت تھی۔ ملتانی دوپہر سے لے کر رات پچھلے پہر تک کنٹین میں کیا کرتا ہے۔ کھانا کھانے میں زیادہ سے زیادہ آدھ گھنٹہ لگ سکتا ہے، کھانے کے بعد کسی دوست سے گپ شپ ہو جائے تو مزید آدھ گھنٹہ۔ ایک گھنٹے کے بعد تو وہاں بیٹھا ہی نہیں جاسکتا۔ اور یہ سگریٹ پینے سے کچھ نہ کچھ تو لطف آتا ہوگا، وگرنہ لوگ کیوں پیتے ہیں۔ کئی مرتبہ دل چاہا کہ جا کر دیکھ لوں، لیکن پھر سوچا کہ قبلہ نے منع کیا ہے آوارہ لڑکوں سے ملنے کو۔ لیکن انہیں کیسے پتہ چل سکتا ہے کہ ہم آوارہ لڑکوں سے ملتے ہیں۔۔۔ ہو سکتا ہے کوئی انہیں بتا دے۔ یا کبھی کسی کمزور لمحے میں ہم خود ہی اعتراف کر بیٹھیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم وہاں ملتانی کے ساتھ بیٹھے ہوں اور قبلہ وارد ہی ہو جائیں۔۔۔ ہم فیصلہ نہ کر پائے تو ایک ہم جماعت سے اس خلیجان کا ذکر کر بیٹھے۔ وہ اس پریشانی پر حیران رہ گیا۔ اور ساتھ ہی ہمیں گھسیٹتے ہوئے کنٹین لے گیا۔ ہم نے بہتیرا واویلا کیا کہ قبلہ دیکھ لیں گے۔ لیکن اس نے ہماری ایک نہ سنی۔۔۔ کنٹین پہنچتے ہی بھولے سے کہنے لگا۔ کدھر ہے وہ لفنگا؟ بھولے نے نام پوچھے بغیر کہا۔ ادھر ہی ہوگا۔ اُس نے کہاں جانا ہے۔۔۔ اتنے میں ملتانی ہمارے سامنے تھا۔۔۔ ہمیں دیکھ کر کہنے لگا۔ یونیورسٹی میں چھٹی ہو گئی کیا۔ لمبو! تم کیسے لیکچر سے باہر نکل آئے۔۔۔ یہ مجھے کھینچ کر لے آیا ہے۔ اپنے ہم جماعت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہم ذرا کھسیانے ہوئے۔۔۔ ملتانی ہمیں وہاں بیٹھے لڑکوں کے گروپ میں لے آیا۔ دو تین لڑکے سگریٹ پی کر ایک دوسرے کے چہرے پر دھواں پھینک رہے تھے۔ ان کے بالمقابل ایک نوخیز مولوی صاحب تشریف رکھتے تھے اور سگریٹ کی مذمت میں طبی اور مذہبی دلائل دے رہے تھے۔ ہمارے مذہب میں تمباکو سے کراہت کی گئی ہے۔ اصل میں تو یہ حرام ہے لیکن شاید کسی انجانی مصلحت کے تحت اس کو کراہت میں بدلا گیا ہوگا۔ دنیا میں ایک ارب سے زائد لوگ تمباکو نوشی کرتے ہیں۔ اور ہر سال لگ بھگ ساٹھ لاکھ افراد اسی سے موت کے اندھے غار میں جا گرتے ہیں۔ تمباکو میں چار ہزار کیمیائی اجزاء اور مرکبات پائے جاتے ہیں۔

جن میں مسلمہ طور پر پچاس ایسے ہیں جو سلطان جیسے لاعلاج مرض کا باعث بنتے ہیں۔ اعداد و شمار کے مطابق صرف بیسویں صدی میں دس کروڑ افراد کی موت تمباکو نوشی سے ہوئی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پہلی اور دوسری جنگِ عظیم میں بھی اتنے انسان نہیں مرے جتنے تمباکو نوشی سے مرے لیکن کم فہمی دیکھیں کہ ساری دنیا کے مفکرین جنگ سے بچنے کی بات تو کرتے ہیں تمباکو نوشی سے بچنے کی نہیں۔۔۔ اتنے میں سگریٹ پیتے ہوئے ایک لڑکے نے تیز پتی والی چائے منگوا کر اس میں اپنے سگریٹ کی راکھ شامل کر کے آدھی پیالی خود پی کر بقیہ آدھی انہی مولوی صاحب کو نہ صرف پیش کی بلکہ پینے پر یوں اصرار کیا۔۔۔ بن پئے مخالفت کیسی، پہلے پیو پھر لاکھ مخالفت کر لینا۔۔۔ میز کی دوسری جانب تجمل حسن چلا رہے تھے۔۔۔ اگر مذہب کی بنیاد پر ہندوستان تقسیم نہ ہوتا تو آج یہاں آپ ہوتے نہ میں۔ ہم دونوں کسی ہندو کی پنسار کی دکان پر لوگوں کو سود پر جڑی بوٹیاں بیچ رہے ہوتے۔۔۔ سود پر کیوں؟ شہباز بھائی نے پوچھا۔۔۔ اس لئے کہ پنسار پر اب آتے ہی وہ ہیں جن کے پاس نقد ادائیگی کے لئے کچھ نہیں ہوتا۔ بنیا چلاتا پنسار کی دکان، غریب وہاں سے ادھار لیتے اور ادھار اور سودی ادائیگی کے بھی کھاتے آپ اور میرے جیسے وہاں لکھتے۔ اور ہمارا کیا مستقبل ہوتا۔۔۔ اگر متحدہ ہندوستان اتنا ہی سندر اور پوتر ہے جیسے فلموں میں ہوتا ہے تو سکھ کیوں دنیا میں مارے مارے پھرتے۔ میرے سکھ دوست کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو پاکستان مل گیا، ہندوؤں کو ہندوستان۔ ہم کہاں جائیں۔۔۔ لیکن جہاں ہر دوسرے شہر میں علیحدہ مذہب، زبان اور رسم و رواج ہوں۔ وہاں پر اس طرح ہو جاتا ہے۔ شہباز بھائی کو مل سڑوں میں بولے۔ اس رنگا رنگی سے جو قوام تیار ہو سکتا تھا، وہ تاریخِ عالم میں نیا اور انوکھا ہو سکتا تھا۔ ایک ایسی تہذیب جس کے اجزا میں مختلف مذاہب، زبانیں، رسوم و رواج اور طرزِ زندگی سمو دیا گیا ہو۔ یہ مغرب کے سیکولر ازم کے نظریے کو مات کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا اور تاریخِ انسانی میں ہندوستان کی تہذیب کو بالاتر ثابت کر سکتا تھا۔۔۔ تجمل حسن سے رہا نہ گیا۔! واہ شہباز

149 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

بھائی۔ آپ علم، مشاہدے، تجربے، آدابِ زیست میں ہم سب کے استاد ہیں، مگر آپ کی بات کا سادہ لفظوں میں مطلب یہ ہے کہ آپ ایک ایسا پرساد بانٹ رہے ہیں جو سوچی کے حلوے میں بنا ہو۔ پھر اس میں بادام، کشمش، کاجو، شہد اور دیسی گھی بھی ہو۔ اور ساتھ ہی گاؤں موٹر بھی۔ بتائیے ایسا پرساد کس کے کام کا؟۔۔۔ شہباز بھائی نے ادھر ادھر دیکھا کہ اُن کے فلسفے کی تشریح کس کس نے سنی ہے اور ساتھ ہی کہنے لگے۔۔۔ یہ بات پھر سہی، یہ بتاؤ کہ آم ملتان کے زیادہ خوش ذائقہ ہیں یا سندھ کے؟۔۔۔ اور ہاں یاد آیا کہ۔۔۔ سلسلہ روز و شب، نقشِ گر حادثات۔۔۔ انہی حادثات سے تہذیبیں جنم لیتی ہیں اور ہر عہد میں کوئی نہ کوئی تہذیب بالا دست ہوتی ہے۔ جس سے زیر دست اقوام نفرت کرتی ہیں، حالانکہ تہذیبی بالادستی کسی خوبی کی بنیاد پر ہی ہوتی ہے۔ اب عہدِ حاضر میں امریکہ کو ہی لے لیں۔ پچھلی صدی میں جس قدر ایجادات یہاں ہوئی ہیں۔ اور جس قدر فائدہ ساری دنیا کے انسانوں کو ان سے ہوا ہے۔ اس کی مثال نہیں ملتی۔ تو یہ جو سپر پاور کا وجود ہے۔ یہ اپنے اندر ایک منفعت رکھتا ہے، پوری انسانیت کے لئے۔۔۔ اب پھر تجملِ حسن سامنے آگئے۔۔۔ یہ امریکی اپنی ایجادات واپس لے لیں ہم سے اور افغانستان، عراق میں جو انسان قتل کئے ہیں، وہ ہمیں لوٹا دیں۔۔۔ شام ڈھل چکی تھی۔ ہمیں اچانک یاد آیا کہ ہم نے تو کتابیں خریدنے بازار جانا تھا۔ جانے کے لئے رخصت طلب کی تو ملتانی نے کہا تم ابھی یہاں نووارد ہو۔ تمہیں کیا پتہ اردو بازار کدھر ہے۔ کس راستے سے جانا ہے، کس دکان پر جانا ہے۔ کہیں جیب ہی نہ کٹوا لینا۔ میں کہاں پھر تمہارے پیسے مانگتا پھروں گا یونیورسٹی میں۔ مانگنے میں مجھے عار نہیں پر یونیورسٹی کے لڑکوں کے پاس پیسے ہوں گے تو وہ یہ جرمانہ بھریں گے۔۔۔ میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ ہمیں بھی اسی میں سہولت محسوس ہوئی کہ کوئی ساتھ چل کر ایک مرتبہ ہمیں کتابوں کی دکانوں تک پہنچا دے۔۔۔ ملتانی کے پاس موٹر سائیکل تھی۔ تھی اسکی اپنی یا کسی اور کی۔ یہ عقدہ آج تک وانہ ہوسکا۔ استعمال اُس کا سبھی ہم جماعت کرتے۔ ہم

جماعت تو کیا، یونیورسٹی کے تمام طالب علم کرتے۔ پھر اُن کی دیکھا دیکھی طالبات نے بھی ملتان سے فرمائش کر دی کہ وہ یونیورسٹی میں موٹر سائیکل چلانا سیکھنا چاہتی ہیں۔ یونیورسٹی میں اس لئے کہ اُن کے گھروں میں پابندی تھی کہ وہ موٹر سائیکل سیکھ سکتی ہیں نہ چلا سکتی ہیں۔ جبکہ ملتان کے نزدیک یہ بنیادی نسوانی حقوق میں شامل تھا کہ ہر لڑکی کو موٹر سائیکل چلانا آنا چاہیے۔ جن لڑکیوں کو اُن کے گھر والے مرسیڈیز گاڑیوں پر چھوڑنے کے لئے ڈرائیور بھیجتے، وہ بھی ملتان کی اُس موٹر سائیکل کی سواری ضرور کرتیں جس کے سن ساخت کا علم اُس کی بنانے والی کمپنی کو بھی نہ تھا۔ کئی پروفیسر بھی کسی طالب علم کو کہلوا کر یہ موٹر سائیکل لے جاتے۔ ایک روز ایک صاحب یہ کہہ کر موٹر سائیکل لے گئے کہ وہ پروفیسر الطاف عجمی کے بھائی ہیں اور پروفیسر صاحب کے لئے ہسپتال دوا لینے جا رہے ہیں۔ دو تین دن واپس نہ آئے تو عجمی صاحب سے رابطہ کرنے پر تفتیش شروع ہوئی تو پتہ چلا کہ وہ حضرت عجمی صاحب کے بھائی نہیں سالا تھے اور وہ اُس موٹر سائیکل پر عجمی صاحب کے گھر کام کرنے والی خادمہ کو اُس کے تین بچوں سمیت بھگا کر اپنے گاؤں واقعہ نواح رینالہ خورد جا چکے تھے۔ خادمہ کے خاوند نے پرچہ درج کروا دیا جس میں ملتان کا نام اعانت جرم میں شامل ہے۔ یہ مقدمہ چھ آٹھ مہینے چلتا رہا۔ ملتان اسی موٹر سائیکل پر مقدمے کی کارروائی میں شریک ہونے جاتا رہا۔ ہر دوسرے چوتھے یونیورسٹی کو بھی کسی سرکاری کام کے لئے اسی موٹر سائیکل کا سہارا لینا پڑتا۔ ایک مرتبہ تو رجسٹرار نے ایک کلرک کو کسی خالصتاً سرکاری کام کے لئے اس موٹر سائیکل پر تھانے بھیج دیا۔ وہاں محرر نے کلرک کو موٹر سائیکل سمیت حوالات میں بند کر دیا کیونکہ اُس کے پاس اس کے کاغذات نہیں تھے۔ رجسٹرار نے تھانے والوں کی منت سماجت کی کہ کلرک اور موٹر سائیکل چھوڑ دی جائے تو تھانے والوں نے کلرک کو بھیج دیا اور موٹر سائیکل ضبط کر لی۔ رجسٹرار بھاگا بھاگا وائس چانسلر کے پاس گیا کہ فوراً موٹر سائیکل واپس کروائی جائے۔ وائس چانسلر نے پوچھا تم ایک بے نام موٹر سائیکل کے لئے اتنے پریشان کیوں ہو۔ تو

151 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

کہنے لگا سر! فوری طور پر میں نے کچھ کاغذات چانسلر صاحب کے پاس گورنر ہاؤس بھجوانے ہیں۔ اس وقت کوئی گاڑی، موٹر سائیکل یا سائیکل دستیاب نہیں۔ صرف وہی موٹر سائیکل ہے پلیز وہ موٹر سائیکل چھڑوائیں۔۔۔ وائس چانسلر نے ایس۔ پی سے بات کر کے وہ موٹر سائیکل چھڑوائی تھی۔۔۔ ملتانی نے ہمیں موٹر سائیکل پر اپنے پیچھے بٹھایا اور اردو بازار چل پڑا۔ ایک دو کلو میٹر چلنے کے بعد موٹر سائیکل پنکچر ہو گئی۔ ہم دونوں موٹر سائیکل کو دو اڑھائی فرلانگ گھسیٹ کر پنکچر لگوانے والی دکان پر لے گئے۔ مستری چہرے مہرے اور گفتگو سے ذرا عام روش سے ہٹ کر تھا۔ پانی کے ٹب میں ٹیوب چیک کرنے کے بعد کہنے لگا۔ تن ہمہ داغ داغ شد، پنبہ کجا کجا نہم۔۔۔ ہمیں کیا سمجھ آتی۔ ملتانی البتہ ذرا جھینپ گیا۔ مستری نے کہا کہ اتنے پنکچر لگانے سے بہتر ہے نئی ٹیوب ڈالوا لو۔ ملتانی بولا نئی کتنے کی ہے۔۔۔ تین سو کی۔۔۔ اور پنکچر کتنے کے لگیں گے۔۔۔ پونے تین سو کے۔۔۔ پھر تو پنکچر ہی لگا دیں، ملتانی نے فیصلہ صادر کر دیا۔ پنکچر لگنے کے بعد بھی موٹر سائیکل اسٹارٹ نہ ہوئی تو پتہ چلا کہ کار بوریٹر کھول کر صاف کرنا پڑے گا۔۔۔ اور کار بوریٹر مکینک اس وقت دستیاب نہیں۔ تو ہم اور ملتانی موٹر سائیکل گھسیٹتے ہوئے پیدل ہی اردو بازار کی طرف چل پڑے۔۔۔ راستے میں ہم نے ملتانی سے پوچھا۔ یہ جو لڑکے بھولا کنٹین میں بیٹھے بھانت بھانت کی بولیاں بولتے ہیں۔ اس کا کیا فائدہ؟۔۔۔ تبادلہ خیال سے نئی راہیں کھلتی ہیں۔ ایسی راہیں جو پڑھنے لکھنے سے نہیں کھلتیں۔ کتاب پڑھنے سے کتابی علم حاصل ہوتا ہے۔ ہم ایسا اس لئے کرتے ہیں کہ حقیقت واضح ہو جائے۔۔۔ کون سی حقیقت؟ ہم نے حیرانی کا مظاہرہ کیا۔۔۔ ہر معاملے اور مسئلے کی اپنی حقیقت ہوتی ہے جو اکثر اوقات تہہ درتہہ پوشیدہ ہوتی ہے۔ اُس کو واضح کرنے کے لئے گفتگو، تبادلہ خیال بے حد اہم ہے۔ یونیورسٹی میں بہت سے طلباء اس حقیقت سے ناواقف ہیں۔ ملتانی نے ہم پر حقیقت واضح کی۔۔۔ یہ لڑکے تو سارا دن بھولا کنٹین میں بیٹھ کر وقت ضائع کرتے ہیں، پڑھتے کب ہیں؟۔ ہم سے رہا نہ

گیا۔۔۔ تم علم کو کتاب تک محدود سمجھتے ہو۔ یہ کائنات میں پھیلا ہوا ہے۔ اس لئے اس کی تلاش کے لئے مختلف اور متنوع طریقے استعمال کرنا پڑتے ہیں جن کے بغیر حقیقت نہیں کھلتی۔۔۔ اردو بازار پہنچے تو ہم پر حقیقت یہ کھلی کہ رات کے نو بج چکے ہیں، دکانیں بند ہیں اور اب کچھ نہیں ہو سکتا۔۔۔ ملتانى نے بازار کی ایک ایک گلی چھانی کہ شاید کوئی دکان ہی کھلی ہو اور کتابیں مل جائیں لیکن ہر دکان کے سامنے پڑے لکڑی کے تختے کے نیچے سے نو مولود سے قریب المرگ کتوں نے ہمارا استقبال کیا۔ ہمیں وحشت ہو رہی تھی لیکن ملتانى ایسے تھا جیسے اس استقبال سے محظوظ ہو رہا ہو۔ ہم نے پوچھا کہ اُسے کتوں کا یہ سلوک پریشان نہیں کرتا۔ کہنے لگا، یہ میرے ساتھ اکثر ہوتا ہے کہ میں یہاں پہنچتا ہوں تو دکانیں بند ہو جاتی ہیں۔ لیکن کوئی بات نہیں۔۔۔ یہاں سے ہم چلتے ہیں سیدھا سینما، فلم دیکھتے ہیں۔۔۔ فلم میں کیا رکھا ہے؟ ہم نے پوچھا۔۔۔ وہ دراصل، چند دنوں سے یونیورسٹی میں دوستوں میں یہ بحث ہو رہی تھی کہ سینما کسی بھی ثقافت کا اہم حصہ ہے لیکن ہمارے یہاں فلم کے موضوعات اور معیار اچھا نہیں اور دوسرا یہ کہ سینماؤں کا ماحول بھی ایسا نہیں جہاں جایا جاسکے۔ جبکہ اس کے مخالفین یہ کہتے ہیں کہ ایسا اس لئے ہے کہ ہماری نسل پروان چڑھی ہے مذہبی عدم رواداری کے ماحول میں، تو وہ فلم دیکھنا ہی نہیں چاہتے۔ میں نے ارادہ کیا کم از کم دس فلمیں دیکھوں گا تا کہ حقیقت واضح ہو جائے۔ آج مسلسل آٹھواں دن ہے۔۔۔ فلم دیکھ کر نکلے تو آدھی رات گزر چکی تھی۔۔۔ ملتانى تم کھانا کب کھاتے ہو؟ ہم نے بھوک سے بے حال ہو کر پوچھا؟۔۔۔ کھانا تو اب ہم کھائیں گے۔۔۔ ملتانى نے دیسی بکرے کی چانپوں اور سندھی بریانی کا آرڈر دیا۔ بیرے نے کہا کہ یہ چیزیں تیار کرنے میں کچھ وقت لگے گا۔۔۔ کوئی بات نہیں، تم تسلی سے کھانا بناؤ۔ رات کا پچھلا پہر ہے۔ اب یونیورسٹی میں بھولا کنٹین پر تو کوئی ہوگا نہیں۔ ہم نے وہاں جا کر کیا کرنا ہے۔ ملتانى کی خوشدلی لا جواب تھی۔۔۔ اذان فجر کے ساتھ ہم یونیورسٹی پہنچے تو ملتانى نے کہا۔ جاؤ آرام کرو۔ میں دوپہر کو بھولا کنٹین آ جاؤں

153 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

گا۔ تم آرام سے سہ پہر تک آ جانا۔۔ ہم اپنے کمرے کی جانب جا رہے تھے کہ پیچھے سے آواز آئی۔ رات کے آخری پہر کہاں سے آئے ہو تم! ساتھ ہی ہمیں چوکیدار نے آدبوچا۔ وہ، وہ۔۔ ہم اور ملتانی ذرا باہر گئے تھے کتابیں خریدنے۔۔ اچھا تو تم گئے تھے باہر ملتانی کے ساتھ۔۔ چلو میرے ساتھ وارڈن صاحب کے دفتر میں۔۔۔ چوکیدار نے ہماری ایک نہ سنی اور ہمیں وارڈن آفس لے آیا۔۔ انتظار کرو یہاں، جب تک وارڈن صاحب نہیں آتے۔ ساتھ ہی چوکیدار نے باہر نکل کر آفس کو تالا لگا دیا۔ ہم نے زندگی میں کبھی رات کو دس بجتے نہیں دیکھے تھے۔ آج فجر ہو رہی تھی۔ جمائیوں پر جمائیاں آرہی تھیں۔ نیند کے مارے بُرا حال تھا۔ کرسی پر بیٹھتے ہی کچھ ہوش نہ رہا۔۔۔ کسی نے ہمیں جھنجھوڑ کر اٹھایا تو پتہ چلا کہ ہم وارڈن آفس میں ہی ہیں۔۔۔ سر! میں نے اسے سخت سزا دی ہے آٹھ گھنٹے ہو گئے اس کو یہاں بند کیا ہوا ہے۔ چوکیدار بولا۔۔۔ اب ہمیں معلوم ہوا کہ ہمیں سزا دی ہوئی تھی۔۔۔ تو وارڈن صاحب کب آئیں گے۔ ہم نے انگڑائی اور جمائی ایک ساتھ لیتے ہوئے پوچھا۔۔۔ وارڈن صاحب۔ وہ ہمارے افسر ہیں، ہمیں کیا پتہ وہ کب آئیں گے۔۔۔ تو پھر کیا کریں؟ ہم نے پوچھا۔۔۔ اس بات پر دو چوکیدار دفتر کے ایک کونے میں مشورہ کرنے لگے۔۔۔ تم ہمارے طالب علم ہو۔ تمہاری پڑھائی کا حرج ہو رہا ہے۔ ہم تم کو چھوڑ سکتے ہیں، اگر تم یہ وعدہ کرو کہ دوبارہ ہمیں بتائے بغیر رات باہر نہیں گزارو گے اور کل رات کا جرمانہ بھی دو گے۔۔۔ وعدہ تو ہم کر لیتے ہیں۔ لیکن جرمانہ کیا ہے؟۔۔۔ جرمانہ تم دو گے۔ ابھی اتنی ہی بات ہوئی تھی کہ کسی نے آفس کے دروازے پر لات ماری۔ سامنے ملتانی کھڑا تھا۔۔۔ اُسے دیکھ کر دونوں چوکیدار چوکنے ہو گئے۔۔۔ ملتانی! تم یہاں کیا کر رہے ہو۔۔۔ چھوڑو اس کو۔ یہ میرا جگری یار ہے۔ لسٹ میں اس کا نام بھی لکھ لو۔ ماہانہ جرمانے کے کھاتے میں۔ ملتانی غرایا۔۔۔ چوکیدار چپ ہو گیا۔۔۔ ملتانی! یہ ماہانہ جرمانہ کیا ہے، ہم نے وارڈن آفس سے نکلتے ہی سوال داغا۔۔۔ میرے تمام دوستوں کی ایک فہرست

154 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

ہے ان کمبختوں کے پاس۔ ہر مہینے ان کو کچھ نہ کچھ دیتے رہتے ہیں ہم۔۔۔ کس کام کے لئے؟ ہم نے پوچھا۔۔۔ ایک تو یہ ہماری مخبری انتظامیہ کو نہیں کرتے اور دوسرا انتظامیہ کی خبریں ہمیں بروقت پہنچا دیتے ہیں۔۔۔ دیتے کیا ہو تم ہر مہینے؟۔۔۔ کسی چوکیدار کو سگریٹ کے پیکٹ، کسی کو کھانا، کسی کو نقد رقم، کسی کو سینما کے ٹکٹ۔۔۔ ہر کسی کو مختلف سپلائی کیوں؟۔۔۔ ہر چوکیدار کی اپنی اپنی ضروریات ہیں۔ جو ہم فراہم کر دیتے ہیں اور مختلف اس لئے بھی رکھتے ہیں کہ ہر چوکیدار کی حقیقت واضح ہو جائے۔۔۔

شبیر عادل ہمارے سینئر تھے۔ بے حد خلیق انسان تھے۔ ہمیں چھوٹے بھائیوں کی طرح رکھتے۔ کبھی نوٹس لکھ کر دے رہے ہیں۔ کبھی کھانا کھلا رہے ہیں۔ بخار ہو جائے تو دوائی لانا بھی اُنہی کے ذمے ہے۔ ملتانی سے بھی دو سال سینئر تھے۔ مروت اور خوش سلیقگی شبیر عادل پر ختم تھی۔ ملتانی کو سمجھاتے رہتے کہ پڑھائی کی طرف توجہ دو۔ جواباً ملتانی اس معاملے کو نظریاتی قرار دے کر دنوں بلکہ ہفتوں تک بحث کرتا۔ شبیر عادل کہتے کہ پہلے پڑھائی کر لو، بعد میں تمہارے جتنے اشکالات ہیں سب رفع کر دوں گا۔ لیکن ملتانی کا جواب تھا جب تک حقیقت واضح نہیں ہو جاتی، کتابوں کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔۔۔۔۔ شبیر عادل کہتے، تمہاری حقیقت کے واضح ہونے تک تم فیل ہو چکے ہو گے۔۔۔۔۔ ملتانی یکا یک ماضی میں ان تمام عبقریوں کا حوالہ دے دیتا جو تعلیم کے میدان میں ناکام ہوئے، سکول کالج والوں نے انہیں نکال دیا لیکن انہوں نے ایسے کارہائے نمایاں کئے کہ تاریخ بدل دی۔ آئن سٹائن کو بھی کالج والوں نے نالائق قرار دیا تھا۔ لیکن اُس نے تو سائنس ہی بدل کر رکھ دی۔۔۔ اسی بحثا بحثی میں شبیر عادل کے والد فوت ہو گئے اور وہ گھر چلے گئے۔۔۔ ملتانی یونیورسٹی سے لڑکوں کی ایک بس بھر کر جنازے اور سوئم کے لئے گیا۔ وہاں شبیر عادل کے گھر کے حالات سے مزید آگاہی ہوئی۔ معلوم ہوا کہ شبیر عادل کے چھ بھائی اور پانچ بہنیں ہیں۔ اور سوائے اُس کے کوئی بھی یونیورسٹی میں نہیں پہنچ سکا۔ کسی نے دکان کھول رکھی ہے تو کوئی بے روزگار ہے۔ ان

155 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

حالات میں شبیر عادل جیسا ہنس مکھ، بااخلاق اور شفیق ہونا غیر معمولی واقعہ تھا، کم از کم ہمارا تو یہی خیال تھا۔ اگلے روز کیفے میں شبیر عادل ہی موضوع گفتگو رہا۔ کسی دل جلے نے نجانے کیوں شبیر عادل کے گھر کے حالات کی طرف بات کا رخ موڑ دیا۔ تو چند دانشوران کا خیال تھا کہ زیادہ بچے ہونے کی وجہ سے اُن کے گھر میں بے شمار مسائل ہیں۔ ملتانی نے یہ نکتہ پکڑ لیا کہ کثرتِ اولاد سے نہ صرف گھر بلکہ معاشرہ بھی تباہ ہو سکتا ہے۔۔۔ چند دن بعد معلوم ہوا کہ ملتانی شبیر عادل کے گھر گیا تھا۔ وہاں کچھ قضیہ ہوا ہے اور ملتانی کو گھر سے دھکیل کر نکال دیا گیا ہے۔۔۔ ہم نے کیفے میں ملتانی سے پوچھا۔ کیا ہوا تھا۔ کہنے لگا۔۔۔ میں ایک نظریاتی مسئلے پر گفتگو کے لئے شبیر عادل کے گھر گیا تھا۔ اُن کی والدہ سے ملنے۔۔۔ والدہ سے ملنے! کیا مطلب؟ اُن سے کیا بات کرنا تھی اور وہ بھی نظریاتی؟ ہمیں کچھ سمجھ نہ آیا۔۔۔ وہ دراصل شبیر عادل جیسا پیارا انسان اس دنیا میں نہیں ملتا۔ میں اُس کے گھر کے حالات سے سخت پریشان تھا۔۔۔ تو؟ ہم نے بے صبری کا مظاہرہ کیا۔۔۔ تو یہ کہ اُن کے گھریلو حالات کی خرابی کی اصل وجہ کثرتِ اولاد ہے۔۔۔ میں نے شبیر عادل کی والدہ کو بتایا کہ آپ کے حالات اس لئے خراب ہیں کہ آپ کثیر الاولاد ہیں۔ سوائے شبیر عادل کے آپ کے کسی دوسرے بچے نے کوئی قابلِ ذکر کام نہیں کیا کیونکہ کثرتِ اولاد کی وجہ سے آپ اُن کی مناسب تربیت نہیں کر سکیں۔۔۔ کیا؟ ملتانی تم نے شبیر عادل کی والدہ سے یہ کہا تھا۔۔۔ بالکل میں نے وہی کہا جسے حق سمجھا۔۔۔ ملتانی تمہیں اس طرح کے خالصتاً گھریلو اور ذاتی معاملے میں ٹانگ اڑانے کی کیا ضرورت تھی، ہم نے احتجاج کیا۔۔۔ ضرورت تھی مجھے اور اب بھی ہے۔ کیوں کہ شبیر عادل اور اُس کے گھر کے مسائل میرے مسائل ہیں۔ مخلص دوستوں کا فرض ہے کہ اپنے ساتھیوں کے مسائل کا مکمل تجزیہ کریں اور پھر انہیں حل کریں۔ اور اس سے بھی زیادہ اہم یہ ہے کہ کثرتِ اولاد سے شبیر عادل کے گھر والے ہی اکیلے پریشان نہیں ہیں بلکہ اس کے بہن بھائیوں نے معاشرے میں بگاڑ پیدا کر رکھا

156 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

ہے۔ کسی نے ڈھنگ کا کام نہیں کیا، معاشرے پر بوجھ ہے ایسی کثرتِ اولاد۔۔۔ اس نکتہ نظر پر ہم ذرا پیچھے ہٹے۔۔۔ لیکن ملتانی تمہارے بھی تو آٹھ نو بہن بھائی ہیں۔ ہم نے دوسرا محاذ کھولا۔۔۔ ہاں ہیں۔ تو یہی چیز میں اپنی والدہ اور والد سے بھی کہتا رہتا ہوں۔۔۔ کیا؟ تم اپنے والدین سے اپنے بہن بھائیوں کی زیادہ تعداد پر بات کرتے رہتے ہو۔ اُف خدایا۔ ہم نے سر پکڑ لیا۔۔۔ تو اس بات پر شبیر عادل کے گھر والوں نے تمہیں گھر سے نکالا ہوگا۔ ہم پر حقیقت واضح ہو گئی۔۔۔ نہیں، اس بات پر وہ طیش میں آئے پر چُپ رہے۔۔۔ پھر؟۔۔۔ پھر یہ کہ میں نے مزید حقیقت بیان کی۔ وہ یہ کہ اب جتنے بھی بچے آپ نے پیدا کئے ہیں، اُن کو تو اسی جہان میں رہنا ہے۔ لیکن مجھے خدشہ ہے کہ آپ مزید غلطیوں کا ارتکاب نہ کر بیٹھیں۔۔۔ مزید غلطیاں کیا؟۔۔۔ جی، اصل بات یہ تھی جو میں کرنے گیا تھا۔۔۔ مزید یہ کہ کہ شبیر عادل کی والدہ کہیں دوسری شادی نہ کر لیں۔ اُس صورت میں مزید بچے پیدا ہو سکتے ہیں۔ یہی میں نے اُن سے کہا جس پر اُن کے گھر والے بلا وجہ آگ بگولہ ہو گئے، اور مجھے گھر سے دھکیل دیا۔۔۔ ہمیں تو جیسے سانپ سونگھ گیا ہو، چپ چاپ ملتانی کو دیکھتے رہے۔۔۔ چائے لانا، دو کپ چائے۔ ملتانی نے آواز دی۔۔۔ چائے پینے کے بعد، ہم نے پوچھا کہ ملتانی تم نے یہ دوسری شادی والی بات شبیر عادل کی والدہ سے کیوں کی تھی۔۔۔ ملتانی بولا۔ اس لئے کی تھی کہ اُنہیں آنے والے حالات سے آگاہی ہو اور اُن پر حقیقت واضح ہو جائے۔۔۔

تو ایک مرتبہ سالانہ دنگ فساد ہوا یونیورسٹی میں۔ سالانہ اس لئے کہ چھوٹے چھوٹے جھگڑے تو روز ہوتے۔ ان میں سے کچھ چند دنوں میں ختم ہو جاتے اور کچھ چلتے رہتے اور سالانہ دنگ فساد پر ختم ہوتے۔ پہلے پہل بحث ہوتی، پھر گالیاں دی جاتیں۔ گھونسنے، لائیں چلتیں۔ لائٹیوں کے ساتھ رزم حق و باطل سبقتی جو سال چھ مہینے کے بعد ایک دو شہادتوں پر تمام ہوتی۔ ہمارا اور ہمارے دوستوں کا ان کاموں کی پہلی اسٹیج تک ہی حصہ

157 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

ہوتا۔ جونہی بات بحث سے آگے بڑھتی۔ ہمارے دوست جن کے سرخیل ملتانی تھے اگلے مراحل سے کنارہ کشی اختیار کرتے اور ایک نئی بحث ایجاد کر لیتے۔ یوں ماورائے بحث مراحل ہمارے لئے شجر ممنوعہ ہی رہے۔ ایک مرتبہ ایسے ہی ایک فائل شو، جس میں ایک لڑکا مارا گیا، کے بعد سب لوگ اپنے اپنے بیگ اٹھائے گھروں کو بھاگ رہے تھے کہ ملتانی اور اُس کے حلقے کے لوگوں کو یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ اگر ایک آدھ مہینہ گھر قیام کرنا پڑا تو تدبیر و تفکر کہاں ہوگا۔ کیونکہ دنیا میں واحد جائے تدبیر تو بھولا کنشین ہی تھی۔ اور اگر یہ نہ ہوا تو بقول ملتانی کے حقیقت کیسے واضح ہوگی۔۔۔ جب سب لوگ ہاسٹل سے بیدخل کر دیے گئے تو ناچار ہم اور ملتانی بھی اپنا اپنا بھاری بھر کم بیگ کندھوں پر لادے پیدل جا رہے تھے کہ یونیورسٹی کے گیٹ نمبر دو سے کوئی سواری مل جائے تو ریلوے اسٹیشن پہنچ سکیں۔ بات صرف بیگ تک ہی محدود ہوتی تو کوئی مسئلہ نہ تھا۔ ملتانی نے ایک بستر بند اور ایک سوٹ کیس بھی اٹھا رکھا تھا۔۔۔ ملتانی یہ بستر کیوں لے کر جا رہے ہو۔ کیا گھر میں بستر نہیں ہے تمہارے سونے کے لئے، ہم نے گستاخی کی۔۔۔ بات یہ نہیں، بستر اس لئے لے کر جا رہا ہوں کہ دو چار دنوں کے بعد گھر میں دل نہیں لگے گا۔ تو کسی طرف نکل جاؤں گا۔۔۔ مثلاً کدھر؟۔۔۔ امجد حمید کے گھر ساہیوال۔ دو دن وہاں رہ کر امجد کو ساتھ لے کر سلطان کے پاس بہاولپور۔ وہاں تاریخ بکھری پڑی ہے۔ ہفتہ دس تو وہیں رہ لوں گا۔ وہاں سے یا سر کا گھر پاس ہی ہے احمد پور شرقیہ، کافی عرصہ ہوا۔ اُس کا کچھ اتا پتا نہیں۔ اُس کی خبر لوں گا۔ اتنے دنوں میں اگر یونیورسٹی کھل گئی تو واپس بھولا کنشین پر۔۔۔ اور اگر نہ کھلی تو؟ ہم سے پھر رہا نہ گیا۔۔۔ تو بستر بند ہے میرے پاس۔ تبلیغ کے لئے ہفتہ دس دن کے لئے چلا جاؤں گا۔۔۔ جاتم تبلیغ پر رہے ہو تو ساتھ میں یہ سوٹ کیوں رکھے ہیں۔۔۔ سوٹ تو کوئی نہیں رکھے میں نے۔۔۔ ہیں! تو پھر سوٹ کیس کس لئے ہے۔۔۔ وہ سوٹ کیس میں سفری خیمہ تہہ کر کے رکھا ہے۔۔۔ سفری خیمہ؟ وہ کیوں۔۔۔ یونیورسٹی کا کیا پتہ تبلیغ کے بعد بھی نہ کھلے۔

158 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

تو پھر میں ٹھنڈیانی، ایبٹ آباد، شوگراں نکل جاؤں گا۔ راتیں خیمے میں ہی گزریں گی۔۔۔ ہم ملتان کی منصوبہ بندی پر ہکا بکا رہ گئے۔۔۔ اچھا! پر جوڑا تو تم نے لیا کوئی نہیں۔ پہنو گے کیا؟۔۔۔ اُس کی فکر نہیں۔ کیونکہ سوٹ کیس میں جگہ ہی نہیں تھی۔ اس لئے میں نے تین تین پتلونیں اور شرٹیں پہنی ہوئی ہیں۔ اوپر نیچے۔ ان کی ترتیب ہر روز بدل لیا کروں گا۔۔۔ اتنے میں ایک گاڑی دھم سے ہمارے پاس رک گئی۔ ایک پروفیسر صاحب چلا رہے تھے۔ انہوں نے کمالِ شفقت سے کہا۔ غالباً تم دونوں ہمارے طلباء ہو اور یونیورسٹی بند ہونے کی وجہ سے گھروں کو جا رہے ہو۔۔۔ ہم نے اثبات میں سر ہلایا۔۔۔ سامان تو بہت ہے تمہارے پاس، انہوں نے ملتان کا بغور جائزہ لیتے ہوئے کہا۔۔۔ اتنا سامان اٹھانا بہت مشکل ہے۔ گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ میں تمہیں ریلوے اسٹیشن پہنچا سکتا ہوں۔۔۔ اس پیشکش کو کیسے رد کر سکتے تھے کہ ملتان کا سامان اٹھا کر چلنا بے حد مشکل ہو چکا تھا۔۔۔ سامان ڈگی میں رکھا، اور ہم گاڑی میں گھس گئے۔۔۔ سخت گرمیوں میں بار برداری سے نجات کے ساتھ ہی گاڑی کی بے حد نرم اور صوفہ نمائشستوں پر بیٹھے اور ایئر کنڈنشر نے جب ٹھنڈی ہوا فراہم کی تو ہم نرگ سے سورگ میں جا پہنچے۔۔۔ ملتان کی سرعت خیالی کا تو خیر نرگ کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔ اب اس کے ساتھ وسعت و عمق خیالی بھی مل گئی سورگ میں۔۔۔ ملتان کی ہی لغت میں اس مقام کا مختصر نام حماقت خیالی ہے۔۔۔ ابھی گاڑی کو دوسرا گنیر بھی نہیں لگا کہ ملتان نے پوچھا۔۔۔ سر! ایک مشورہ کرنا تھا آپ سے۔۔۔ ہم مشورہ پر چونکے۔ کیونکہ نصیحت، وصیت، راہنمائی اور ملتے جلتے لفظوں کا استعمال ملتان نہیں کرتا تھا۔ جب کوئی صورت نہ ہوتی ان لفظوں سے بچنے کی تو مشورہ کا لفظ ٹانکتا اپنی گفتگو میں۔۔۔ پروفیسر صاحب کا تعلق ہمارے شعبے سے نہ تھا۔ اسی لئے ہم انہیں جانتے نہ تھے۔ اور ان کا تو ہمیں جاننے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔۔۔ انہوں نے پہلے توقف کیا پھر کراہت سے کہا۔۔۔ کیا مشورہ کرنا ہے تم نے؟۔۔۔ جی سر! آپ کا تجربہ وسیع ہے۔ عملی زندگی کے

159 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

نشیب و فراز کا بخوبی علم ہے آپ کو۔ مشورہ یہ کرنا ہے کہ میں وفاقی حکومت کا مقابلے کا امتحان دے دوں اسی سال۔۔۔ ہمیں ملتان کے ساتھ رہتے ہوئے کافی عرصہ گزر چکا تھا۔ لیکن اس مشورہ طلبی کا ہمارے فرشتوں کو بھی علم نہ تھا۔ کہ ملتان کے خیالات کی حدیں کہاں کہاں تک پھیلی ہوئی ہیں۔۔۔ پروفیسر صاحب کو پہلے تو سانپ ہی سونگھ گیا۔ چند لمحے بعد اُن کی چہرے کی کراہت طیش میں بدلتی نظر آئی۔ لیکن انہوں نے اپنے جذبات پر قابو کرتے ہوئے بمشکل اپنی آواز کو معتدل رکھا اور کہا۔۔۔ تمہارا نام ملتان ہے؟۔۔۔ ہمیں حیرت اور ملتان کو خوشی ہوئی اس ردِ عمل پر۔۔۔۔۔۔۔ جی، جی سر! عبدالحمید شیرازی ملتان۔۔۔ ہوں، ہوں۔۔۔ تو تم ملتان! مقابلے کے امتحان میں بیٹھو گے!!۔۔۔ ہوں، ہوں۔۔۔ انجیئرنگ کے سالانہ امتحان میں دس مضامین ہوتے ہیں۔ اور بیس امتحان۔ ہر مضمون کا ایک تحریری امتحان ہوتا ہے اور ایک زبانی۔۔۔ اب تک کتنے امتحانات میں تم پہلی کوشش میں کامیاب ہوئے ہو؟ پروفیسر صاحب نے کریدا۔۔۔ یہ استفسار نا معقول ہے۔ ملتان نے ہمارے کان میں اپنا نکتہ نظر واضح کیا۔۔۔ انجیئرنگ کے امتحانات کا مقابلے کے امتحان کے ساتھ تعلق نہیں ہے۔ ملتان نے نے گلا صاف کرتے ہوئے وضاحت دی۔۔۔ کورس کے مندرجات کا تو تعلق نہیں ہوگا۔ لیکن پڑھنا لکھنا تو مشترک ہے۔ وہ کون کرے گا؟۔۔۔ اس جواب پر ملتان ذرا جھینپ گیا۔۔۔ تو کتنے مضامین تم نے سالانہ امتحان میں پاس کئے اور کتنے ذیلی امتحان میں؟۔۔۔ یاد نہیں۔ ملتان نے لا تعلقی دکھائی۔۔۔ دس میں سے نو مضامین۔ پروفیسر صاحب کے جواب پر ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ نمبر کتنے ہیں ہر مضمون میں۔ بمشکل تینتیس۔ اور وہ بھی پاس تم نے نہیں کئے یونیورسٹی نے فیصلہ کیا تھا کہ تم جیسے طالب علموں سے جان چھڑائی جائے۔ کیونکہ یہی واحد راستہ تھا باقی طلباء کو پڑھائی کی طرف لانے کا۔۔۔ اب ہمیں معلوم ہوا ملتان کی حالیہ امتحانی کامیابیوں کا راز کیا ہے۔ یہی وہ کامیابیاں تھیں جن سے شبہ پکڑ کر ملتان نے مقابلے کے امتحان کی ٹھانی تھی۔۔۔ لیکن

160 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

سر! یہ بات تو آپ مانتے ہی ہوں گے کہ پڑھائی میلانِ طبع کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ اور اگر ہوگی تو صرف رٹا ہی ہوگا۔ جس کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہاں جو طلباء کم نمبر لیتے ہیں۔ اُن کی اکثریت عملی زندگی میں بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ ہمارے دوست تھے۔ شاہد مگھیانہ۔ چار سالوں کی ڈگری آٹھ سالوں میں کی انہوں نے۔ اب انجینیئرنگ مپنی چلا رہے ہیں۔ اُن کے کئی ہم جماعت جنہوں نے میڈل لئے تھے۔ اسی کمپنی میں جاب کر رہے ہیں۔ ملتانی نے بھرپور دفاعی صلاحیت کا مظاہرہ کیا۔۔۔ جی ہاں مگھیانہ کی کمپنی اچھا کام کر رہی ہے۔ پر ایک حقیقت اور بھی ہے اس کے بالکل ساتھ۔ کہ تم سے پہلے مگھیانہ بھولا کنٹین پر منڈلی لگا تا رہا پورے آٹھ سال۔ اُس کے تمہاری طرح کے جگری یار دس بیس نہیں سینکڑوں ہیں جو سب کے سب جوتے چٹختے پھرتے ہیں اور مگھیانہ اُن کی بجائے میڈل لینے والے ہم جماعتوں کو اپنی کمپنی میں رکھتا ہے کیونکہ اُس نے اب کمپنی چلانا ہے نہ کہ بھولا کنٹین۔۔۔ ویسے ملتانی! لوگ کہتے ہیں کہ بھولا کنٹین والے کو تم بھی دوسروں کی دیکھا دیکھی چاچا کہتے ہو۔ حالانکہ وہ تمہارا چاچا نہیں، ابا ہے۔ تم جو سارا دن وہاں لڑکوں اور لڑکیوں کو لئے بیٹھے رہتے ہو۔ دراصل اپنے ابا کی کاروبار چلانے میں مدد کرتے ہو۔ لڑکے لڑکیاں دن رات بیٹھیں گے وہاں تو ہی بھولے کی بکری ہوگی۔۔۔ ملتانی اور ہم اس اگلے قدموں والی شاٹ کو ایسے ہی دیکھتے رہے جیسے کرکٹ فیلڈر چھکے والی سر کے اوپر سے جاتی ہوئی گیند کو دیکھتے ہیں۔۔۔ کتنا دور رہ گیا ریلوے اسٹیشن۔ ملتانی نے ہم سے یوں پوچھا جیسے ہم نے اسٹیشن کو پرے دھکیل رکھا ہو۔۔۔ اب ہم میں تو گفتگو کی ہمت نہ رہی۔ لیکن وہ ملتانی ہی کیا جو نچلا ہو کر بیٹھ جائے۔۔۔ لگتا ہے ٹریفک زیادہ ہے۔ اس لئے اسٹیشن پہنچنے میں زیادہ وقت لگ رہا ہے۔۔۔ لیکن سر! مقابلے کے امتحان کے بعد امیدواران انتظامیہ، پولیس، خارجہ، مالیات، محصولات جیسے اہم ترین محکموں میں اعلیٰ عہدوں پر تعینات ہوتے ہیں۔ اور یہی وہ جگہیں ہیں جہاں سے ملک اور عوام کی تقدیر بنائی یا بگاڑی جاسکتی ہے۔ ان محکموں اور ان کے کاموں کی

اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ ہمیں اپنی تمام تر صلاحیتیں صرف کر کے ملک و قوم کی تقدیر بدلنے کے لئے یہیں جانا چاہیے۔ اصل مقصد یہ ہے مقابلے کے امتحان میں بیٹھنے کا۔ اب ملتان قومی ٹیچ پر کھیلنے لگا۔۔۔ ہاں، یہ محکمے تو اہم ہیں۔ پر تم تو ان سے بھی زیادہ اہم محکمے میں تعینات ہو گے مقابلے کے امتحان کے بعد۔ اب پروفیسر صاحب نے ملتان کی شہرہ رگ پر ہی ہاتھ رکھ دیا۔۔۔ ان سے بھی زیادہ اہم، وہ کونسا محکمہ ہے سر! ملتان کا تجسس دیدنی تھا۔۔۔ بھولا کنٹین، جہاں تم تعینات ہو پچھلے کئی برسوں سے۔ یہیں دوبارہ ہو جاؤ گے۔ تاکہ آنے والی نسلیں فیضیاب ہوں چشمہ تفکر و تدبر و سخنِ حماقت سے۔۔۔ اس پر ملتان مسکرا دیا۔ اور آیا اپنے اصلی رنگ پر۔۔۔ سر! آپ جو بھی کہہ لیں۔ امتحان میں دوں گا اسی سال اور کامیاب ہو کر آؤں گا مٹھائی لے کر آپ کے پاس۔۔۔ ملتان! مقابلے کے امتحان میں بیٹھنے کے لئے کم از کم گریجویشن ہونا لازمی ہے کسی مضمون میں۔ جو تم سے اگلی ایک صدی میں ہوتی نظر نہیں آتی البتہ ایک نیا قانون آیا جس کے تحت یونیورسٹیوں کے چائے خانوں پر کم از کم پانچ سال رواز نہ سولہ گھنٹے بیٹھنے والوں کو گریجویشن کے برابر مان لیا گیا ہے۔ لیکن ہر چائے خانے کے لئے یہ قانون نہیں ہے۔ ایک ضمیمہ ہے اس قانون کا جس میں اُن چائے خانوں کے نام درج ہیں جن کو تسلیم کیا گیا ہے۔ اس فہرست میں سب سے اوپر بھولا کنٹین لکھا ہوا ہے۔ تو تم امتحان تو دے سکتے ہو پر نتیجہ آنے کے بعد تعیناتی تمہاری ہوگی اسی کنٹین میں۔۔۔ پھر اسٹیشن تک ہم اور ملتان گاڑی سے باہر سڑک کنارے بازاروں، دکانوں، ٹھیلوں کو ہی دیکھتے رہے۔۔۔ یار ملتان! کیا ضرورت تھی پروفیسر صاحب سے یہ تذکرہ کرنے کی۔ خواہ مخواہ ہماری حقیقت واضح ہوگئی۔۔۔ ہم نے ملتان کی دلجوئی کے لئے ہماری حقیقت کہا تھا ورنہ ہم تو سارا رستہ ملتان اور پروفیسر صاحب کا مکالمہ سنتے ہوئے دم بخود رہے تھے۔۔۔ نہیں ہمدِ دیرینہ ہماری حقیقت واضح نہیں ہوئی۔ ملتان نے علامہ اقبال بننے کی کوشش کی۔۔۔ تو کیا ہوا پھر؟ ہم نے پلیٹ فارم کے بیچ پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔۔۔ اصل

162 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

میں پروفیسر صاحب کا سارا زور اس پر تھا کہ میں پڑھتا کیوں نہیں اور بھولا کنٹین پر کیوں بیٹھتا ہوں۔ ملتانی نے کہا۔۔۔ بات تو غلط نہیں۔۔۔ ہم نے پھر حقیقت واضح کرنے کی کوشش کی۔۔۔ غلط، بالکل غلط بلکہ سرتا پا غلط۔۔۔ کیسے؟۔۔۔ ایسے کہ پروفیسر صاحبان اس قابل ہوتے ہی نہیں کہ ہم ایسے عالی دماغوں کو لیکچر اور کلاسوں میں کھینچ سکیں۔ ان کے پاس کتابیں اور نوٹس ہوتے ہیں اور وہ بھی اُس زمانے کے جب پتھر پر پتھر مار کر آگ جلائی جاتی تھی۔ اس سے آگے ان کے پاس کچھ نہیں ہوتا۔ آج کا دور کیا ہے، اس کے تقاضے کیا ہیں۔ دورِ حاضر میں زندہ رہنے اور ترقی کرنے کے لئے مکالمہ اور گفتگو کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ پروفیسروں کو اس کا ذرا بھی ادراک نہیں۔ تو یہ کیا خاک تعلیم و تربیت کریں گے مستقبل کی نسلوں کی۔ الٹا یہ ان کو ماضی بعید میں بھیج کر دم لیں گے۔ بہتر ہے یونیورسٹیوں میں اساتذہ، کتابیں اور امتحانات کا نظام یکسر تبدیل کیا جائے اور مکالمہ، گفتگو اور تفکر و تدبر کو رواج دیا جائے۔۔۔ آج گاڑی کے دوران جو بات چیت ہوئی اُس سے یہ حقیقت بالکل واضح ہوگئی کہ پروفیسروں، کتابوں، لیکچروں سے کچھ نہیں ہوگا۔ یہ دقیانوسی طریقے بدلنا ہوں گے ورنہ ہماری داستان تک نہ ہوگی داستانوں میں۔۔۔۔

ملتانی کے ساتھ عمر ایسے گزری کہ ہر روز نیا قصہ، نیا قضیہ ہوا۔ بھولا کنٹین پر ایک روز دوپہر کے وقت ملتانی اکیلا ہی بیٹھا تھا۔ اُس کے سارے سنگی ساتھی ابھی نہیں پہنچے تھے۔ وہ بھولے سے گپ شپ کر رہا تھا کہ ایک درمیانے قد و قامت اور تیکھے نین نقش والی لڑکی آئی اور بڑے ادب سے بھولے کو سلام کیا۔ بھولے نے محبت سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اپنے پاس ہی بٹھا لیا۔ یونیورسٹی میں کوئی لڑکا یا لڑکی پڑھتی ہو اور ملتانی اُسے جانتا نہ ہو۔ ایسا کم ہی ہوا تھا۔ لیکن یہ بالکل نیا چہرہ تھا۔ بھولا اُس سے اُس کے خاندان والوں کا احوال پوچھتا رہا۔ جوس پلایا، کھانا کھلایا۔ پھر چائے بھی اصرار کر کے پلائی۔ اُس کے جانے کے بعد ملتانی نے پوچھا۔ بھولے یہ کون تھی؟۔۔۔ اس لڑکی کا

163 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

باپ ہمارے گاؤں کا ہے۔ بھولا بولا۔ کئی سال پہلے یہ لوگ لاہور آ گئے تھے۔ یہ کالج میں پڑھتی ہے۔ سال دو سال بعد یہ اپنے خاندان کے ساتھ گاؤں آتی رہتی ہے۔ اس طرح یہ میری بھتیجی ہی لگی اور میں اس کا چاچا۔۔۔ گھر کدھر ہے اس کا؟۔۔۔ یہیں ہے لاہور میں۔۔۔ لاہور میں کہاں۔۔۔ نہر پر جائیں تو آگے آتا ہے۔۔۔ نہر پر تو بہت کالونیاں ہیں۔۔۔۔۔ کالونی کے نام کا تو مجھے پتہ نہیں، میں تو سائیکل پر جاتا ہوں ان کے گھر۔ کہاں سے کس سڑک پر جانا ہے۔ یہ یاد ہے مجھے۔۔۔۔۔ پر ملتان کی تم کیوں پوچھ رہے ہو؟۔۔۔۔۔ کچھ نہیں، میں تو حیران تھا کہ یہ کون ہے جسے میں نہیں جانتا۔۔۔۔۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ لیکن ملتان کے دماغ سے نجانے کیوں وہ لڑکی نہیں نکلی۔ بلکہ دماغ سے تو کیا نکلنا تھا، اعصاب پر ہی سوار ہوگئی۔۔۔۔۔ چند دنوں کے بعد اُس نے باتوں باتوں میں بھولے سے پھر اُس کا ذکر کیا تو معلوم ہوا۔ اس کا نام صاعقہ ہے۔ والدین کی اکلوتی اولاد ہے۔ اور گھر والے آجکل اس کے رشتے کے لئے سوچ بچار کر رہے ہیں۔۔۔۔۔ ڈگری کرنے کے بعد، بقول ملتان کے اب وہ فارغ تھا۔ لیکن اس کے سینکڑوں ہزاروں دوستوں میں سے ہمیں تو ایک بھی ایسا نہ ملا جو فراغت کا ڈگری کے ساتھ تعلق مانتا ہو۔ یہ بات تمام پیشہ ور بحث بازوں کے ہاں متفق ”علیہ تھی کہ لیکچرز، امتحانات، کلاسیں اس قابل نہیں ہیں کہ ملتان جیسی قد آور شخصیت کی فراغت میں معمولی مداخلت بھی کر سکیں۔ ان کے خیال میں ملتان فارغ تھا، ہے، رہے گا اور اپنے سینکڑوں دوستوں کو بھی گھر بار نوکری کا روبرو سے فارغ کروا کے دم لے گا۔۔۔۔۔ دو تین ماہ گزرے تو ایک دوپہر بھولا کنشین پر لڈوؤں کا ایک ٹوکرا آیا اور ساتھ ہی ملتان بھی۔ موٹر سائیکل سے اترتے ہی دھماکہ کیا کہ اُس کی صاعقہ سے نسبت طے ہوگئی ہے۔ سب احباب منہ میٹھا کریں، بسم اللہ۔۔۔۔۔ نسبت طے ہونے کا مطلب ہے کہ اب شادی بھی ہوگی اور یوں ملتان دنیا کے دھندوں میں کھو جائیں گے۔ یہ بات کسی کو ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟۔۔۔۔۔ پھر یہ ہوا کہ بات چیت کا موضوع ملتان کی نسبت ہی رہا۔ ایک رائے یہ تھی

کہ بھولے نے یہ جال بُنا ہے۔ اور مقصد اُس کا یہ ہے کہ سالہا سال بیت گئے۔ ملتانی اور اُس کا ٹولہ بھولا کنٹین کی کرسیاں توڑتا رہتا ہے۔ کنٹین کا کاروبار تبھی ترقی کر سکتا ہے اگر ان سے جان چھڑائی جائے اور جان ایسے ہی چھوٹ سکتی ہے کہ ملتانی کو ایسے دھندے میں پھنسا ئیں جس سے یہ چاہے بھی تو نکل نہ سکے۔ ایک مرتبہ شادی ہو جائے تو نیپولین بونا پارٹ ایسوں کی ایسی تیزی ہو جاتی ہے۔ ملتانی کیا چیز ہے۔ اس رائے کے پیچھے سنا ہے کہ بھولے کی سوچ نہیں بلکہ ملتانی کے کسی ایسے بحث باز یار نے بھولے کو یہ درس دیا تھا جس کے ساتھ اُس کی نظریاتی چشمک تھی۔۔۔ دوسرا گروہ وہ تھا جس کے ملتانی کے ساتھ گھریلو تعلقات تھے۔ انہوں نے کہا کہ ملتانی کی بچپن میں منگنی طے ہو چکی تھی۔ موصوفہ چچا زاد ہیں۔ اور بس قبول صورت ہیں۔ اور یہ کہ اس منصوبہ بندی میں ملتانی کی اماں بھی شامل ہیں جو اُس کا رشتہ کسی صورت میں اُسکے چچا کے گھر کرنے پر راضی نہیں ہیں۔ ان حالات میں اس نے والدہ کی در پردہ حمایت کے ساتھ یہاں نسبت طے کر لی ہے۔ اس گروہ کا خیال تھا کہ شادی اور منگنی بیک وقت شہر کے ساتھ گاؤں میں بھی نباہی جاسکتی ہے یعنی بچپن کی منگنی ٹوٹی نہیں ہے دوسری منگنی کر لینے سے اور یہ کہ ابھی کم از کم دو مزید کامیاب منگنیوں کا کوٹہ پڑا ہے ملتانی کے پاس۔ اس گروہ کے اکثر لوگ قمیض کے ساتھ شلوار پہنتے تھے پرٹخنوں سے اوپر اوپر۔۔۔ ایک تیسرا گروہ بھی تھا، جس کے نزدیک معاشیات ہی دنیا کے ہر معاملے کی بنیاد ہوتی ہے۔ ملتانی برس ہا برس سے اسی نکتہ نظر کا پر چارک رہا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ اس مکتب فکر کے لوگ ملتانی کی فکر کی بجائے اُس کے افعال، جنہیں وہ بانگِ دہل کرتوت کہتے تھے، کو معاشیات سے جوڑتے تھے۔۔۔ حیرت کی بات ہے بالعموم بھولا بھی اس خطرناک حد تک پڑھے لکھے لوگوں کے گروہ میں شامل تھا کیونکہ ملتانی نے اُس کے سالہا سال کے واجبات ادا نہیں کئے تھے۔ اس گروہ کی رائے تھی کہ چچا زاد ہونا یا قبول صورت ہونا اصل معاملہ نہیں ہے۔۔۔ حقیقت میں معاشیات نے یہ فیصلہ کروایا ہے۔ چچا زاد کے ساتھ ملتانی

165 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

شادی کرتا تو اسے کوئی جائیداد نہ ملتی۔ الٹا اسکو چھ سالیوں کی اُن کے خاوندوں اور بچوں سمیت دیکھ بال کرنا پڑتی۔ اور تین چچا زادوں کو بھی سال میں دو چار مرتبہ تھانے سے چھڑانا پڑتا۔ جبکہ صاعقہ کے پاس جائیداد ہے اور وہ بھی شہری۔ یہیں سے اندازہ لگا لو کہ کارل مارکس کے نظریات کیسے انسانی زندگی کی تشریح کرتے ہیں۔۔۔ اب یہاں عامیوں کو یہ اشکال ہوتا کہ کارل مارکس کے نظریے کی برتری ثابت ہو رہی ہے یا ملتانی کے طرزِ زندگی کا چرچا ہو رہا ہے۔ البتہ بھولا کنٹین کے کہنہ مشقوں کے ہاں یہ دو اوامر تھے ہی نہیں، ایک ہی تھا۔ من تو شدم تو من شدی والا شعر بھی کئی ایک تو پڑھتے پائے گئے۔ صاحبو! بے وقوف دوست سے دانا دشمن بہتر ہے سنا تو تھا۔ پر اس کی عملی صورت یہیں دیکھی۔۔۔ ابھی چند ماہ ہی گزرے ہوں گے ملتانی کی طبیعت میں اداسی آنا شروع ہو گئی۔ ہر وقت رومانٹک رہنے لگا۔ کبھی شعر پڑھ رہا اور سر دھن رہا ہے تو کبھی نئے سے نئے پر فیوم خرید رہا ہے۔ اور کبھی ڈھیروں ڈھیروں گلدستے بھجوا رہا ہے صاعقہ کو۔ اور تو اور ایک دو نئے آنے والے لڑکوں کو تک بندی پر بھی لگا رکھا تھا اُس نے پرانے دوستوں کی نظر بچا کر کہ وہ ایک آدھ غزل، نظم یا رباعی ہی لکھ دیں جو یہ بلا ناغہ بھجواتا تھا شہری صاحبِ جائیداد حسینہ کو۔ ایک دن بھولے نے عین بحثا بحثی کے بیچ میں آکر استغاثہ کر دیا کہ ملتانی جیسا جھوٹا ساری دنیا میں نہیں دیکھا حالانکہ اُس نے دنیا میں سوائے ملتانی کے دیکھا ہی کیا تھا۔۔۔ اُس کا کہنا تھا کہ ملتانی نے انجینیئرنگ کی ڈگری مکمل ہی نہیں کی ہے۔ اور یہ کہ اُس کے پاس میٹرک اور ایف ایس سی کی سند بھی جعلی ہے۔۔۔ پر بھولے تمہیں یہ الہام اچانک کیسے ہوا ہے؟۔۔۔ احباب نے پوچھا۔۔۔ مجھے صاعقہ کے ابا کا فون آیا تھا۔ وہ بہت غصے میں تھے۔ کسی نے خط لکھ کر اُن کو بروقت حالات سے خبردار کر دیا ہے۔۔۔ ملتانی کے لئے یہ خبر بہت بری تھی۔ پہلے وہ طیش میں آیا پھر کئی گھنٹے شدتِ غم سے نڈھال رہا۔ اسی کیفیت میں اُس نے صاعقہ سے رابطہ کیا تو علم ہوا کہ اُن کے گھر کسی نامعلوم شخص نے خط لکھ کر کہا ہے کہ ملتانی کی اسناد جعلی ہیں یا

166 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

پھر سرے سے ہیں ہی نہیں۔۔۔ ہم نے بارہا مشورہ دیا کہ یہ کوئی مسئلہ نہیں، تم اپنی اسناد صاعقہ اور اُس کے گھر والوں کو دکھا دو۔ معاملہ صاف ہو جائے گا۔ لیکن وہ ملتانی ہی کیا جو بات کا وہ زاویہ نہ ڈھونڈے جو دوسروں کی حد خیال سے باہر ہو۔۔۔ کہنے لگا۔ اپنی اسناد دکھا دوں تو بھی مسئلہ چلتا رہے گا۔ جس کسی نے خط لکھا ہے، وہ دوبارہ یہی کام کر سکتا ہے اور یوں یہ نزاع کا عالم ہی رہے گا۔ بہتر ہے چور کو نہیں اُس کی ماں کو ڈھونڈوں۔ اُس نے حیلے بہانوں سے وہ خط صاعقہ کے گھر والوں سے لے لیا۔ اور کئی دن تک محدب عد سے کے ذریعے لکھائی کی شناخت کرتا رہا۔ پھر لکھائی کے ماہرین سے بھی مشورہ کیا۔ اس دوران اُس نے کئی سو دوستوں کے لکھائی کے پرانے نمونے بھی ڈھونڈ لئے۔ جن کا وہ خط کے ساتھ تقابل کرتا رہتا۔ کہتے ہیں ڈھونڈنے سے خدا بھی مل جاتا ہے۔ بالآخر ملتانی نے بھی بات کا سرا تلاش کر ہی لیا۔۔۔ وہ خط لکھا تھا سال اول کے فرحان نے۔ یہ وہی لڑکا تھا جو ملتانی کو رومانوی شعر لکھ کر دیتا تھا۔۔۔ لیکن حیرت اس بات پر تھی کہ فرحان تو ملتانی کے ساتھ مریدوں کی طرح لگاؤ رکھتا تھا، اس نے ایسا کیوں کیا؟۔۔۔ جواب فرحان نے خود ہی دیا۔ اُس کا کہنا تھا کہ ملتانی ایک ایسی شخصیت ہے جس نے یونیورسٹی میں برس برس طلباء و طالبات کی فکری تربیت کی ہے اور وہ یونیورسٹی کے برابر، عین برابر، کی چیز ہے۔ یونیورسٹی صرف کتابی معلومات گھول کر پلاتی ہے۔ اور ملتانی طلباء و طالبات کو زندگی گزارنے کا فن سکھاتا ہے۔ اس لئے ملتانی زندگی کی درس گاہ ہے۔ اور اگر یہ درس گاہ حیات یہاں سے رخصت ہو گئی تو یہاں تو صرف معلومات ہوں گی۔ دانائی۔ بصیرت اور زندگی کی رنگارنگی نہیں ہوگی۔ تو اپنے ہی اس خیال سے متاثر ہو کر فرحان نے خط لکھ دیا ملتانی کے سسرال تاکہ وہ نسبت اور شادی سے بھاگ جائیں اور ملتانی آنے والی نسلوں کی فکری پرورش میں منہمک رہے۔۔۔ اب ملتانی کا طیش پیار میں بدل گیا اور وہ فرحان کے صدقے واری جانے لگا۔ اُس نے کہا کہ وہ صاعقہ اور اُس کے گھر والوں کو معاملے سے آگاہ کر دے گا تاکہ

167 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

من کی بگھیا میں پھر بہار آجائے۔۔۔ ابھی سسرال سے بات نہیں ہوئی تھی کہ ملتانی کے ابا اور چچا زادوں کو نجانے کیسے اُس کی نئی منگنی کی بھنک پڑ گئی۔۔۔ تو ملتانی کے گاؤں سے علی الصبح ایک پلٹن ٹرالی پر سوار ہو کر یونیورسٹی پہنچ گئی۔ ادھر ملتانی اپنے مابعد الطبیعیاتی افکار کی بساط بچھا ہی رہا تھا کہ کرتوں اور دھوتیوں میں ملبوس سر پر پگڑیاں رکھے ہوئے یہ پلٹن بھولا کنٹینر آدھمکی۔ اب ملتانی کا سارا زور اس بات پر کہ یہ پلٹن گاؤں واپس جائے اور وہاں جا کر مذاکرات کرے اور حملہ آور فوج اس بات پر مصر کہ پہلے یہیں پر دھول دھپا کیا جائے۔ اور بعد ازاں ملتانی اپنے نئے سسرالیوں کے گھر اس فوج کے محاصرے میں جا کر پہلے اُن پر اپنے بہکانے کے الزام میں سب و شتم کرے اور پھر اپنی منگنی سے برات کا اعلان کرے۔ فوج اعزا کی مہم کا پہلا حملہ، جسے اُس کا ابا پھینٹی اور ملتانی رزمِ حق و باطل کہتا تھا، تو بغیر مذاکرات کے آنا فانا ہی مکمل ہوا تھا۔ دوسرے مرحلے میں چونکہ ملتانی کا کردار ناگزیر تھا، تو اب حملہ آور فوج کے پاس سوائے مذاکرات کے کوئی چارہ نہ تھا۔۔۔ مذاکرات میں کن چالوں سے حریف کو چت کیا جاتا ہے۔ وہ بھی ملتانی اور اس کے خاندان سے زیادہ کیا کسی کو آتی ہوں گی۔ جب ملتانی کے ابا نے دیکھا کہ وہ کسی طور پر اپنی شہری منگنی کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں تو انہوں نے ترپ کا پتا پھینک دیا۔۔۔ تو میں تمہیں جائیداد سے عاق کر دوں گا۔۔۔ عاق۔ یعنی آپ مجھے عاق کریں گے۔ ملتانی نے بھی جواب دیا۔۔۔ زہے نصیب۔ خوش نصیبی ہوگی میری اگر میں موضع صادق گنج کی ٹیل کی زمین کے تیرہ مرلے اور تین سوسا ہی زمین جس پر پانی چوری کے سات اور مالیہ آبیانہ ادا نہ کرنے کے چار مقدمات زیرِ سماعت ہیں۔ سے لا تعلق ہو جاؤں۔۔۔ اس ردِ عمل پر ابا نے کہا۔ تو ٹھیک ہے تُو نہ جا۔ میں جاتا ہوں ابھی تیرے شہری سسرال کے پاس اور بتاتا ہوں انہیں کہ تیری تو بچپن سے منگنی ہی نہیں نکاح بھی ہو چکا۔ نکاح۔ کب ہوا میرا نکاح۔ ملتانی نے حیرت سے پوچھا۔۔۔ یہ تُو اپنے نئے رشتے داروں کو صفائیاں دینا۔ کہ نکاح ہوا ہے یا منگنی۔۔۔ چل پتر لے چل

168 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

مجھے۔ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔ ملتانی کے ابا نے اس کے چچا زاد کو جانے کا کہا۔۔۔ اس حکمت عملی کا ملتانی کے فرشتوں کو بھی علم نہ تھا۔ اُس نے ابا کی منت سماجت کی۔ ہاتھ جوڑے۔ پاؤں پڑا۔ لیکن بڑے میاں بھی اسی کے ابا تھے۔ اُس سے مس نہ ہوئے اور پوری پلٹن ٹرائی پہ سوار کر کے پہنچ گئے ملتانی کے شہری سسرال کے گھر۔۔۔ وہاں پہنچتے ہی ابا جی نے الزام لگا دیا کہ تمہاری شہر کی آوارہ لڑکی نے ہمارے سادہ اور معصوم لڑکے کو بہکایا ہوا ہے۔ اس بات پر صاعقہ کے گھر والے سخت غصے میں آگئے۔ ساتھ ہی ابا جی نے دوسرا گولہ داغا کہ ملتانی کی منکوحہ تہجد کے وقت اٹھ کر تم لوگوں کے لئے بد دعائیں کر رہی ہے۔ تمہاری صاعقہ کا رشتہ تو کبھی نہیں ہوگا، الٹا اُس کے ماں باپ کی طلاق بھی ہو جائے گی کیونکہ ملتانی کی منکوحہ نے بھانبر شاہ سے عمل کروایا ہے تم لوگوں پر۔ جلد تم سب اپنے انجام کو پہنچے والے ہو۔۔۔ اس پر صاعقہ کی اماں کا طیش غشی میں بدل گیا۔ اور اگلے ہی روز انہوں نے بھولے کو اطلاع بھجوا دی کہ آج سے ملتانی اُن کے لئے مر گیا ہے اور اب لا تعلقی حتمی ہے۔۔۔ اب صاعقہ اور اُس کا خاندان ملتانی سے چھوٹ گیا اور وہ خود اپنے ابا اور گاؤں سے روٹھ گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جو وقت وہ صاعقہ سے ملنے یا ہفتے دو ہفتے بعد گاؤں جانے کے لئے ضائع کرتا تھا، وہ بھی بچ گیا اور وہ پہلے سے زیادہ دلجمعی سے بھولا کنٹین پر طلباء و طالبات کی فکری تربیت کرنے لگا۔ لوگ اس واقعے کا تذکرہ اُس کے سامنے نہیں کرتے تھے کہ کیسی عزت افزائی ہوئی ہے۔ لیکن ملتانی نے خود ہی یہ واقعہ سب کو سنا کر یہ ثابت کرنا شروع کر دیا کہ کیسے بحران سے نکلنے کے بعد بھی زندگی میں مکمل دلچسپی قائم رکھی جاسکتی ہے۔ ملامت، ندامت تو بس کم ظرفوں کا معاملہ ہے۔ بڑا ظرف ہو تو ایسے معاملات سے بالکل پریشان نہیں ہونا چاہیے۔۔۔ پندرہ بیس دن گزرے تو ملتانی نے لفافے سے نکال کر اپنی پہلی جماعت سے لے کر انجیرنگ کی ڈگری کی تمام تصدیق شدہ نقول ہمارے سامنے رکھ دیں۔ تعلیمی اسناد کے علاوہ پیدائش کا سرٹیفیکیٹ اور اپنے والد کے نکاح نامہ

169 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

کی بھی نقول بھی شامل تھیں۔۔۔ پوچھا۔ یہ کیا ہے؟۔۔۔ بتایا۔ یہ تمام کاغذات صاعقہ کے گھر بھجوا رہا ہوں۔۔۔ کہا۔ جب تعلق ہی ختم ہو گیا تو کیا ضرورت ہے۔۔۔ ملتانی کڑک کر بولا۔۔۔ ضرورت تو ہے یہ ثابت کرنے کی کہ ملتانی پیدائش سے لے کر آج تک وہی کچھ ہے جو اُس نے بتایا تھا۔۔۔ کہا، پھر بھی یہ ثابت کر کے کیا ملے گا۔ چھوڑو ان کاغذات کو۔۔۔ ملتانی بولا۔ کاغذات تو جائیں گے، ضرور بالضرور جائیں گے۔ اور آج ہی جائیں گے تاکہ۔۔۔ کیا تاکہ۔ ہم نے ٹوکا۔۔۔ بغیر ایک لمحہ ضائع کئے بولا۔ تاکہ حقیقت واضح ہو جائے۔

170 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

لکھنا کتاب کا



سر! آپ کوئی کتاب کیوں نہیں لکھتے۔ ہم نے استاد محترم کی علم سے لدی ہوئی گفتگو سے جان چھڑانے کی کوشش کی۔ آپ علم کا دریا نہیں، سمندر ہیں۔ جس میں آپ ہم جیسے نالائق شاگردوں کو بلا ناغہ غوطے دیتے ہیں۔۔۔ ہرگز نہیں۔ میں عمر بھر اس حماقت سے بچنے کی بھرپور کوشش کروں گا۔ میں اپنے مخاطب سے بلا واسطہ کلام کرنے کا قائل ہوں۔ میری لکھی ہوئی کتاب پڑھ کر تم جیسے کامل جہلاء میرے خیالات کی غلط تشریح کر سکتے ہیں۔ اور میں ایسی علمی بددیانتی ہرگز برداشت نہیں کر سکتا۔۔۔ لیکن سر! غلط تشریح تو دور کی بات ہے۔ آپ تو ہر ہفتے ایک نئی تھیوری ایجاد کرتے ہیں۔ جس کی پہلی خصوصیت آپ ہی کی ایجاد کردہ پچھلی تھیوری سے اختلاف ہوتا ہے۔ پچھلے مہینے آپ کا خیال تھا کہ معاشرے کی ترقی صرف سائنس و ٹیکنالوجی کی مرہون منت ہے۔ چند دن پہلے آپ کہہ رہے تھے کہ سائنس تو ثانوی شے ہے۔ اصل میں سیاسیات کا میدان ہی سوسائٹی کے لئے سب سے اہم ہے اور آج آپ ارشاد فرما رہے ہیں کہ سوشیالوجی کے علم کی معراج حاصل کئے بغیر، معاشرے کی ترقی تو درکنار اس کا وجود بھی قائم نہیں رہ سکتا۔ آپ کے نیازمند اس فکری اختلاف بلکہ تضاد پر سرپیٹ رہے ہیں۔۔۔ تم جیسے کوڑھ مغز جس چیز کو تضاد کہہ رہے ہیں، وہ دراصل فکری تنوع ہے۔۔۔ اس نکتہ آفرینی پر ہم لا جواب ہو گئے اور موضوع بدلتے ہوئے عرض کی۔ استاد محترم۔ کیا میں کتاب لکھ سکتا ہوں۔۔۔ کیا کہا تم نے۔ تم کتاب لکھو گے۔ قرب قیامت کی ایسی واضح نشانی آج تک دیکھی نہ سنی۔ برخوردار تم پہلے پڑھ کر سمجھنا اور پھر سمجھ کر پڑھنا سیکھو۔ کتاب لکھنا تم

172 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

جیسے ازلی ابدی شاگردوں کے بس کا روگ نہیں ہے۔۔۔ استاد محترم نے توقع کے عین مطابق سرزنش کی۔ جواباً ہم نے، معمول کے مطابق، سوچا کہ جس کام سے استاد محترم منع کر رہے ہیں، وہ یقیناً مفید ہی ہوگا۔ جسے سرانجام دے کر ہم دین و دنیا میں سرخرو ہو سکتے ہیں۔ استاد گرامی کی حوصلہ شکنی اور ڈانٹ ڈپٹ کا اثر یہ ہوا کہ ہم نے کتاب لکھنے کے بارے میں غور و خوض کرنا شروع کر دیا۔

کتاب لکھی جائے۔ اور ایسی لکھی جائے کہ قبلہ استاد محترم کو ہماری فہم و دانش تسلیم کرنا پڑے۔ مگر کتاب کا موضوع کیا ہوگا۔۔۔ موضوع دلچسپ ہونا چاہیے۔ خشک بالکل نہ ہو۔۔۔ سیاست کے بارے میں کیا خیال ہے۔ ہم نے موضوع کی تلاش کا آغاز کرتے ہوئے سوچا۔ سیاست میں ہر کوئی دلچسپی لیتا ہے۔ نہایت ہر دلعزیز موضوع ہے۔ نظم جہاں سیاست پر ہی استوار ہوتا ہے۔ اسی سے قومیں ممتاز ہوتی ہیں۔ سیاست زندگی ہے اور زندگی سیاست۔ سیاست نہ ہو تو زندگی ہے کار بے بنیاد۔۔۔ تو، یہ ایک عمدہ اور جامع موضوع ہے۔ ہم نے اپنے ہی ارادے کی توثیق کرتے ہوئے سوچا۔ ساتھ ہی سیاسی معاملات، واقعات اور کرداروں پر غور و خوض کرنا شروع کیا۔۔۔ ہیں، یہ کیا۔ یہ تو نہایت غیر سنجیدہ موضوع ہے۔ کل جس عمارت کو بنانے کے لئے جلسہ برپا تھا، آج اسے ہی ڈھانے کے لئے دھرنا دیا جا رہا ہے۔ کل جو یار تھا آج وہی غدار ہے۔ سرخے اور سبزے سب گڈ مڈ ہو چکے ہیں۔۔۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ سیاست پر گفتگو کرنا اپنی شخصیت پر غیر سنجیدگی کی تہمت لگانا ہی ہے۔ اچھا، کوئی بات نہیں۔ ہم موضوع تبدیل کر لیتے ہیں۔۔۔ معاشیات کیسا رہے گا۔ دراصل سیاست اور دیگر کاروبار زندگی جس نکتے کے گرد گھومتے ہیں۔ وہ معاشیات ہی ہے۔ ہم نے علامہ اقبال کے نوٹوں والے پوز کی طرح سر ہتھیلی پر رکھتے ہوئے فلسفیانہ انداز میں سوچا۔ کسی بھی سوسائٹی کی معیشت سب سے اہم شے ہے، دیگر تمام معاملات معیشت کی مضبوطی کے لئے ہی استوار کئے جاتے ہیں۔ خوب، معاشیات ایک جاندار موضوع ہے۔۔۔ اب ہم نے معاشیات کے

اسرار و رموز جاننے کے لئے تگ و دو شروع کی۔ معاشیات کے بارے میں معلومات اکٹھی ہونے لگیں تو ہمیں اشتراکی بدہضمی کی شکایت ہو گئی جس کو دفع کرنے کے لئے ہم نے مذہبی شد بد رکھنے والے حکیموں سے رابطہ کیا جنہوں نے سرمایہ دارانہ پھکی سے علاج کرنا شروع کر دیا۔ اس سے شکایت کی شدت میں کمی تو آئی مگر بیماری جڑ سے نہ گئی۔ ناچار کیا کرتے، معاشیات پر کتاب لکھنے کا خیال ہی ترک کر دیا کیونکہ کفر کو شکست اسی چال سے دی جاسکتی تھی۔ اب ہم نے نئے موضوع کی تلاش شروع کی۔ سماجیات کیسا رہے گا۔ ظاہر ہے جب تک سماج کا وجود ہے علم سماجیات کی اہمیت سے انکار حیوانات و جمادات ہی کر سکتے ہیں۔ جی، ہاں۔ سماج میں رہنا ہے تو سماجیات پر ہی کتاب لکھنا ہو گی۔۔۔ لیکن اس میں ایک الجھن ہے۔ ہم نے خود کلامی کی۔ سماجیات پر گفتگو کرتے ہوئے محسوس ہوتا ہے جیسے ہم سرکاری ٹی۔وی پر خبریں پڑھ رہے ہوں۔۔۔ یہ تو بالکل بے مزہ موضوع ہے۔ مریضوں کے کھانے جیسا۔ جسکی غذائی حیثیت، بقول ڈاکٹروں کے، مسلم مگر ذائقہ نہ ہونے کے برابر۔ ایسا کھانا کھانے کا کیا حاصل جس کی افادیت گلے سے اترنے اور پیٹ میں پہنچنے سے شروع ہو۔ ویسے بھی جو علم جتنا اہم ہوگا، اتنا ہی پھیکا ہوگا۔ ایسے موضوعات پر لکھنا اُس عمر میں مناسب معلوم ہوتا ہے جب آدمی کو ذیابیطس ہوئے کم از کم پانچ برس گزر چکے ہوں اور اُس کی اولاد بھی جوان ہو چکی ہو۔ تو ہم کوئی نیا موضوع تلاش کرتے ہیں۔۔۔ اخلاقیات۔۔۔ لاحول و لا قوۃ۔ لوگ سمجھیں گے ڈپٹی نذیر احمد اپنے پند و نصائح کے مہلک ہتھیاروں سے لیس ہو کر ایک مرتبہ پھر دو عالم کا مزا کر کر ا کرنے کے لئے میدان میں کود پڑے ہیں۔۔۔ سیاست نہیں، معیشت نہیں، سماجیات و اخلاقیات بھی نہیں۔ گویا، موضوع کا انتخاب ہی جانکنی کا مرحلہ بن گیا۔ شدید الجھن اور ڈپریشن کی کیفیت ہے۔ اب ہم نے نئے سرے سے ہمت باندھی۔۔۔ دراصل معاشیات، سیاسیات جیسے موضوع بوسیدہ ہو چکے ہیں۔ ان میں ندرت نہیں ہو سکتی۔۔۔ پھر کہاں سے لائی جائے ندرت۔۔۔ ہاں، یاد آیا۔ زمانہ سائنس کا ہے۔

174 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

سائنس کی کارگیری ہر سو پھیلی ہوئی ہے۔ اور ہمارے ہاں تو سائنس پر بات کرنے والے لوگ بھی کم ہی ہیں۔ بالکل ٹھیک، اندھوں میں کاناراجا بننے کا ایسا شاندار موقع تاریخ کائنات میں دوبارہ نہیں ملے گا۔ نئی نئی ایجادات اور اُن کے توبہ شکن اثرات۔۔۔ موضوع تو مناسب معلوم ہوتا ہے۔ مگر سائنس پر کلام کیا جائے تو کس سے کیا جائے۔ پاگل خانے تو ہمارے ہاں کم ہی ہیں۔۔۔ تو، یہ موضوع بھی مناسب نہیں۔ ہم نے اپنے ڈپریشن میں اضافہ کرتے ہوئے سوچا۔ رات کا آخری پہر تھا۔ ہم نے سوچ بچار سے چھٹکارا پانے کے لئے ریاضی کی کتاب پڑھنا شروع کی۔ تیرنشانے پر بیٹھا اور منٹوں میں نیند آ گئی۔

اگلے روز علی الصبح، سہ پہر چار بجے، جاگے۔ نہائے، ناشتہ کیا تو پھر وہی موضوع کے انتخاب والا معمہ دماغ پر طاری ہو گیا۔ نئے سرے سے غور و خوض کرنا شروع کیا۔ ایک بنیادی نکتہ سوچھا۔ معاشیات اور اخلاقیات جیسے موضوع خواص سے متعلق ہیں اور خواص کتاب پڑھنے کو کسرِ شان تصور کرتے ہیں۔ تو بہتر یہ ہے کہ عام آدمی کے لئے لکھا جائے اور ویسے بھی ہر بڑی کتاب عام لوگوں سے ہی خطاب کرتی ہے۔ اور ہاں عام آدمی سے بات اسی کے معاملات کے حوالے سے ہو سکتی ہے اور اگر یہ گفتگو سلیقے سے کی جائے تو ادب کہلاتی ہے۔۔۔ یہ ہوئی پتے کی بات۔ ادب تخلیق کیا جائے۔ اب ہم نے ادبی تحریروں کا سرسری جائزہ لینا شروع کیا۔۔۔ اوہ میرے خدایا۔ اس میں تو ایک سے بڑھ کر ایک اعلیٰ تخلیق پہلے سے موجود ہے۔ ہم کیا لکھ سکتے ہیں۔ چاہے کتنا ہی زور لگا لیں۔ کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔۔۔ اچانک ہمیں اپنے دوست عبدالحمید شیرازی ملتانی کا قول یاد آیا۔ ایک دن ہم نے اُن سے پوچھا۔ یار ملتانی! میر، غالب اور ابوالکلام جیسے لکھنے والے کن حالات میں پیدا ہوتے ہیں۔ کہنے لگے، ادب ہمیشہ معاشرتی انحطاط کے زمانے میں عروج پاتا ہے۔ معاشرتی توڑ پھوڑ جتنی زیادہ ہوگی، اتنا ہی عمدہ ادب تخلیق ہوگا۔۔۔ اس قول زریں سے استنباط کرتے ہوئے ہم نے نتیجہ اخذ کیا کہ معاشرتی

انحطاط فی زمانہ اتھاہ گہرائی تک پہنچ چکا ہے۔ تو یہی وقت ادبی عروج کا ہے۔ چونکہ معاشرتی شکست و ریخت ماضی کے ادوار کے مقابلے میں بے حد زیادہ ہے تو عین یہی وقت ہے کہ غالب و ابوالکلام کو میدانِ ادب میں پچھاڑ دیا جائے۔ پس ثابت ہوا کہ ہم جو بھی ادبی کاوش کریں گے، وہ انحطاطِ زمانہ کے طفیل نہایت اعلیٰ پائے کی ہوگی۔ جس پر قدما و فصحا کی ارواح مسرور ہونے کے ساتھ ساتھ حسد کریں گی کہ ہم ایسے آگستائی عہد (Augustan age) میں وفات کیوں پائے ہوئے ہیں۔۔۔ اس خیال سے تقویت پا کر ہم نے نظم اور نثر کی چند بہترین کتابیں کھنگالنا شروع کیں۔ ہر دوسرا، تیسرا لفظ اسقدر نامانوس لگا کہ ایک صفحہ کتاب پڑھنے کے لئے ہفتہ بھر لغت دیکھنا پڑتی۔ سر کھپائی کرنے سے لفظوں کا مطلب معلوم ہو جاتا لیکن بات سمجھ نہ آتی۔ پھر کسی صاحب علم سے رجوع کرتے جو بات کی وضاحت کر دیتا۔ جب بات سمجھ آ جاتی تو احساس ہوتا کہ ادبا و شعرا خواہ مخواہ شراب کی تعریفیں کرتے جاتے ہیں، حالانکہ جس طرح کے خیالات فاسدہ اُن کے دماغ میں آتے ہیں وہ شراب نہیں، بھنگ اور چرس کے بے دریغ استعمال کا ہی نتیجہ ہو سکتے ہیں۔ اس خیال کا آنا تھا کہ ہمیں ادبی موضوعات سے فرار ہونے کا جواز مل گیا۔ اور ہم دوسرے موضوعات کے بارے میں سوچنے لگے۔۔۔ پلمبر اور الیکٹریشن کے کورس پر بھی کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ اور مولیٹی اور مرغیاں پالے بغیر تو کوئی معاشرہ ترقی کر سکتا ہے نہ گوشت، دودھ اور انڈے حاصل کر سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مرغیاں پالنے پر کتاب لکھنا بلاشبہ قومی خدمت ہے جس میں کسی قسم کی تاخیر و کوتاہی معاشرے کی پسماندگی کا سبب بن سکتی ہے۔ اب ہم نے اپنی تمام تر توجہ مرغیوں اور ان کی معاملات پر مرکوز کی۔۔۔ مرغیوں کے بارے میں معلومات اکٹھی کرتے ہوئے ہمیں مرغیوں کے بارے میں بھی جاننا پڑا۔ جس سے طبیعت میں تکدر پیدا ہو گیا۔ اس کے علاوہ رانی کھیت کی بیماری کی جزئیات بھی سمجھنا پڑیں۔ اس بیماری کے دوران مرغیوں کی چونچوں سے پانی بہتا رہتا ہے۔ جس سے اُن کے پالنے

176 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

والوں کو زکام، نمونیہ اور تپ۔ دق جیسے امراض لاحق ہو سکتے ہیں۔۔۔ یہ موضوع بھی موزوں نہیں ہے۔ پھر کیا کیا جائے، کہاں سے موضوع ڈھونڈا جائے۔ بہت مغز ماری کی۔ بالآخر مسئلے کا حل مل ہی گیا۔۔۔ فی الحقیقت موضوع مخصوص کر لینے سے تحریر محدود ہو جاتی ہے اور لکھنے والا چار دیواری میں مقید ہو جاتا ہے۔ آج تک جتنے لوگوں نے کسی ایک مخصوص موضوع پر لکھا ہے وہ سب محدود ہو کر رہ گئے ہیں۔ غزل کیوں تمام اصنافِ شاعری پر بھاری ہے۔ اس لئے نہیں کہ اس میں ایک سے بڑھ کر ایک عمدہ مضمون باندھا گیا ہے بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ شاعر ایک ہی غزل میں محبوب کی بے اعتنائی اور طبیب کی غلط تشخیص سے پیدا ہونے والے دردِ دل کو گڈ مڈ کر سکتا ہے۔۔۔ پس موضوع کا انتخاب اپنے افکار کو محدود کرنا ہی ہے۔ جبکہ ہم کسی پابندی کے قائل نہیں ہیں۔ ہم اپنی کتاب کا موضوع منتخب کر کے، دیگر تمام موضوعات سے کنارہ کشی اختیار نہیں کرنا چاہتے۔ اور اگر موضوع کا انتخاب اس قدر ہی اہم ہے کہ اس کے بغیر چارہ نہیں تو ہم کتاب تحریر کرنے کے بعد موضوع منتخب کر لیں گے۔ فی الحال ہم کتاب لکھنا شروع کرتے ہیں۔

موضوع کا معمہ حل ہو گیا تو ہم نے کتاب کے لئے درکار معلومات کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ اس کام کے لئے لائبریری تو کھنگالنے سے رہے۔ اخبارات و رسائل تو ہم ویسے ہی پڑھتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ انٹرنیٹ اور دوستوں سے گپ شپ بھی مفید رہے گی۔ اگر یہ تمام ذرائع بھی نا کافی ہوئے تو علم لدنی اور ذاتی بصیرت جیسے ذرائع سے معلومات اکٹھی کرنا تو ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔۔۔ اور اسلوب و بیان۔ اس کے لئے ہم کسی بڑے ادیب کے طرزِ تحریر پر ایک نظر ڈال لیں گے۔ ہم نے عبدالحمید شیرازی ملتانی سے غبارِ خاطر مستعار لیتے ہوئے فیصلہ کیا۔ پڑھنا شروع کیا۔۔۔ علمِ عالمِ محسوسات سے سروکار رکھتا ہے۔ مذہب ماورائے محسوسات کی خبر دیتا ہے۔ دونوں میں دائروں کا تعدد ہوا، مگر تعارض نہیں ہوا۔ جو کچھ محسوسات سے ماورا

177 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

ہے۔ ہم اسے محسوسات سے معارض سمجھ لیتے ہیں اور یہیں سے ہمارے دیدہ کج اندیش کی ساری در ماندگیاں شروع ہوتی ہیں۔۔۔ اتنا ہی پڑھا تھا کہ ہمارے چودہ طبق روشن ہو گئے اور بالکل واضح ہو گیا کہ ہماری پچھلی سات پشتیں کیوں کتاب کے سائے سے بدکتی رہی ہیں۔ بزرگوں کی کوئی حرکت خالی از حکمت نہیں ہوتی۔ اور جس معاملے پر سات پشتوں کا اجماع رہا ہو اس کے سامنے تو حکمت بھی پانی بھرتی ہے۔ اب ہمیں سمجھ آیا کہ اکابرین ملت کی شب و روز تقاریر کے باوجود قوم خواب غفلت سے بیدار کیوں نہیں ہوتی تھی۔ جب انہیں بات سمجھ ہی نہیں آتی تھی تو وہ خواب غفلت سے بیدار ہو کر جمائیاں ہی لیتے جس کے مقابلے میں ہزار گنا بہتر تھا کہ سوئے رہتے۔۔۔ گویا بات سلیس انداز میں کی جائے تاکہ کسی کو سمجھ تو آ سکے۔۔۔ اور ہاں، تحریر میں سادگی اور سلاست قارئین کے لئے نہیں، اپنی سہولت کے لئے از حد ضروری ہے۔ ہاں، اتنا ہو سکتا ہے کہ کتاب کے دیباچے میں سادہ طرزِ تحریر کو قارئین کی کم علمی اور اپنی خوبیِ تحریر کہہ کر داد لے لی جائے۔ بشرطیکہ قارئین، اگر کوئی ہوں، اپنے اوپر لگے ہوئے اس الزام کو خندہ پیشانی سے اگر نہیں تو کم از کم خاموشی سے ہی برداشت کر لیں۔ تو طے یہ ہوا کہ تحریر سادہ ہوگی اور قارئین کی سہولت کے لئے ہوگی۔

موضوع، معلومات اور اسلوبِ بیان سے نبٹنے کے بعد مسودہ تحریر کرنے کا مرحلہ سامنے تھا۔ گیا وہ وقت جب لکھاری ایک ہی کتاب کا مسودہ دس مرتبہ لکھتے تھے۔ اب تو ایک ہی مسودے سے دس کتابیں کشید کر لیتے ہیں۔ اور بالفرض کوئی مصنف اپنی ہر کتاب چھپوانے کے لئے ایک نیا مسودہ لکھتا ہے تو اسے اپنے علمی اچھارے کا علاج کروانا چاہئے۔ اور کتابت اور کاتب کا تو نام لیتے ہی ایسے لگتا ہے کہ آپ مرزا ہادی رسوا کے ہم عصر ہونے کے ناتے اپنی رسوائی پر تلے ہوئے ہیں۔ آج کے دور میں کتابت کو کمپوزنگ کہتے ہیں۔ اور وہ بھی کمپیوٹر پر۔ خوب یاد آیا، ہمارے ایک دوست ایک پرائیویٹ کمپیوٹر کالج کے منتظم ہیں۔ کیوں نہ ان سے کہا جائے کہ وہ اپنے کالج کے

کسی سٹوڈنٹ کو بطور اسائنمنٹ ہماری کتاب کمپوز کرنے کے لئے کہہ دیں۔ آئیڈیا برا نہیں ہے۔ کتاب کمپوز کرنے سے سٹوڈنٹ کو کمپوزنگ کی مشق کا موقع مل جائے گا اور ساتھ ہی ساتھ وہ ساری عمر اس بات پر اتراتا بھی رہے گا کہ میں نے تو اس وقت کتاب مکمل کر دی تھی جب مجھے ٹائپنگ اور مصنف کو تصنیف کرنا نہیں آتا تھا۔۔۔ ہم نے اپنے دوست سے رابطہ کیا اور کتاب کمپوز کرنے کے لئے جملہ سہولیات مانگ لیں۔ انہوں نے کہا کہ جملہ کی تفصیل بتائیں۔ ہم نے کہا کہ ایک کمپیوٹر چاہئے۔ بالکل نئے ماڈل کا۔ کام کرنے کی سپیڈ بے حد تیز ہو۔ انٹرنیٹ کے ساتھ منسلک ہو۔ تاکہ کسی قسم کی فلمیں دیکھنے میں دقت نہ ہو۔ جس وقت ہم فلم سے اکتا جائیں تو مسودے پر کام شروع کر دیں۔ ایک طالب علم ہو جو اردو ٹائپ کرنے کے علاوہ ہر قسم کی فلموں اور سی۔ ڈیز کی شناخت رکھتا ہو۔ ایک کمرہ ہو جس میں ایئر کنڈیشنر لگا ہوا ہو اور کسی قسم کی مداخلت نہ ہو۔ اور ہاں تمہارے علم میں اضافے کے لئے بتا دوں کہ لوڈ شیڈنگ مداخلت کی بدترین قسم ہے۔ یہ بالکل نہ ہو۔ مزید برآں ہمارے اوقات کار میں کھانے اور پینے کا بندوبست بھی تمہارے ذمے ہے اور یہ کہ گھر سے آنے اور واپس لے جانے کے انتظامات تو تمہارے لئے کوئی مسئلہ نہیں ہوں گے۔۔۔ ہمارے دوست نے سہولیات کی فہرست سن کر کہا، یار سیدھی بات کرو، تم کتاب کمپوز کروانے نہیں ہمارے کالج پر قبضہ کرنے آئے ہو۔۔۔ یار تم پیدائشی بدگمان ہو۔ ہم نے جواباً کہا۔ اور ہاں ایک بات یاد رکھو کہ یہ جو پرائیویٹ کالج ہیں۔ یہ جتنا ٹیکس ادا کرتے ہیں۔ یہ سوائے محکمہ انکم ٹیکس کے کسی سے چھپا نہیں ہوا ہے۔ اور اب ہمارے توسل جلیلہ سے انہیں بھی معلوم ہو جائے گا۔۔۔ انکم ٹیکس کا نام سنتے ہی ہمارے دوست پہلے گڑبڑائے پھر زیر لب بڑبڑائے، توسل جلیلہ۔ اُن کا تلفظ بالکل درست نہ تھا اور نہ وہ 'ج' کو 'ذ' نہ پڑھتے۔

ہمارے دوست کہ بے حد خلیق، وضع دار اور ڈرپوک ہیں۔ کہنے لگے۔ یار میں انتظام تو کر دیتا لیکن ہمارے ہاں تو انگریزی ٹائپنگ سکھائی جاتی ہے۔ تم ایسے کرو کہ اپنی

179 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

کتاب کا انگریزی ترجمہ کر لاؤ۔ میں اسے ٹائپ کروا دیتا ہوں۔۔۔ لیکن ہم نے کتاب تو اردو میں شائع کروانی ہے۔ مسودے کے انگریزی ترجمے کو ٹائپ کروا کر ہم کیا کریں گے۔ ہم نے سرکھاتے ہوئے کہا۔۔۔ تم انگریزی مسودے کو کسی مترجم سے اردو میں ترجمہ کروالینا۔ آج کل ایسے مترجم آسانی سے مل جاتے ہیں جو ترجمہ کرتے وقت کمپیوٹر پر ٹائپ کرتے جاتے ہیں۔ اس طرح تمہارا مسودہ کمپوز ہو جائے گا۔ ہمارے دوست نے اپنی فہم و فراست بروئے کار لاتے ہوئے تجویز دی۔۔۔ بہت شاندار تجویز ہے۔ یعنی میں مسودہ اردو میں لکھوں، اسے انگریزی میں ترجمہ کروں تاکہ تم اسے ٹائپ کروا سکو۔ پھر اسے مترجم کے پاس لے کر جاؤں جو اس کا اردو میں ترجمہ کرے اور ساتھ ساتھ ٹائپ بھی کرے۔ ایسا کرنے کی بجائے میں سیدھا مترجم کے پاس کیوں نہ چلا جاؤں۔ اسے ترجمہ کرنے کی زحمت نہیں کرنا پڑے گی اور وہ قلیل وقت میں ٹائپنگ، کمپوزنگ بھی مکمل کر سکے گا۔ ہم نے اپنے دوست کی کامن سینس کی داد دیتے ہوئے کہا۔۔۔ وہ گویا ہوا۔ یار میں نے تو دوستانہ مشورہ دیا ہے۔ اگر تمہیں پسند نہیں تو تم سیدھا مترجم کے پاس چلے جاؤ بلکہ ایسا کرو فوراً چلو جاؤ۔ اب ہمیں سمجھ آئی کہ معاملہ کیا ہے۔۔۔ تم انگریزی، اردو جھگڑا صرف اپنا پنڈ چھڑانے کے لئے پیدا کر رہے ہو۔ ہم نے اپنے دوست کی چالاکی کا پردہ چاک کرتے ہوئے کہا۔۔۔ تم ایسا کرو مجھے ایک اوسط درجے کا غبی سٹوڈنٹ دے دو۔ میں خود اس سے کام لے لوں گا۔ ہمارے دوست نے پسپائی اختیار کرتے ہوئے افسردہ لہجے میں کہا۔۔۔ ہیں، کیا کہا۔ غبی سٹوڈنٹ کیوں۔ لائق اور محنتی سٹوڈنٹ کیوں نہیں۔۔۔ وہ اس لئے کہ ہم نے کمپوزنگ کروانی ہے، اپنے مسودے پر تنقید نہیں۔ ہم نے اپنے دوست کو سمجھاتے ہوئے عرض کیا۔۔۔ ہمارے کالج کا شائد ہی کوئی طالب علم ہو جو تمہارے مطلوبہ معیار پر پورا نہ اتر سکے۔ تم جسے چاہو منتخب کر لو۔ ہمارے دوست نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔ اور یوں ایک طالب علم ہمارے زیر سرپرستی کام چوری کرنے لگا۔

180 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

کتاب کی کمپوزنگ کا مرحلہ تمام ہوا تو ہم نے سوچا کہ کسی صاحبِ علم اور ماہر زبان کو مسودہ دکھا دیا جائے تاکہ اغلاط کی تمام تر ذمہ داری صرف ہمارے کندھوں پر ہی نہ رہے۔ اتفاقاً ہمارے پڑوسی آدھمکے۔ انہوں نے بیٹھتے ہی کتابوں، اخبارات، رسائل پر گفتگو شروع کر دی۔ ہمیں ایسے موضوعات سے چونکہ قطعاً کوئی دلچسپی نہ تھی۔ بس جواباً ہوں۔ ہاں کرتے رہے۔ ہمارے مہمان علم کی دھاک بٹھا رہے تھے اور ہم خلا میں دیکھتے ہوئے یہ سوچ رہے تھے کہ چھٹی کے دن سینما دیکھا جائے یا ریس کورس جا کر گھوڑوں کی ریس یا پھر دونوں بابرکت کام ایک ہی دن سرانجام دیے جائیں کیونکہ زندگی مختصر ہے اور مہلتِ عمل اس سے بھی قلیل۔ ہمارے مہمان کو گفتگو میں ہماری عدم دلچسپی بڑی ناگوار گزری۔ پوچھنے لگے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کسی فکری معاملے میں الجھے ہوئے ہیں۔ کچھ ارشاد کیجیے۔ ہو سکتا ہے گفت و شنید سے گرہیں کھل جائیں۔ ہمیں فوراً خیال آیا کہ سینما یا ریس کورس کا ذکر کیا تو کہیں ساتھ جانے کے لئے تیار ہی نہ ہو جائیں اور عین رومانوی سین یا گھڑ دوڑ کے اختتام کے قریب اپنی بقراطیات کی پٹاری ہی نہ کھول دیں۔ ہم نے اپنے حواس کو قابو میں رکھتے ہوئے بہانہ کیا۔ وہ۔۔۔ دراصل ہم نے ایک کتاب کا مسودہ لکھا ہے۔ اب ارادہ ہے کہ کوئی صاحبِ علم اس پر ایک نظر ڈال لیں تاکہ اشاعت کے بعد یہ قلق نہ رہ جائے کہ کاش کسی سے مشورہ ہی کر لیتے۔۔۔۔۔ یہ سننا تھا کہ موصوف کھل اٹھے۔۔۔ فرمانے لگے۔ ارے صاحب، یہ خاکسار کس دن کام آئے گا۔ ابھی مسودہ دکھائیے۔۔۔۔۔ جی ابھی۔۔۔ وہ، وہ دراصل مسودہ گھر میں کہیں گم ہو گیا ہے۔ ڈھونڈ کر دکھائیں گے، ہم نے عرض کیا۔۔۔ آپ ابھی ڈھونڈ لیں، ہم ادھر ہی انتظار کرتے ہیں۔۔۔ لیکن ہمیں کوئی جلدی نہیں ہے۔ پھر کسی وقت یہ کام کر لیں گے۔۔۔ نہیں، نہیں۔ ہم اتنے بے مروت اور بد ذوق نہیں کہ اپنے ہمسائے کی کتاب کا مسودہ پڑھنے کے لیے انتظار نہ کر سکیں۔ آپ کا مسودہ پڑھے بغیر تو اب دن کو چین اور رات کو نیند نہیں آئے گی۔۔۔ ناچار ہم نے ہتھیار ڈال دیے اور اپنا مسودہ ان کے

181 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

حوالے کر کے گھر سے دوستوں کے ساتھ تاش کھیلنے نکل گئے۔ رات کے پچھلے پہر واپس اپنے بیڈ روم پہنچے۔ لائٹ آف کر کے گھنٹہ بھر سونے کے لئے کروٹیں بدلتے رہے۔ اتنے میں کال بیل اسقدر زور سے بجی کہ ہم ہڑبڑا کر اٹھے۔ یا اللہ خیر ہو۔ اسوقت کون آگیا۔ نیم وا آنکھوں سے دروازہ کھولا تو ہمارے پڑوسی مسودہ ہاتھ میں لئے کھڑے تھے۔ یہ کہنا تو اپنے پڑوسی پر تہمت لگانا ہی ہوگا کہ وہ عین تہجد کے وقت تشریف لائے تھے کیونکہ اسوقت مرغوں نے اذانیں دے دے کر مسجد کے موزن کو بیدار کر دیا تھا جو اہل ایمان سے اپنی گم گشتہ نیند کا بدلہ لینے کے لئے لاؤڈ سپیکر آن کر کے اپنا گلا صاف کرنا شروع کر چکا تھا۔۔۔ ہمارے پڑوسی گویا ہوئے۔ میں نے ابھی آپ کے مسودے پر تبصرہ مکمل کیا ہے اور بغیر ایک ساعت کی تاخیر کے آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا ہوں۔ تاکہ آپ فوراً اس کی اشاعت اور دیگر مراحل کے لئے منصوبہ بندی کر سکیں۔ لیکن ان تمام مراحل سے قبل آپ ابھی میرے ساتھ بیٹھ کر ایک نظر میرے تبصرے پر ڈال لیں تاکہ آپ کو میری رائے سمجھنے میں دشواری نہ ہو۔ بہتر ہوگا اگر یہ کام ابھی کر لیا جائے۔ ہم نے نہایت عاجزانہ التجا کی کہ ابھی تو نماز کا وقت ہے اور میں باجماعت نماز ادا کر کے ایک انتہائی ضروری کام کے سلسلے میں گھر سے باہر جا رہا ہوں۔ شام کے وقت نشست کریں گے اور آپ کی رائے سے مستفیض ہوں گے۔۔۔ ہمارے پڑوسی کو ہمارا شیڈول پسند نہ آیا لیکن وہ طوباً کرہاً مسودہ ہمیں تھا کر چلے گئے۔ اور ہم واپس آ کر سو گئے۔ بعد از سہ پہر بیدار ہوئے اور مسودے کی ورق گردانی شروع کی۔ کئی صفحات الٹ پلٹ کر دیکھے۔ مضمون نیا اور اسلوب بالکل اجنبی لگا۔ غالباً ہمارے دوست غلطی سے دوسرا مسودہ دے گئے ہیں۔ کوئی بات نہیں۔ اُن سے ملاقات ہوگی تو اپنا مسودہ مانگ لیں گے۔ سر شام ہی موصوف تشریف لے آئے۔۔۔ ہاں میاں، ہماری رائے کیسی لگی۔ آتے ہی گویا ہوئے۔۔۔ جی، وہ دراصل آپ کوئی دوسرا مسودہ دے گئے ہیں۔ یہ وہ نہیں ہے جو ہم نے لکھا تھا۔۔۔ ارے صاحب، ہم اتنے بھی

بوڑھے نہیں ہوئے کہ یہی پتہ نہ چل سکے کہ کونسا مسودہ ہے۔ انہوں نے ذرا خفگی سے ارشاد فرمایا۔ مجبوراً ہم نے مسودہ انہیں دکھاتے ہوئے اپنی بات کی حمایت میں ایک باب کے دس صفحات انہیں دکھائے جن کا ہمارے فرشتوں کو بھی علم نہ تھا۔۔۔ فرمانے لگے، جی ہاں یہ تو ہم نے لکھ کر آپ کے مسودے میں شامل کئے ہیں۔۔۔ جی، کیا کہا آپ نے۔ ہمارے ہاتھ پیرن ہو گئے۔۔۔ دراصل آپ کے اندازِ فکر اور بیان میں کچا پن ہے تو ہم نے اپنی طرف سے لکھ کر آپ کی تحریر کو پختگی عطا کر دی ہے۔۔۔ ہمارا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔۔۔ لیکن جو ہم نے لکھا تھا، وہ تو یہاں نظر ہی نہیں آرہا ہے۔ ہم نے دریافت کیا۔۔۔ آپ کی تحریر ابھی ناپختہ ہے جسے پڑھنے سے قارئین کا ذوق متاثر ہو سکتا تھا۔ اس لئے ہم نے وہ صفحات نکال کر پھاڑ دیے اور ان کی جگہ نئی تحریر لکھ کر منسلک کر دی ہے۔ انہوں نے شائستگی سے ہماری اصلاح کی۔۔۔ ہمیں ساری دنیا گھومتی نظر آنے لگی۔۔۔ ہم نے تمام تر ہمت و برداشت اور قوتِ گویائی مجتمع کر کے استفسار کیا۔ کتنے صفحات پر آپ نے ایسی اصلاح کی ہے۔۔۔ زیادہ نہیں، بس نصف سے کچھ زیادہ۔ ہمیں سمجھ نہ آئی کہ اپنے آپ کو پیشیں یا اپنے ہمسائے کو۔۔۔ اچھا، باقی نصف کونسا ہے۔ ہم نے پانی کا گلاس اپنے حلق میں اتارتے ہوئے پوچھا۔ انہوں نے جھٹ سے وہ حصے دکھائے جو اُن کی دستبرد سے محفوظ تھے۔ ہم نے تیزی سے صفحات پلٹ کر دیکھے تو ہر صفحے پر گدھے اور الو کی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔۔۔ پوچھا، یہ کیا ہے۔۔۔ فرمایا، وقت کی تنگی کے پیشِ نظر تقریباً نصف حصہ ہمارے ملازم نے پڑھا ہے۔ جس جگہ پر اسے کوئی اعتراض تھا وہاں اُس نے موقع و مناسبت کے اعتبار سے مصنف کے ذہنی رجحانات کو مختلف جانوروں سے تشبیہ دے دی ہے۔ بڑا فنکارانہ انداز ہے ظالم کا۔ لیکن ضروری نہیں کہ آپ اس کی رائے سے متفق ہوں۔ آپ چاہیں تو اسے رد بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن اس کی رائے ہے بے لاگ۔۔۔ ہم نے پانی کے گلاس پہ گلاس چڑھانے اور کافی دیر خاموشی کے بعد عرض کیا۔۔۔ قبلہ جہاں آپ نے اتنی شفقت فرمائی ہے کہ پورا

183 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

مسودہ ہی بدل گیا ہے تو ذرا سر پرستی اور کیجیے اور اسے اپنے نام سے چھپوا لیجئے اور ساتھ اپنے ملازم کا نام بھی لکھ لیجئے۔۔۔ اس پر تو وہ سیخ پا ہو گئے۔۔۔ کہنے لگے، یہ تو بددیانتی ہے، سرقہ ہے۔۔۔ آپ دل چھوٹا نہ کیجیے، آپ ہی مصنف ہیں۔ اپنے ہی نام سے چھپوائیے۔

اب ہم نئے عزم سے کتاب کے بارے میں منصوبہ بندی کرنے لگے۔ کتاب کی قدر و قیمت اس وقت بڑھتی ہے جب کوئی نامی گرامی ادیب اس پر تبصرہ کرے اور قارئین کو پڑھنے کے لئے ورغلائے۔ ہم نے اپنے عہد کے نہایت نامور شاعر و نثر نگار سے رابطہ کیا اور التجا کی کہ اگر آپ ہماری کتاب کا فلیپ لکھ دیں تو یہ ادب کی بڑی خدمت ہوگی جسکا آپ کو جہان دائمی میں کثیر اجر ملے گا۔ فرمانے لگے، آپ دقیانوسی خیالات کے حامل معلوم ہوتے ہیں جو اجر کی بات کرتے ہیں۔ اس خدمت کا جو بھی اجر آپ مجھے دلوانے کے لئے موت کا مرحلہ عبور کروانا چاہتے ہیں، اُس کا سترھواں حصہ اسی جہان ناقص و فانی میں دے دیجیے۔ آپ کا کام ہو جائے گا اور ہمیں حصولِ اجر کے لئے موت کی چھلنی سے گزرنے سے چھٹکارا مل جائے گا۔ اب ہم نے ان کے اس وار سے بچنے کے لئے تگ و دو شروع کر دی۔ اور ان کے ایک ایسے دوست اور رشتہ دار تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے جن کے وہ مقروض تھے۔ انہوں نے ہماری سفارش کچھ اس انداز سے کی کہ حضرت تحسین بھرا تبصرہ یا قرض چکا دینے میں سے ایک چیز کے انتخاب پر مجبور ہو گئے۔ ایک ہفتے کے بعد انہوں نے یہ تبصرہ تحریر کر کے ہمارے حوالے کر دیا۔۔۔ زندگی کے نشیب کو جس فنکارانہ چابکدستی سے شعروں میں سمو یا گیا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ شاعر کا مشاہدہ ہی نہیں بلکہ ذاتی تجربہ بھی نہایت وسیع و عریض ہے۔ یہ کتاب پڑھتے ہوئے یوں لگتا ہے کہ ہر شعر میں وہ اپنی داستان سناتے ہیں جو قارئین کے لئے نہایت سبق آموز ہے۔۔۔ یا الہی! یہ کس تجربے اور داستان کا ذکر کر رہے ہیں۔ اور یہ کہ کیسا شعر اور کون شاعر۔ اگر ہم شعر موزوں کر سکتے تو یہ کتاب لکھ کر

ادیبوں اور ناشرین کے ہاتھوں رسوا ہونے کی بجائے حسینوں سے پیچ لڑاتے۔۔۔ ہم نے اُن سے مودبانہ کہا۔ شاعر ہونا تو دور کی بات ہے، ہم نے تو اپنی تحریر میں کسی کا شعر بھی نقل نہیں کیا۔ آپ نے یہ کیسے شعر و شاعری کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے۔ کہنے لگے، یہ بتاؤ تم نے کتنے دن پہلے ہمیں تبصرہ لکھنے کا کہا تھا۔ عرض کیا، ایک ہفتہ پہلے۔ انہوں نے فوراً اپنی ڈائری نکالی اور ہم سے چھپا کر نجانے کیا ڈھونڈتے رہے۔ پھر بولے۔۔۔ جس دن آپ نے ہم سے لکھنے کے لئے کہا تھا، اُس دن ہمیں چودہ کتابوں پر لکھنے کے لئے کہا گیا تھا۔ ہم نے کئی کتابیں سونگھی تھیں، سب میں اشعار ہی مہک رہے تھے۔ ہم نے اُن چودہ کتابوں کے لئے یہی تبصرہ لکھا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ آپ نے نثر ہی لکھی ہو لیکن تبصرہ پھر بھی بر محل ہے۔ پوچھا، کیسے۔ ارشاد ہوا۔ نثر میں بھی شاعری کی جاتی ہے اور ہم نے اُسی طرف اشارہ کیا تھا لیکن حیف کہ آپ باریک نکات سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔۔۔ ہم نے ان کے تبصرے سے اختلاف کر کے اپنی سمجھ بوجھ کو مشکوک بنانے سے یہی بہتر جانا کہ ان کی رائے کا احترام کیا جائے۔ باقی رہا کہ اگر کسی پڑھنے والے نے وہی اعتراض کیا جو ہم سے سرزد ہوا تو اس کو اُسی جواب سے نوازا جاسکتا ہے جس سے ہماری عزت افزائی ہوئی تھی۔

اب ہمیں کتاب کی اشاعت کا مرحلہ درپیش آیا۔ شہر کے تمام ناشرین سے رابطے کئے۔ کسی نے عالمی کساد بازاری اور کسی نے عوام کی کتابوں میں عدم دلچسپی کی بنا پر کتاب نہ شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایک ناشر سے ہم ذرا کھل گئے۔ انہوں نے کتاب شائع کرنے کے لئے ہم سے وسائل طلب کئے جو ہمارے خاندان اور تمام دوستوں کی منقولہ و غیر منقولہ جائداد بیچ کر ہی فراہم کئے جاسکتے تھے۔ لیکن اہل خاندان اور دوستوں نے عدم تعاون کے رویے کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی جائداد بچالی۔ ایک دن ہم اردو بازار میں سے گزر رہے تھے کہ ایک اشاعتی ادارے میں اتفاقاً ایک ہمدِ دیرینہ سے ملاقات ہو گئی۔ بے حد محبت سے پیش آئے۔ ہم نے باتوں باتوں میں ان کا

اشاعتی ادارے سے تعلق پوچھا تو معلوم ہوا کہ ادارے کے مالک ان کے خسر ہیں۔ اب ہمیں امید کی کرن نظر آئی۔ ہم نے اپنی کتاب چھپوانے کے لئے ان سے مدد کی درخواست کی۔ انہوں نے فوراً اپنے خسر سے فرمائش کر دی۔ جنہوں نے اس شرط پر حامی بھری کہ اخراجات اشاعت بذمہ مصنف اور جملہ حقوق ناشر کے قبضے میں ہوں گے۔ ہم نے علیحدگی میں اپنے دوست کو مطلع کیا کہ مصنف اخراجات اٹھانے سے قاصر ہے۔ ہمارے دوست نے کہا، تم اس کی فکر نہ کرو میں اپنی موٹر سائیکل بیچ دوں گا لیکن تمہاری کتاب چھپوائے بغیر چین سے نہیں بیٹھوں گا۔ اس ایثار پر ہمارا دل پسیج گیا اور ہمیں قرونِ اولیٰ کے مومنین کی ایک جھلک دکھائی دی۔ مروتاً ہم نے اس پیشکش سے معذرت کرنا چاہی لیکن ہمارے دوست بضد ہو گئے۔ کہنے لگے، کتاب تو شائع ہوگی اور ہر حال میں ہوگی۔ آپ کی نہیں تو کسی اور کی ہوگی۔ ہمیں کچھ سمجھ نہ آئی۔ کافی منت سماجت اور تکرار کے بعد کھلے۔ کہنے لگے، میں جس موٹر سائیکل کی قربانی دینا چاہتا ہوں، وہ میرے خسر نے ہی مجھے لے کر دی تھی اور میں کسی طریقے سے وہ انہیں واپس کرنا چاہتا ہوں۔۔۔ اچھا تم زیرِ احسان نہیں رہنا چاہتے۔ ہم نے معاملہ فہمی کا مظاہرہ کیا۔ کہنے لگے۔ بات یہ نہیں جو تم سمجھے بیٹھے ہو۔ اگر میں وہ پیسے اپنے خسر کو لوٹا دوں جس کی موٹر سائیکل آئی تھی تو میں اور میری بیوی ویگنوں پر دھکے کھائیں گے اور عین یہی موقع ہوگا کہ میں اپنے خسر کو باور کروا سکوں کہ موٹر سائیکل کے پیسے میں نے آپ ہی کو لوٹا دیے تھے۔ اب نیا ذریعہ آمدورفت خریدنا آپ ہی کے ذمے ہے۔ مزید یہ کہ اب دور موٹر سائیکل کا نہیں ہے، گاڑی کا ہے۔ تاہم مجھے اس سے سروکار نہیں کہ آپ نیا ماڈل خرید کر دیتے ہیں یا دو سال پرانا۔ البتہ پانچ سال سے پرانی گاڑیوں پر سرکار جلد ہی پابندی عائد کرنے والی ہے۔ اتنی پرانی گاڑی پر پیسے ضائع نہیں کرنے چاہئیں۔ ہم اپنے دوست کی ذہانت کی داد دیے بغیر نہ رہ سکے۔ ہمارے دوست نے منصوبے کے عین مطابق اگلے روز ہی موٹر سائیکل بیچ کر پیسے ہمیں تنھائے جو ہم نے انہی کے خسر کو

186 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

دے دیے۔ کتاب کی اشاعت ابھی مکمل نہ ہوئی تھی کہ ہمارے دوست نے گھر میں واویلا کر دیا کہ ابا جان نے فلاں کتاب میری موٹر سائیکل کی قیمت پر چھاپی ہے۔ اب مجھے نئی گاڑی لے کر دی جائے۔ چند دنوں میں ہمیں کتاب کی پانچ سو کاپیاں اور ہمارے دوست کو گاڑی مل گئی اور ہم دونوں نے پکا پیمانہ کیا کہ اگلی ملاقات اس وقت ہوگی جب ہم نئی کتاب لکھ کر چھپوانے کا ارادہ کریں گے۔

کتاب چھپ کر گھر پہنچ گئی تو چند دنوں میں گھر والوں نے الٹی میٹم دے دیا کہ ایک ہفتے کے اندر یہ کتابیں گھر سے اٹھالی جائیں ورنہ ردی میں بیچ دی جائیں گی۔ ہم نے دو اڑھائی سو کتابیں مارکیٹ میں مختلف دکانوں پر بیچنے کے لئے رکھوا دیں جن کا معاوضہ، تقویٰ کے سبب، بک سیلرز نے قیامت سے چند ساعتیں پہلے ادا کرنے کا وعدہ کر لیا۔ بقیہ کتب ہم نے ملک کی معروف شخصیات اور اداروں اور لائبریریوں کو مفت بھیجنے کا پروگرام بنالیا۔ ایک دن ہماری ملاقات رمضان سے ہو گئی۔ وہ ہمارے گھر کے پاس ہی ایک گھر میں ڈرائیور تھا۔ کہنے لگا آپ ہسپتال میں کسی ڈاکٹر کو جانتے ہیں۔ میرے پیٹ میں کبھی کبھار درد ہوتا ہے۔ میں اپنا معائنہ کروانا چاہتا ہوں۔ ہم نے کہا کہ ایک نہیں ہسپتال کے سارے ڈاکٹر ہمارے دوست ہیں۔ ابھی چلتے ہیں۔ رمضان فوراً اپنی سائیکل لے آیا۔ ہم نے گھر سے دو سو کتابوں کا ایک پیکٹ اٹھایا اور سائیکل کے کیریئر پر بیٹھتے ہوئے پیکٹ اپنی گود میں رکھ لیا۔ رمضان آہستہ آہستہ سائیکل چلاتے ہوئے پوچھنے لگا۔ یہ آپ نے کیا اٹھا رکھا ہے۔ ہم نے بتایا، کتابیں ہیں۔۔۔ ان کا کیا کرنا ہے۔۔۔ راستے میں بڑے ڈاکخانے سے لوگوں کو ارسال کر دیں گے۔۔۔ رمضان ایک فرلانگ سائیکل چلاتا تو اس کا سانس پھول جاتا۔ پھر پندرہ بیس منٹ رک کر سانس بحال کرتا۔ تقریباً اڑھائی، تین گھنٹوں میں ہم باسانی ڈاکخانے پہنچ گئے۔ وہاں ایک ایک کتاب پر رمضان نے ڈاک کے ٹکٹ چسپاں کئے اور قطار میں کھڑے ہو کر تمام کتابیں ارسال کر دیں۔ باہر نکلے تو شام ڈھل چکی تھی۔ ہسپتال کے ڈاکٹر اپنی ڈیوٹی ختم

187 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

کر چکے تھے۔ ہم اور رمضان واپس سائیکل پر گھر کے لئے روانہ ہو گئے۔ راستے میں رمضان نے ہم سے پوچھا۔ یہ کتاب واقعی آپ نے لکھی تھی۔ جواب دیا، ہمارا تو یہی خیال ہے۔ کہنے لگا۔ کتنے پیسے ملے۔۔۔ کچھ بھی نہیں، ہم نے جواباً کہا۔۔۔ حیرانی سے کہنے لگا تو پھر لکھی کیوں تھی؟

188 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

برگد



موٹروے کے خارجی راستے سے جونہی باہر نکلے تو سامنے ایک بورڈ پر مزارمیاں
 عبداللہ لکھا نظر آیا۔ ہمیں تو ہزار وولٹ کا جھٹکا لگا۔ بمشکل گاڑی کو سڑک سے نیچے جانے
 سے بچایا۔ حیران ہو کر بورڈ کی طرف دیکھتے رہے۔۔۔ چپ چاپ۔۔۔ سر جھکا لیا۔
 آنکھیں بند کر لیں۔۔۔ کوئی سوال نہ جواب۔۔۔ بس خاموشی۔۔۔ آدھ گھنٹے میں چار
 پانچ دہائیاں گزر گئیں۔۔۔ ہم یہاں قریباً سال ڈیڑھ سال بعد آئے تھے۔۔۔ یہاں
 پہلے موٹروے نہیں ہوتا تھا۔ حال ہی میں بنا ہے۔ لاہور سے فیصل آباد موٹروے کو ملتان
 تک بڑھا دیا گیا ہے۔ جس پر موجود امین پور بنگلہ جانے والے خارجی راستے سے نکل کر
 ہم نڑوالا روڈ پر آئے تھے۔۔۔ کافی دیر بورڈ کو دیکھنے کے بعد گاڑی خود بخود میاں
 عبداللہ صاحب کے مزار کی طرف مڑ گئی۔ تین چار کلومیٹر کے فاصلے پر واقع مزار پہنچ
 گئے۔ ایک پرسکوت قبر سبز رنگ کی چادر اوڑھے سو رہی تھی۔ چار چھ کنال کے احاطے
 میں چند کمرے ہیں۔ جس میں کوئی بیٹھا ہوا ہے۔ کوئی سو رہا ہے۔۔۔ صحن میں کچے
 برتنوں میں مٹی ملا پانی پڑا ہے۔ پرندے آتے ہیں۔ پیتے جاتے ہیں۔۔۔ ساتھ ہی
 باجرہ، گندم، چاول کے دانے بکھرے پڑے ہیں۔۔۔ ایک طرف باورچی خانہ ہے۔
 دو تین دیگوں میں کھانا پک رہا ہے۔۔۔ ساتھ والا کمرہ دہائیوں پرانا۔۔۔ شاید سب سے
 پرانا یہاں یہی ہے۔ اوپر زنگ آلود بورڈ لگا ہوا ہے۔ جس پر ڈسپنسری لکھا ہوا ہے۔
 ہم نے اندر قدم رکھا تو دوائیاں بکھری پڑی ہیں۔۔۔ دو تین مریض دوائیاں لے
 رہے ہیں۔ ایک بوڑھی خاتون ڈسپنسر سے شکوہ کر رہی ہے کہ تمہاری دوائی استعمال

190 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

کرتے ہوئے کئی ماہ ہو چکے، افاقہ نہیں ہوا۔۔۔ صحن میں صفیں بکھری پڑی ہیں۔ چند طالب علم سبق یاد کر رہے ہیں۔ ایک کو دیکھا کہ وہ انگریزی میں کچھ لکھ رہا ہے تو ہمیں حیرت ہوئی۔۔۔ استفسار کیا۔ انگریزی پڑھنے آتے ہو یہاں۔۔۔ کہنے لگا۔ پڑھتا تو گاؤں کے اسکول میں ہوں۔ لیکن یہاں بیٹھ کر اسکول کا کام کرتا ہوں۔۔۔ یہاں کیوں؟ گھر میں کیوں نہیں۔۔۔ کہنے لگا، یہاں کھانا گھر سے اچھا ملتا ہے۔ میرے اسکول کے دوست بھی ادھر ہی آ جاتے ہیں۔ مل کر کام کر لیتے ہیں۔ اور کھیل بھی لیتے ہیں۔ شام کو گانا بجانا بھی ہوتا ہے۔۔۔ تم گا بھی لیتے ہو؟۔۔۔ بولا۔ نہیں۔ پر عیسیٰ نگری سے شوکت مسیح کا چھوٹا بیٹا آ کر گاتا ہے۔ باجا بھی بجا لیتا ہے۔ ہر روز یہاں مشق کرتا ہے۔ ہر اتوار گر جا گھر میں گاتا ہے۔ اور پیسے کماتا ہے۔۔۔

ہمارا خاندان بٹوارے کے بعد دھور کوٹ، لدھیانہ سے دھکے کھاتا ہوا یہاں پہنچا تھا۔ پتہ نہیں کس نے انہیں کہہ دیا لائل پور چلے جاو۔۔۔ یہاں آ کر یہ کیوں نڑ والا روڈ پر واقع چک نمبر ۵۹ ج۔ ب نھو چک آیا۔ اس کا بھی علم نہیں۔ ہمیں تو کیا علم ہونا، ہمارے دادا جو خاندان لے کر یہاں آئے تھے انہیں بھی معلوم نہیں تھا۔۔۔ دھور کوٹ میں بقول بزرگوں کے ہمارے خاندانوں کے پاس اتنی زمین تھی کہ اگر اُن کے ہی ایکڑ شمار کر لیے جائیں تو پورا ہندوستان ہمارے گاؤں کے ایک کونے میں واقع تھا۔ جس پر انگریزوں کا قبضہ ہونے کے بعد گاؤں پر بھاری وقت آچکا تھا۔ کیونکہ انہوں نے ۱۹۴۷ء میں سکھوں کو شہ دے کر ہمیں وہاں سے نکالا تھا۔ دھور کوٹ میں تعلیم کے بارے میں ایک مرتبہ ہم نے اپنے تایا جان سے دریافت کیا۔ فرمانے لگے، تعلیم سے تمہاری مراد غالباً دنیاوی تعلیم ہے۔۔۔ انہوں نے ابہام دور کرتے ہوئے پوچھا۔۔۔ جی، جی۔ یہی اسکول، کالج وغیرہ۔ ہم نے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔۔۔ کہنے لگے، دنیاوی تعلیم بدکاری اور سرکاری نوکری کی حوصلہ شکنی کی وجہ سے وہاں نہیں تھی۔۔۔ اچھا۔ جی۔ ہم نے دلچسپی

191 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

لیتے ہوئے کہا۔۔۔ تو تایا ابا۔ وہاں دینی تعلیم کے مدارس تھے؟۔۔۔ نہیں اُس کی وہاں کیا ضرورت تھی۔۔۔ مسجد میں نماز پڑھ لیتے تھے۔ روزے بھی رکھتے تھے۔۔۔ تمہارے دادا نے تو کبھی سات وقت کی نماز میں ناغہ نہیں کیا تھا۔۔۔ کیا کوئی کاروبار کرتے تھے وہاں۔۔۔ کاروبار، ہونہہ۔۔۔ ہندوؤں کا کام ہمارے خاندان میں نہیں تھا۔۔۔ پھر کیا تھا وہاں؟۔۔۔ وہاں۔۔۔ وہاں، کیا نہیں تھا۔۔۔ ہماری کھیتی باڑی ساری دنیا سے اچھی تھی۔ اپنے گھر، کھیت، مربے، بیلے، بیل، بھینسیں، کبڈی۔ اور تو اور یہ جو تم نے کل چین والوں کی ترقی کی تعریفیں کی تھیں، وہ صرف یہ اندازہ کرنے کے لئے سنی تھیں کہ تم کم علمی میں کہاں کھڑے ہو، ورنہ ہمارے گاؤں میں چینی مزدوری کرنے آتے تھے۔ تمہیں کیا پتہ دھور کوٹ کیسا خطہ تھا۔ اور چونکہ تم نے بے راہ روی کا چلن اپنایا ہوا ہے اور دلیل کے بغیر تمہاری بولتی بند نہیں ہوتی تو سنو۔ اگر دھور کوٹ مکے مدینے کے بعد پوری دنیا کا سب سے بہترین خطہ نہ ہوتا تو انگریز کبھی بھی سات سمندر پار سے یہاں نہ آتا۔۔۔ جی۔۔۔ پر تایا ابا! وہ انگریزوں نے تو ہندوستان پر قبضہ کیا تھا دھور کوٹ تو درمیان میں ہی آگیا، اُس قبضے میں۔۔۔ کیا، کیا کہا تم نے۔۔۔ او بے حد گدھے۔۔۔ دھور کوٹ کے علاوہ ہندوستان میں کیا تھا، جس پر قبضہ کرنا تھا۔۔۔ چند مضافاتی علاقے اور گنوار لوگ۔ اور بس۔۔۔ ہندوستان کا سب سے اہم علاقہ لدھیانہ تھا اور دھور کوٹ اُس کا سب سے اہم گاؤں۔۔۔ میں نے چینی، کھاد، نوٹ، نا اتفاقی اور تم جیسی ہانہجار اولاد تو یہیں آ کر دیکھی۔۔۔ اب اندازہ ہو گیا کہ پانی پت کا میدان گرم ہونے لگا ہے تو ہم نے ذرا موضوع بدلا۔۔۔ تایا ابا، اگر دھور کوٹ میں اسکول اور تعلیم نہیں تھی تو پھر ابا جان پڑھنے کہاں جاتے تھے۔ یہ تو کہتے ہیں کہ بٹوارے سے پہلے یہ چوتھی جماعت میں پڑھتے تھے اور ہندو بنیا کا حساب کتاب بھی لکھا کرتے تھے۔۔۔ یہ تمہارا ابا تعلیم نہیں دنیاوی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ تین چار کوس دور ایک گاؤں تھا، وہاں

192 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

پڑھنے جاتا تھا۔ وجہ پڑھنے کی یہ تھی کہ یہ گھر میں سب سے چھوٹا تھا۔ اور تمہارے دادا کا چہیتا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ کھیتی باڑی مشکل کام ہے تو جان چھڑانے کے لئے پڑھائی شروع کر دی۔ اس کے علاوہ کوئی وجہ نہیں تھی۔۔۔ یہی خاندانی بیماری اس سے تم میں منتقل ہوئی ہے۔ اس پر ساتھ ہی موڑھے پر بیٹھے ہوئے ابا جان دوسری طرف منہ کر کے مسکرائے۔۔۔ تایا ابا! ویسے ایک بات ہے کہ آپ کی نسل نے صرف دیس (ہندوستان) ہی دیکھا ہوا تھا۔ اسی لئے آپ کو وہ کل کائنات لگتی ہے۔۔۔ اس بے باک تبصرے پر تایا ابا نے تیوری چڑھائی اور غرائے۔ تم نے دیس دیکھا ہے۔۔۔ ہم نے انکار میں سر ہلایا۔۔۔ پھر تمہیں کیا پتہ کہ دنیا اور کائنات کیا ہوتی ہے۔۔۔ ساتھ ہی سامنے پڑی مکئی کے بھٹے کو ہاتھ میں پکڑا، گھما کر دیکھا اور ہماری طرف اچھال دیا۔۔۔ یہ ہے یہاں کی مکئی۔۔۔ دیس کی مکئی کے بھٹے کھانے سے یوں لگتا تھا کہ جوان چوٹی (بھینس) کا بغیر ٹیکے والا دودھ پی لیا ہو۔۔۔ اچھا تایا ابا! برا نہ مانئے گا۔ آپ نے بٹوارے سے پہلے دیس کے علاوہ ہندوستان کا کونسا علاقہ دیکھا تھا۔۔۔ ہمارے رشتے دار دور دراز رہتے تھے۔ اکثر گندم کی فصل سمیٹنے کے بعد اذان فجر کے ساتھ جوان بیل، گاڑی میں جوت کر نکلتے تو مغرب کے وقت آندلو پہنچتے۔۔۔ آندلو کیا تھا؟۔۔۔ گاؤں تھا جہاں تمہارے دادا کے چچیرے رہتے تھے۔۔۔ کتنا دور تھا دیس سے، پھر پوچھا۔۔۔ اگر زیادہ نہیں تو تیس بتیس کوس تو ہوگا۔۔۔ اب بتاؤ۔ کیا رہ گیا دیکھنے والا پورے ہندوستان یا دنیا میں۔۔۔ ساتھ ہی تایا ابا نے فضلو سے کہا کھانا لگاؤ۔ کھانا کھاتے ہوئے تایا ابا سب پہ نظر رکھتے۔ اور ہماری تو خصوصی شامت آتی۔ یہ کھاؤ، وہ نہیں کھاؤ۔ اور ساتھ ساتھ ابا جان کی گوشمالی بھی ہوتی۔ کہ تم نے اسے یہ کیوں نہیں بتایا کہ گرم اور ٹھنڈا ایک ہی وقت میں نہیں کھانا چاہیے۔ جواباً ابا جان بھی صرف جی، جی ہی کہتے۔

ایک رات کھانے کے بعد تایا ابا اپنے دوستوں سے گپ شپ کر رہے تھے۔ ہم

193 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

بھی ایک کونے میں بیٹھے سنتے رہے۔ بات پھر دیس سے دیس تک ہی ہوتی رہی۔۔۔ تا یا ابا! جب آپ پردیس یعنی یہاں آگئے تو کوئی مشکل پیش آئی یہاں پر۔ ہم پھر مداخلت سے باز نہ آئے۔۔۔ مشکل۔ یہاں تو زندگی عذاب تھی۔۔۔ کیسے؟۔۔۔ بار میں سب سے پہلے تو زمین کی الاٹمنٹ بہت مشکل سے ہوئی۔ جب زمین مل گئی تو کبھی نہری پانی کا مسئلہ کبھی فصل بونے پر لڑائی اور کبھی کاٹنے پر۔۔۔ الجھنیں، جھگڑے، فاقے، بے روزگاری۔ اس کے علاوہ جو کچھ ممکن تھا سب کچھ ہوا۔۔۔ دیس میں تیار فصل کو درانتی نہیں لگائی تھی کہ سکھوں نے دھاوا بول دیا۔۔۔ یہاں آکر لوگوں کی فصلیں دیکھتے تو ہر روز مرتے تھے۔ جس خاندان نے صدیوں سے صرف زمینداری ہی کی ہو۔ اور ہر ہاڑی، سونی پر کمیوں کو گندم، مونجی، چاول، گنا، گڑ اپنے ہاتھ سے دیا ہو اور پردیس میں اپنے کھانے کے لئے بھی کچھ نہ ہو تو وہ مرنے کی دعا ہی کر سکتا ہے یا بٹوارے کو گالیاں دے سکتا ہے۔۔۔ مگر تا یا ابا! آپ کی فصل کہاں گئی یہاں پردیس میں، ہمیں بات سمجھنے میں دشواری ہو رہی تھی۔۔۔ فصل کونسی۔ جب زمین ہی ہمارے پاس نہیں تھی تو فصل کہاں سے آتی۔ زمین الاٹ کروانے کے لئے تمہارے دادا نے کس کس جگہ جوتیاں نہیں چٹنائیں۔ لیکن کوئی سنتا ہی نہیں تھا۔۔۔ کیوں؟ جب ہمارے خاندان کا دعویٰ قانوناً درست تھا۔ تو پھر بات کیوں نہیں سنی جاتی تھی۔ ہم نے پھر پوچھا۔۔۔ سب سے پہلا مسئلہ تو یہ تھا کہ پٹواری مقامی تھا اور ہم مہاجر۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ زمین کسی بھی مہاجر کو الاٹ ہو۔۔۔ چار پانچ سال تک تو پٹواری ہر گرمیوں میں سردیوں اور ہر سردیوں میں گرمیوں میں کام کرنے کا بہانہ کرتا رہا۔۔۔ پھر رفتہ رفتہ اُس نے کہنا شروع کر دیا کہ یہاں الاٹمنٹ ممکن نہیں۔ لیہ یا کہروڑ پکا میں کروا دیتا ہوں۔۔۔ اس کا مطلب ہے کہ مقامی لوگ مہاجروں کا یہاں رہنا پسند نہیں کرتے تھے؟۔۔۔ پہلے پہل تو ایسا ہی تھا جس وجہ سے ہمیں زمین نہیں مل رہی تھی، پانچ سات سالوں کے بعد ایک نیا

قضیہ کھڑا ہو گیا۔۔۔ وہ کیا؟۔۔۔ ہم نے منت سماجت اور سفارش کروا کے پٹواری کو راضی کر لیا۔ تو اُس نے کہا کہ تحصیلدار کو درخواست دیں اور اس سے حکم لے آئیں۔۔۔ اس میں ہمارے شریک بھائی بھی شامل ہو گئے۔ انہوں نے مل ملا کر ہماری زمین بھی اپنے نام الاٹ کروالی۔۔۔ پھر زمین ملی کیسے؟۔۔۔ وہ تو قدرت نے کرم کیا۔ ایک دن میں اور تمہارے دادا پٹواری کے پاس اپنا بلاناغہ رونا رو رہے تھے کہ پٹوار خانے میں ایک لمبے قد اور خشخشی داڑھی والا ادھیڑ عمر شخص داخل ہوا۔ رنگ سرخی مائل تھا۔ اور اُس نے سفید رنگ کا کرتا پہنا ہوا تھا۔ تہہ بند بھی سفید ہی تھا۔ اُسے دیکھتے ہی پٹواری کا تواں انداز ہی بدل گیا۔ جھک کر سلام کیا۔ چٹائی پر اپنے ہاتھ سے ہی جگہ صاف کر کے لجاجت سے کہنے لگا، میاں جی! آج چیونٹی کے گھر ہاتھی کیسے آگیا۔ آپ اور یہاں۔ یہ میرا بخت ہے۔ ساتھ ہی اپنے ملازم کو لسی لانے کا کہا۔۔۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ علاقے کا کوئی معزز شخص ہے جس کی پٹواری قدر کرتا ہے۔۔۔ میاں صاحب نے دورانِ نشست گفتگو کم ہی کی۔ اور جو کی وہ بھی قدرے دھیمے لہجے اور پست آواز کے ساتھ۔۔۔ پٹواری نے اپنے گھریلو مسائل کی پٹاری کھول لی اور ایک ایک مشکل پر میاں صاحب سے دعا کی التجا کرتا رہا۔ جواباً میاں صاحب اسے دعا دینے کے ساتھ تسلی دیتے رہے۔۔۔ اُن کی گفتگو سے میں نے اندازہ کیا کہ میاں صاحب پٹواری کے رشتے دار بھی ہیں۔۔۔ اسی دوران میں نے موقع پا کر اپنی سالہا سال کی پریشانی کا ذکر ایسے کیا جیسے پہلی مرتبہ پٹواری سے ملا ہوں۔۔۔ میاں صاحب نے میری پریشانی سن کر پٹواری سے کہا۔۔۔ تم اس شخص کی مشکل حل کرو، میرا سوہنا رب تیری مشکلیں آسان کر دے گا۔۔۔ اس بات پر میں نے دیکھا کہ پٹواری کا رنگ فق ہوا۔ اور اُس نے مجھے اگلے دن آنے کا کہا۔۔۔ میں ہر روز کی طرح اگلے دن پھر چلا گیا۔ اب پٹواری کا مزاج بالکل اور تھا۔ اُس نے کاغذات نکالے اور دو تین دن دنوں میں ہمارا زمین کا مسئلہ حل

195 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

کر دیا۔۔۔ میں نے پٹواری سے میاں صاحب کا پتہ معلوم کیا۔ وہ ہمارے ساتھ والے گاؤں میں رہتے تھے، جس کا نام چلدھے آلی تھا۔ لیکن وہ گاؤں مقامی لوگوں کا تھا، اس لئے ہمارے خاندان کے لوگ وہاں جاتے ہوئے کتراتے تھے۔ لیکن تمہارے دادا کے اصرار پر میں انہیں چلدھے آلی لے گیا۔ میاں صاحب نے مقامی لوگوں کے برعکس پیار سے بات کی۔ ہم نے اُن کا شکریہ ادا کیا کہ اُن کے کہنے سے ہمارا زمین کا مسئلہ حل ہو گیا۔۔۔ کہنے لگے۔ میں نے تو کیا مسئلہ حل کرنا ہے۔ یہ ذات ہی ہے جو جب چاہے جیسے چاہے مشکل آسان کر دے۔۔۔ ہمیں لسی پلائی۔ کچھ دیر تک ہمارا احوال پوچھتے رہے۔ ہم نے رخصت طلب کی تو انہوں نے دعا کے لئے ہاتھ بلند کئے اور ہمارے حق میں دعائے خیر بھی کی۔۔۔ اچھا تو زمین مل گئی، کتنے سال لگے اس میں؟ ہم نے قدرے اطمینان بھرے لہجے میں پوچھا۔۔۔ مل کہاں گئی۔ الاٹمنٹ ہونا کوئی زمین ملنا ہوتا ہے۔ قبضہ کسی اور کے پاس تھا۔۔۔ ویسے تم جیسے نالائق بھی کم ہی پیدا ہوں گے جسے زمین کے معاملات کا اتنا بھی علم نہیں۔ مجھے تمہیں دیکھنے سے پہلے سمجھ نہیں آتی تھی کہ پرندے اور کیڑے مکوڑے کیسے رزق ڈھونڈھ لیتے ہیں۔ تمہیں دیکھنے کے بعد یقین ہو گیا ہے کہ دو بلکہ چار مرتبہ روزانہ روٹی بغیر عقل کے بھی مل جاتی ہے۔۔۔ اچھا تو بتایا ابا پھر قبضے کا کیا ہوا۔۔۔ ہونا کیا تھا، جو زمینیں ہندو سکھ یہاں چھوڑ کر گئے تھے، ان پر مقامی لوگوں کا قبضہ تھا۔ الاٹمنٹ اگر کسی مہاجر کو ہو بھی جاتی تو وہ قبضہ نہ چھوڑتے۔۔۔ تھانہ کچھری تحصیل سب سے وہ واقف تھے۔ ہمیں تو یہ تک پتہ نہ تھا کہ تحصیل اور محکمہ مال کے دفتر کہاں ہیں۔۔۔ جو زمین ہمیں الاٹ ہوئی۔ اُس کا قبضہ لینے میں ہی پانچ سال لگ گئے اور وہ بھی میاں صاحب نے مقامی قابضین کی منت سماجت کی۔۔۔ ہیں، منت سماجت؟ آپ تو کہتے ہیں کہ اُن کی بات پٹواری بھی نہیں ٹالتا تھا۔۔۔ ہاں پٹواری نے تو نہیں ٹالی لیکن قابضین لیت و لعل سے کام لیتے

196 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

رہے۔۔۔ کیوں، وہ میاں صاحب کی بات نہیں سنتے تھے کیا۔۔۔ وہ تو میاں صاحب کے جدی پشتی مرید تھے۔ ہر ہفتے عشرے بعد وعدہ کرتے کہ زمین چھوڑ دیں گے لیکن پھر مکر جاتے یا کوئی عذر گھڑ لیتے۔۔۔ تایا ابا، وہ کیسے مرید تھے کہ مرشد کا کہا نہیں مانتے تھے۔۔۔ ہاں یہ بھی عجیب معاملہ دیکھا مقامیوں میں۔۔۔ مرشد کا احترام اتنا کرتے کہ اُن کے ڈیرے سے سو قدم پہلے جوتے اتار دیتے۔ کسی فصل کو ہاتھ نہ لگاتے جب تک مرشد کو نیاز نہ پیش کرتے۔ ہر مہینے باقاعدگی سے بھینسوں کا دودھ بھی میاں صاحب کے ڈیرے پہنچاتے۔ اُن کا نام سنتے ہی سر جھکا لیتے۔۔۔ لیکن زمین سے قبضہ نہ چھوڑتے تھے۔۔۔ میاں صاحب نے کبھی اُن کو ڈانٹا نہیں تھا کہ کہا کیوں نہیں مانتے ہو۔۔۔ نہیں ایسا بھی نہیں تھا۔ میاں صاحب ان سے بات اتنے دھیمے انداز میں کرتے جیسے منت سماجت کر رہے ہوں۔ اور وہ ہر فصل کی کٹائی کے بعد زمین خالی کرنے کا کہہ دیتے۔۔۔ اسی قصبے میں کئی سال گزرے۔۔۔ اتنے عرصے میں میاں صاحب کا ہمارے ہاں آنا جانا بھی شروع ہو گیا۔ ایک مرتبہ ان کی موجودگی میں تمہارے ابا نے تمہارے دادا سے سکول کی فیس کے پیسے مانگے۔ تو تمہارے دادا نے ٹال مٹول سے کام لیا، میاں صاحب زیرک آدمی تھے۔۔۔ چُپ رہے۔ لیکن بھانپ گئے۔۔۔ چلدھے آلی جا کر ہماری زمین کے قابضوں کو لے کر ان کے باپ کی قبر پر فاتحہ کے لئے گئے۔ وہاں کھڑے اُن کے مردہ باپ کو پکار کر کہنے لگے۔۔۔ اوسیدو! تم میرے باپ کے مرید اور پھر میرے باپ کے بعد میرے مرید بنے تھے۔ تمہاری اولاد بھی میری مرید ہے۔۔۔ کیوں اپنے بچوں سے نہیں کہتے کہ اپنی قبر میں آگ نہ بھرو، زمین یہیں رہ جائے گی۔ آگ آگے چلی جائے گی۔ اور میں بھی اپنے مالک کو کیا جواب دوں گا کہ اپنے مرید کی قبر میں آگ جلتے دیکھتا رہا اور کچھ نہ کر سکا۔ اس کے بعد روتے رہے اور یہی بات بار بار کرتے رہے۔۔۔ واپس اپنے ڈیرے پر پہنچ کر اپنے کمرے کو کنڈی لگا

197 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

لی اور دو تین دن باہر نہ نکلے۔۔۔ اُن کے خادین نے ہماری زمین کے قابضین کو اطلاع کر دی۔۔۔ وہ بھاگے بھاگے ہمارے گھر آئے اور کہہ گئے آج کے بعد اگر ہم آپ کی زمین پر پاؤں بھی رکھیں تو میاں صاحب ہمیں اپنے ڈیرے سے اٹھا دیں۔۔۔ تمہارے دادا نے کہا کہ تمہاری بوئی ہوئی فصل تیار ہونے والی ہے۔ اس کو اٹھا لو پھر زمین ہمیں دے دینا۔ لیکن وہ نہ مانے۔۔۔ اور رات کے پچھلے پہر میاں صاحب کے ڈیرے ننگے پاؤں پہنچ کر کہہ دیا کہ زمین مالکوں کے حوالے کر آئے ہیں۔ اور آپ کی حکم عدولی کی معافی چاہتے ہیں۔ اگلے روز تمہارے دادا نے جا کر میاں صاحب کو رات والا واقعہ سنایا۔ ان کا بے حد شکریہ ادا کیا اور ساتھ ہی کہا کہ بوئی ہوئی فصل پر ہمارا حق نہیں۔۔۔ میاں صاحب نے فیصلہ سنا دیا کہ موجودہ فصل چلدھے آلی کے غربا میں تقسیم کر دیں۔ اور اُس کے بعد یہ زمین مالکان کے قبضے میں ہوگی۔

پردیس میں ہم نے پہلی فصل گندم کی کاشت کی تھی۔ تایا ابا! کافی دیر چپ رہنے کے بعد بولے۔۔۔ بیل کسی سے مانگ کر زمین میں ہل چلا یا۔ بیج کے لئے پیسے نہیں تھے، منڈی جا کر ایک آڑھتی سے ادھار پیسے لئے تو بوائی ہوئی۔۔۔ دیسی کھاد بھی مانگ تا ننگ کر ڈال لی۔ لیکن پانی کا کوئی بندوبست نہیں تھا۔۔۔ پر تایا ابا! ہمارے علاقے میں تو زمینی اور نہری پانی دونوں موجود ہیں۔ ہمیں قدرے حیرت ہوئی۔۔۔ کیا! تم نے ہمارا علاقہ کب دیکھا۔ تایا ابا نے ہمیں گھورا۔۔۔ جی، یہی نتھو چک کی بات کر رہا ہوں۔۔۔ اچھا، پردیس کہو پھر۔۔۔ جی ٹھیک۔۔۔ پردیس میں پانی تو موجود ہے پھر آپ کو دقت کیوں ہوئی؟۔۔۔ زمین کو پانی نہری ملتا تھا لیکن ہمیں محکمہ پانی دیتا ہی نہیں تھا حالانکہ مالیہ آبیانہ بھی زبردستی لے جاتا تھا۔۔۔ محکمے والے کہتے تھے کہ اپنا پانی منظور کرواؤ۔ اور منظور کروانے کے لئے رشوت مانگتے تھے۔ تمہارے دادا رشوت دینے پر موت کو ترجیح دیتے تھے۔۔۔ ایک مرتبہ میں نے محکمے سے وعدہ کر لیا کہ ایک تہائی فصل

198 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

کٹائی کے بعد اٹھالے لیکن پانی دے دے۔۔۔ ایک ہی رات ہماری فصل کو پانی ملا، فجر کے وقت یہ خبر تمہارے دادا کے پاس پہنچ گئی کہ میں نے ایک تہائی فصل بطور رشوت دینے کا وعدہ کیا ہے۔ تو انہوں نے پہلے مجھے ڈانٹ ڈپٹ کی پھر گھر سے ہی نکال دیا۔ یوں پانی پھر بند ہو گیا۔۔۔ ہمارے ساتھ والی زمین ایک مقامی زمیندار کی تھی۔ اُس نے محکمے کو دے دلا کروہ پانی حاصل کرنا شروع کیا ہوا تھا۔۔۔ نتھو چک کے سارے مہاجروں کے حصے کے پانی کے ساتھ کم وبیش یہی ہو رہا تھا۔۔۔ کبھی بارش کی چند بوندیں آگرتیں تو ہماری عید ہو جاتی۔۔۔ ادھر فصل پکنا شروع ہوئی تو آڑھتی کے بندوں نے چکر لگانا شروع کر دیے۔ کہ کب اور کیسے اُن کا حصہ پہنچایا جائے گا۔ میں نے احتیاط کرتے ہوئے زمین کی الاٹمنٹ کے وقت آنے جانے کے راستے کا خیال رکھا تھا تا کہ بعد میں دقت نہ ہو۔ لیکن جونہی آڑھتی کی پہلی ٹرائی گندم کا حصہ اٹھانے پہنچی تو ساتھ والے مقامی زمیندار نے آسمان سر پر اٹھا لیا کہ ٹرائی کے پیسے اُس کے کھیت کے اندر سے گزر رہے ہیں جس سے اُس کی ساری فصل تباہ ہو گئی ہے۔ میں نے اور تمہارے دادا نے بہت کہا کہ ٹرائی کے پیسے تمہارے کھیت کے اندر راستے کے ساتھ دو تین فٹ تک تو گئے ہیں۔ اس سے ساری فصل کیسے تباہ ہو گئی۔۔۔ لیکن وہ نہ مانا اور ٹرائی لانے والوں سے جھگڑ کر اسے خالی واپس بھیج دیا۔ آڑھتی ہمارے کھیت میں آ کر بیٹھ گیا کہ فصل لے کر ہی جائے گا۔ ساتھ والا زمیندار بضد کہ ٹرائی فصل اٹھانے نہیں آئے گی۔ بات میاں صاحب تک پہنچی تو انہوں نے اپنی بیل گاڑی بھیج دی کہ اس پر فصل رکھ کر آڑھتی کو فارغ کر دیں۔۔۔ اب باری آگئی ہماری فصل اٹھانے کی۔ کئی دن تک ہمارے خاندان سمیت باقی مہاجروں کی فصل کھیتوں میں پڑی رہی۔ چلدھے آلی کے مقامی ہر مہاجر کے ساتھ حیلوں بہانوں سے تکرار کرتے جائیں اور فصل اٹھانے نہ دیں۔ آدھی برداشت کھلے آسمان تلے برباد ہو گئی، باقی میں سے کچھ چلدھے آلی کے کمی

199 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

لے گئے جبکہ تین چار مہاجروں کے کھیتوں سے فصل رات کو چور اٹھا کر لے گئے۔۔۔
 بھینسیں، گائیں، بیل جو چند ایک ہمارے خاندانوں کے پاس تھے۔ وہ بھی پچھلے ایک
 دو سالوں میں چوری ہو چکے تھے۔۔۔ فصل چوری ہونے کے بعد کھوجی بلایا گیا تو
 چوروں کا کھڑا چلدھے آلی جانکا۔۔۔۔۔ اب ہمارے بزرگوں نے رات کے وقت اکٹھے
 کیا۔ جس میں طے پایا کہ مل کر اپنے حقوق کا دفاع کرنا ہوگا۔۔۔ اگلے ہی روز میرے
 چچیرے شرفو کی ایک مقامی زمیندار سے تو تکار ہو گئی تو شرفو نے اُس کو دو تین تھپڑ جڑ
 دیے۔ شرفو کا قد ساڑھے چھ فٹ اور بدن بھاری بھر کم تھا۔ مقامی زمیندار کو غش
 آگیا۔۔۔ میں نے بھاگ کر بیچ بچاؤ کرایا۔۔۔ اور مقامی زمیندار کو اپنی بیٹھک اٹھا کر
 لے آیا۔ پانی پلایا، کھانا کھلایا۔ دلجوئی کی۔۔۔ اتنے میں چلدھے آلی خبر پہنچ گئی کہ اُن
 کے آدمی کو مار پیٹ کر اٹھا کر لے گئے ہیں۔۔۔ وہاں سے ایک جتھانٹھو چک پہنچا اور
 شرفو کو ڈھونڈ کر اتنا مارا کہ اُس کی کئی ہڈیاں ٹوٹ گئیں۔۔۔ ہمارے یہاں پٹنے والے
 مقامی زمیندار نے چلدھے آلی پہنچ کر اپنی کہانی سنائی تو بات مختلف نکلی۔۔۔ ادھر ہم
 لوگ شرفو کو ہسپتال لے گئے۔ رات کو شرفو کے گھر پھر بزرگوں کا اکٹھا ہوا جس میں طے ہوا
 کہ سارا معاملہ میاں صاحب کے سامنے رکھا جائے۔ لیکن ہمارے خاندان کے سارے
 نوجوان یہ بات ماننے کے لئے تیار نہ تھے اور بدلہ لینے کی بات کرتے
 تھے۔۔۔ نوجوانوں نے آدھی رات کو اپنا خفیہ اکٹھا کر کے شرفو کو مارنے والوں کے گھر پر
 حملہ کر دیا۔ رات کی تاریکی میں ڈنڈے لاٹھیاں برسائیاں، بیچ میں چلدھے آلی کی
 عورتیں کود پڑیں۔ اُن کو بھی چوٹیں لگیں۔۔۔ علی الصبح یہ خبر نٹھو چک پہنچی تو اندازہ ہوا کہ
 اب مصالحت ممکن نہیں رہی۔ اب لڑائی ہی ہوگی۔۔۔ دس، گیارہ بجے کا وقت ہوگا۔ کہ
 مقامیوں کا ایک جتھا۔ لاٹھیاں ڈنڈے پکڑے حملہ آور ہو گیا۔ ہمارے سارے مرد بھی
 تیار تھے۔ ایک دوسرے پر لاٹھیاں برسائی گئیں۔ جس کے جوہاتھ آیا اُس نے مخالف کو

Contact for Thesis Composing and Final Setting | 0303-761-96-93

201 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

فوری جواب نہ دیا۔ ہفتے دس دن کے بعد کہنے لگے۔ پنچایت کرنا پڑے گی۔ کوشش کرتے ہیں کہ مقامی اور مہاجروں دونوں کو سمجھائیں۔ اور اس دلدل سے نکالیں۔۔۔ میاں صاحب نے اپنے انداز میں دونوں گروہوں کے ساتھ بیسیویں مرتبہ علیحدہ علیحدہ نشست کی۔ دونوں کے گلے شکوے سنے۔ تجاویز لیں اور دیں کہ کس طریقے سے فریقین میں ایک دوسرے کے لئے قبولیت پیدا کی جاسکے۔ اس سلسلے میں پہلی پیش رفت ہوئی کہ دونوں گروہوں کو یہ منوانے میں کامیاب ہو گئے کہ وہ کوئی مزید کارروائی نہیں کریں گے۔ اور دوسری یہ کہ جب تک میاں صاحب اس معاملے میں کسی حتمی رائے اور فیصلے تک نہ پہنچیں، اُس وقت تک پچھلی رنجش کو عارضی طور پر ہی سہی، پر بھلا دیا جائے۔۔۔ میاں صاحب کا یہ حربہ کئی سال کامیاب رہا۔ کیونکہ وہ ہر فریق سے مسلسل بات چیت کر کے لائحہ عمل طے کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس کام میں تین چار سال گزر گئے تو کوئی نیا واقعہ نہ ہونے سے پرانے زخم مندمل ہونا شروع ہو گئے۔۔۔ ایک دن خبر آئی کہ ڈپٹی کمشنر میاں صاحب کے ڈیرے میں آئے تھے اور میاں صاحب نے اُن سے کہا ہے کہ پٹواری، محکمہ نہر اور دیگر متعلقین کو پابند کر دیں کہ وہ دونوں گاؤں کے زمین اور نہری پانی کے معاملات قانون کے مطابق فوراً نبٹائیں۔ ڈپٹی کمشنر میاں صاحب کا قریبی عزیز تھا۔ اُس نے تمام عملے کو پابند کر دیا کہ ایک مہینے کے اندر دونوں گاؤں کے زمینی معاملات مکمل کر کے پیش کر دیے جائیں۔ اگلے ہی روز سے میاں صاحب کے ڈیرے پر تمام عملہ اور ساکلمین جمع ہونا شروع ہو گئے۔ میاں صاحب عملے کے ہمراہ سب کی بات سن کر اور قرآن پر حلف دلا کر فیصلے کرتے رہے۔ مقامی ہونے کی وجہ سے انہیں براہ راست معلومات تو پہلے سے تھیں۔ دو ہفتوں میں قضیے نبٹ گئے۔۔۔ کچھ دنوں بعد میاں صاحب نے اپنے ڈیرے پر چیدہ چیدہ نمائندہ افراد کا اکٹھ کر کے لڑائی اور قتل والے معاملے پر فریقین میں صلح کروادی اور انہوں نے ایک

202 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

دوسرے کو معاف کر دیا۔۔۔ اُس دن کے بعد ہمارا خاندان اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔ مقامیوں اور مہاجروں کی براہ راست لڑائی ختم ہو گئی۔۔۔ کئی سال گزرنے کے بعد میاں صاحب نے ایک ڈیرہ ہمارے گاؤں میں بھی بنالیا۔۔۔ اس کی کیا ضرورت پیش آئی تھی؟ ہم نے مزید تجسس کا مظاہرہ کیا۔۔۔ یہ بات ہمیں سمجھ نہ آئی تھی، لیکن میاں صاحب کے احترام کی وجہ سے اس پر کسی نے اعتراض نہ کیا۔۔۔ اگلے پندرہ بیس سال وہ ہفتے میں دو تین دن ننھو چک میں ہی گزارتے تھے۔ جب وہ یہاں ہوتے تو چلدھے آلی کے لوگ بھی اُن سے ملنے آجاتے۔ مذہبی تہوار اور مجلسیں جیسے چلدھے آلی میں وہ کرواتے تھے، ویسی ہی یہاں بھی شروع کر دیں۔ جن دنوں میں وہ یہاں ہوتے، اُن کے گاؤں سے دس بیس لوگ انہیں ملنے یہاں آجاتے۔ یہاں ان کی مجلس کے بعد کھانا بھی ہوتا۔ جسمیں دونوں گاؤں سے لوگ شامل ہوتے رہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ پندرہ بیس سالوں کے بعد یونین کونسل کے ایک انتخابی معرکے میں دونوں گاؤں کے امیدوار مقابلہ کر رہے تھے۔ جب ووٹ گنے گئے تو ننھو چک کے نصف ووٹ چلدھے آلی اور اُن کے بھی اتنے ہی ہمارے حق میں نکلے۔۔۔ اس انتخاب کے چند دنوں کے بعد میاں صاحب کے پاس بیٹھا انتخابات کا ذکر کر رہا تھا تو انہوں نے بے ساختہ کہا برسوں کی محنت رنگ لے آئی ہے۔ اب ننھو چک والے ڈیرے کی ضرورت نہیں رہی۔ یہاں بچیوں کا اسکول بنا دیں گے اور وہ واپس اپنے گاؤں والے ڈیرے میں چلے جائیں گے۔

غالباً ستر کی دہائی کے اواخر کا ذکر ہے۔ کہ کسی خاتون نے ہماری والدہ کو بتایا کہ ان کا بھانجا اشفاق اپنے خاندان سمیت وہابی ہو گیا ہے۔۔۔ والدہ اس افواہ پر یقین کرنے کے لئے بالکل تیار نہ تھیں۔ لیکن اطلاع دینے والی خاتون مصر تھیں کہ خبر بالکل درست ہے۔ اُس کے اعتماد سے تنگ آکر والدہ نے کہا، اچھا پوچھ لیتے ہیں اشفاق

203 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

سے۔۔۔ اشفاق ہماری سب سے بڑی خالہ کا پہلوٹھی کا بیٹا تھا۔ چھوٹے کا نام مشتاق اور بیٹی کا نام طاہرہ تھا۔۔۔ ہماری خالہ کے گاؤں کا نام گھیالہ خورد ہے۔ یہ گاؤں جلدھے آلی گزر کر قریباً آدھ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔۔۔ چند دنوں بعد والدہ گرامی نے ہمیں ساتھ لیا اور بڑی خالہ کے ہاں جا پہنچی۔۔۔ حسب معمول خالہ تپاک سے ملیں۔ ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں۔ اپنے جوڑوں کے درد کا حال سنایا۔ خالو جان کی کم آمدنی اور لا پراہی کا تذکرہ بھی ہوا۔ فصل کی کم پیداوار کی بات بھی ہوئی۔ ہمیں کھانا بھی کھلا دیا۔۔۔ تین چار گھنٹے ہو چلے تو ہم نے والدہ کے کان میں کہا، یہاں تو کوئی تبدیلی نہیں آئی ہوئی، سب کچھ پہلے جیسا ہی ہے۔۔۔ والدہ نے ہمیں گھور کر دیکھا، کیا تبدیلی ہو سکتی ہے یہاں۔ سب کچھ ویسے کا ویسا ہی ہے۔۔۔ خواہ مخواہ افواہ پھیلا دی ہے کہ وہابی ہو گئے ہیں۔۔۔ اتنے میں اشفاق آگیا۔ بچپن میں اسے ہماری والدہ نے ہی پالا تھا۔۔۔ وہ دیکھتے ہی والدہ کے قدموں میں جھک گیا۔۔۔ انہوں نے جواباً دعا دی اور پوچھا کدھر سے آئے ہو۔ کہنے لگا، نماز پڑھنے کے بعد درس میں بیٹھ گیا تھا۔ اس پر والدہ کا ماتھا ٹھنکا۔۔۔ کونسا درس؟۔۔۔ جی وہ ہم یہاں درس کرواتے ہیں تاکہ لوگوں کو اصل دین کا پتہ چل جائے۔۔۔ اصل دین! اشفاق یہ اصل دین کیا ہے۔۔۔ والدہ نے حیرانی سے کہا۔۔۔ جی، خالہ اصل دین وہی ہے جو اصل میں تھا۔ جس میں ملاوٹ کر دی گئی۔۔۔ ملاوٹ کیا مطلب؟ دین تو دین ہوتا ہے۔۔۔ یہ کوئی دودھ ہے جس میں پانی ملا دیا جائے۔۔۔ جی، خالہ بس دین کے ساتھ بھی دودھ والا ہی معاملہ ہو گیا ہے۔ اس میں پانی ملا دیا گیا ہے۔۔۔ کیا مطلب اشفاق! والدہ کو کچھ سمجھ نہ آیا۔۔۔ جی، خالہ دراصل دین میں بہت ساری چیزیں شامل کر کے اس کی تاثیر ہی اور کر دی گئی ہے، جیسے آپ نے کہا کہ دودھ میں پانی ملا دیں تو وہ دودھ نہیں رہتا، لسی بن جاتا ہے۔۔۔ نہ، یہ بتا۔ دین میں کونسا پانی ملا دیا گیا ہے۔ والدہ نے پوچھا۔۔۔ جی، خالہ جیسے ہمارے ہاں ختم

204 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

دلایا جاتا تھا۔ یہ کسی دین کا حصہ نہیں۔ کھانے پینے کے ڈھکونسلے تھے۔ میں نے تو اپنے گھر میں بند کر دیا ہے۔ آپ بھی ختم نہ دلایا کریں۔۔۔ کیا، کیا کہا تم نے۔ ختم نہ دلایا کریں۔ تو اور کیا کریں۔ ہماری والدہ نے خفگی اور حیرانی کی ملاوٹ کی۔۔۔ اور یہ کہ نماز پڑھیں، روزے رکھیں، زکوٰۃ دیں، حج کریں۔۔۔ یہ سب تو ہم کرتے ہی ہیں۔۔۔ پر ختم سے تو برکت ہوتی ہے، قرآن پاک پڑھا جاتا ہے۔ بچوں اور غریبوں میں بانٹا جاتا ہے۔ اس میں کیا برائی ہے۔ والدہ نے اپنی دانائی سے، اشفاق کو قائل کرنے کی کوشش کی۔۔۔ خالہ یہ حدیث میں تو کہیں نہیں لکھا ہوا۔۔۔ ہیں۔ حدیث میں نہیں لکھا ہوا۔ تمہیں کیسے پتہ ہے۔۔۔ میں نے حدیث پڑھی ہے۔۔۔ کہاں پڑھی ہے تو نے۔۔۔ تُو تو تین سالوں سے بی۔ اے میں فیل ہو رہا ہے۔ حدیث کہاں پڑھ لی تم نے، حدیث تو بڑے بڑے مولوی پڑھ سکتے ہیں۔۔۔ بی۔ اے کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ میں نے اسی لئے اپنے گاؤں کے ایک عالم کے گھر سے حدیث پڑھنا شروع کر دی تھی۔۔۔۔۔ بزرگوں کے مزارات پر جاتے ہو کہ نہیں، ہماری والدہ گرامی نے وہابیت کا دوسرا لیبارٹری ٹیسٹ شروع کیا۔۔۔ خالہ وہ تو سخت گناہ ہے بلکہ شرک ہے۔ مجھے اللہ نے سیدھی راہ دکھا دی ہے۔ اور امی جان کو بھی۔۔۔ اُس نے بڑی خالہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔۔۔ کیا مطلب ہے تمہارا۔ تم وہابی ہو گئے ہو۔ اب ہماری والدہ کی پریشانی دیدنی تھی۔۔۔ وہابی نہیں، خالہ اہلحدیث ہوں۔ خالص دین پر عمل کرنے والا۔۔۔ یہ اہلحدیث کیا ہوتا ہے۔ دوران گفتگو، والدہ گرامی نے پہلی مرتبہ ہمیں بھی اس قابل سمجھا کہ کچھ ہم سے بھی دریافت کر لیں۔۔۔ اہلحدیث کا مطلب ہے حدیث والا۔ یہ وہابی کو ہی کہتے ہیں۔ ہم نے عالمانہ انداز میں کہا۔۔۔ لا حول ولا قوۃ۔ والدہ نے پڑھا۔ ساتھ ہی شکایت کے ساتھ خالہ کی طرف دیکھا۔۔۔ انہوں نے قدرے اطمینان سے کہا۔ اشفاق حدیث پڑھتا ہے، مجھے اور باقی گھر والوں کو بھی پڑھ

205 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

کے سناتا ہے۔۔۔ اس کو اللہ نے ہدایت دے دی ہے۔ اب ہم سارا گھراہلحدیث ہو چکے ہیں۔ تم بھی اشفاق سے سنا کرو اور چھوڑو گمراہی کی باتیں۔۔۔ جی، آپا! کیا مطلب ہے آپ بھی وہابی ہو گئیں ہیں۔۔۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ آپ تو بہت سمجھدار ہیں۔ اشفاق کو سمجھائیں۔ یہ کیا کہہ رہا ہے کہ ختم نہ دلاؤ اور مزارات پر نہ جاؤ۔۔۔ ٹھیک ہی کہہ رہا ہے، تم بھی یہ کام چھوڑ دو اور خالص دین کی طرف آ جاؤ۔۔۔ خالص دین کیا۔ ہمارا دین نا خالص ہے۔ یہ آپ نے نئی بات گھڑ لی ہے۔ خالص دین۔۔۔ خالہ نے قدرے پیار اور متانت کے انداز میں کہا۔۔۔ پہلے پہل جب اشفاق نے مجھے یہ بات کہی تھی تو مجھے بھی ایسے ہی لگی تھی جیسے تمہیں لگ رہی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ اس نے جو درس سنا، مجھے بھی سناتا رہا۔ اب میں تو مطمئن ہو گئی ہوں۔۔۔ ہماری والدہ کو ایسی تشریح کی ہرگز توقع نہ تھی۔ سٹیٹا کر بولیں۔ اس کا مطلب ہے کہ لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ سارا ٹبر ہی وہابی ہو چکا ہے۔۔۔ وہابی نہیں، اہلحدیث خالہ جانی۔ ہماری والدہ اور خالہ دونوں کی لاڈلی طاہرہ بولی۔۔۔ یہ سن کر تو والدہ گرامی کو کچھ بھائی نہ دیا۔ کہ طاہرہ جیسی فرمانبردار بچی بھی ایسے بول سکتی ہے۔۔۔ والدہ کا موڈ انتہائی خراب دیکھ کر خالہ کا چھوٹا بیٹا مشتاق بولا۔۔۔ خالہ آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں۔ آپ ختم دلائیں، مجھے بھی کھلائیں۔ جس مزار پر بھی جانا ہو مجھے بتائیں۔ میں آپ کو لے کر جاؤں گا۔ اس پر ہماری والدہ کی پریشانی کا پارہ تھوڑا نیچے آیا۔۔۔ لیکن ساتھ ہی خالہ کا پارہ چڑھ گیا۔۔۔ گمراہ، گستاخ، کھانے کے لئے ہر جگہ دُم ہلانے کو تیار، دفع ہو جا۔ کسی بڑے کی شرم حیا نہیں تجھے۔ نہ بڑے بھائی کی، نہ بہن کی نہ ماں کی۔ دور ہو جا میری نظروں سے۔ مشتاق کی ایسی دُرگت بنی کہ اُس نے وہاں سے کھسکنے میں ہی عافیت جانی۔۔۔ اب والدہ گرامی اور خالہ دونوں خفا بیٹھی ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔۔۔ والدہ نے مجھے کہا، اٹھو چلیں۔۔۔ میں بھائی صادق سے بات کرتی

206 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

ہوں۔۔۔ صادق ہمارے ماموں جان تھے جو ہماری والدہ سے بڑے اور خالہ سے چھوٹے تھے۔۔۔ ہونہہ صادق۔ اُسے دین سے کیا لینا دینا۔ اُس کا دین دنیا آخرت سب اُس کی بیوی اور سسرال ہے۔ اُسے کسی اور چیز سے کیا مطلب۔ خالہ نے ماموں جان کا معمول کا تعارف دہرایا۔۔۔ ہمارے خاندان کی تاریخ کے مطالعے اور مشاہدے کے مطابق، اس جملے کے بعد دونوں بہنوں کا باہم شیرشکر ہونا لازم تھا۔ لیکن یہ پہلا موقع دیکھا ہم نے کہ ایسا کارگر نسخہ بھی بہنوں کے درمیان نظریاتی اتفاق پیدا نہ کر سکا۔۔۔ والدہ نے ہمیں بازو سے پکڑا اور واپس گھر چلنے کا حکم دے دیا۔۔۔ گھر پہنچ کر دو تین دن کسی سے بات نہیں کی۔۔۔ نماز، روزے کی تو ہمیشہ سے ہی پابند تھیں۔ نماز کے بعد طویل دعا کرنے لگیں۔۔۔ ہم نے چپکے سے سنا تو معلوم ہوا کہ خالہ اور اُن کے خاندان کی گمراہی کو پلٹنے کی دعا زیادہ کرتی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ باقی خاندان کے لئے اس خالص دین سے بچنے کی بھی۔۔۔ جب مزاج معمول کے مطابق ہو گیا تو ماموں جان، نانا جان، تایا جان اور سب سے آخر میں ابا جان سے اس کا تذکرہ کر دیا۔۔۔ سب کو اس بات سے سخت صدمہ پہنچا لیکن حل کسی کے پاس نہ تھا۔ اگلے دو تین سال خاندان کے وفد دگا ہے بگا ہے خالہ جان کے پاس بغرض اصلاح جاتے رہے۔۔۔ خالہ جان کے خاندان کے وکیل اشفاق بھائی حدیث سے حوالہ طلب کریں جبکہ اصلاحی وفد انہیں اُس بات پر قائل کرے کہ ہم اور ہمارے آباؤ اجداد سب درست ہیں۔ دین ہمارا ہی درست ہے، تم لوگ وہابی ہو کر بھٹک چکے ہو۔۔۔ نتیجہ یہ نکلا کہ فریقین اپنے اپنے موقف پر مزید سختی سے کاربند ہو گئے۔ اور عملاً ایک دوسرے کو ناقابل اصلاح سمجھ کر، تبدیل کرنے کی جدوجہد ترک کر بیٹھے۔

گھیا لہ خورد میں آنے والے سالوں میں دین خالص کی تحریک نے زور پکڑا اور اکثریت اہلحدیث ہو گئی۔ لیکن گاؤں میں دو مساجد تھیں جن کا امتیاز ہمارے علاقے

207 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

کے رواج کے عین مطابق کوئی مذہبی یا فکری و مسلکی نہ تھا۔۔۔ ہمارے یہاں مسلمانوں کی عبادت گاہیں دو قسم کی تھیں۔۔۔ سنیوں کی مسجدیں اور شیعہوں کے امام باڑے۔۔۔ اب صورت حال کچھ یوں تھی۔ کہ ہمارے گاؤں ننھو چک میں تین مسجدیں جن کی تفریق برادریوں کے ناموں سے کی جاتی تھی۔ جاٹوں کی مسجد، راجپوتوں کی مسجد اور شیخوں کی مسجد۔ تینوں مذہبی لحاظ سے سنی۔ چلدھے والی میں ایک امام باڑہ اور اُس سے ملحق ایک مسجد۔ کیونکہ سارا گاؤں مقامی آبادی پر مشتمل اور تقریباً سب لوگ شیعہ مسلک سے جڑے ہوئے تھے۔ گھیالہ خورد میں دو مسجدیں۔ ایک جاٹوں کی اور دوسری راجپوتوں کی۔ دونوں سنی۔۔۔ عملاً صورت حال یہ کہ کم ہی لوگوں پتہ تھا کہ سنی، شیعہ اور وہابی مسلک میں فرق کیا ہے۔ البتہ امام باڑے میں ماتم ہوتا تھا، مجلس ہوتی تھی اور سیاہ رنگ کا ایک جھنڈا لگا ہوا تھا۔۔۔ اسی کی دہائی کے ابتدائی سالوں تک اشفاق بھائی کو وہابی ہوئے چار پانچ سال گزر چکے تھے۔ اب اشفاق اور خالہ جان کے خاندان سے وہابی یا سنی کے موضوع پر براہ راست گفتگو ترک ہو چکی تھی لیکن بالواسطہ انہیں زچ ضرور کیا جاتا تھا۔ کبھی یہ کہہ کر کہ جس نے بچت کرنی ہو وہ وہابی ہو جائے کہ ختم دلانے کے پیسے بچ جاتے ہیں۔ اور کبھی یہ کہہ کر دین تو اب ہی آیا ہے، پہلے تو سب کچھ غلط ہی ہوتا تھا۔۔۔

گھیالہ خورد میں موجود دونوں مساجد بدستور سنی مذہب سے ہی متعلق رہیں۔ وجہ اُس کی یہ تھی کہ دونوں کے پیش امام جن مدرسوں سے پڑھے تھے۔ وہ وہابی نہ تھے۔ اور دونوں اماموں کو جب بھی کوئی فکری الجھن ہوتی تو وہ اپنے مدرسے اور اساتذہ سے رہنمائی لیتے۔ انہوں نے سختی سے اپنے مسلک سے جڑے رہنے کی تلقین کر دی۔ اب گاؤں میں اہلحدیثوں کی تعداد کافی ہو چکی تھی۔ انہیں ایک مسجد کی تلاش تھی۔ جو مسجدیں موجود تھیں، وہ انہیں گھسنے نہ دیتی تھیں اور نئی مسجد کے لئے اُن کے پاس وسائل نہ تھے۔

208 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

کبھی اسکول میں جمعہ پڑھتے، کبھی بچوں کے کھیل کے میدان میں۔۔۔ لیکن بارش، دھوپ، سے بچنے کے لئے چھت ضروری تھی۔۔۔ اشفاق بھائی اور اُن کے ہم نوائے اس کا ایک انوکھا حل نکالا۔۔۔ گاؤں میں سکھوں کا گوردوارہ تھا۔ جو بٹوارے کے بعد متروک ہو چکا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ عمارت کمزور اور شکستہ ہو چکی تھی۔ دہائیوں تک مرمت نہ ہونے سے اس پر بھوت بنگلے کا گمان ہوتا تھا۔ عرصہ دراز تک لوگ اس میں مویشی بھی باندھتے رہے تھے۔ اب اس عمارت کے گرنے کا ہی انتظار کیا جا رہا تھا۔۔۔ لیکن اشفاق بھائی نے اس میں مسجد اہلحدیث قائم کر کے، اسے سات دن تک دھویا۔ رگڑا، مانجا۔۔۔ تاکہ اس سے گندگی ختم ہو جائے اور یہ پاکیزہ ہو جائے۔ پھر اس میں نماز باجماعت شروع کر لی۔۔۔ پہل پہلے تو گوردوارے میں مسجد بننے پر کیا رائے دی جائے، کسی کو سمجھ نہ آئی۔ پھر دو چار مہینوں میں کہا جانے لگا کہ نجس جگہ پر نماز نہیں ہوتی۔۔۔ اہلحدیثوں نے ایک ایک آدمی کو بتایا کہ انہوں نے گوردوارے کو دھو کر پاکیزہ کر لیا ہے۔ یہ مسجد ہے اور پاکیزہ جگہ ہے۔۔۔ اب اس مسجد میں لاؤڈ اسپیکر بھی لگ گیا۔ چند ماہ بعد اس مسجد میں کسی غیر مقامی مولوی کو جمعہ پڑھانے کے لئے بلا لیا گیا۔ گاؤں کے بچے کھچے سنی اور دین خالص کی طرف رجوع کر جانے والے چونکہ تھے تو ایک ہی برادری، نسل اور گاؤں کے لوگ۔ اس لئے ان کے آپس میں سماجی تعلقات اس فرقہ وارانہ معاملے کے باوجود قائم تھے۔ جس کی وجہ سے معمول کی دیہاتی مروت موجود رہی۔ نئے مولوی صاحب کا اس ماحول کے ساتھ ایسا کوئی ناٹھ نہ تھا۔ انہوں نے پہلے ہی جمعہ میں سنیوں کو مشرک قرار دے دیا۔ جن کے لئے دین اور دنیا میں سوائے رسوائی کے کوئی جگہ نہ تھی۔ یہ بات پہلے سے موجود مسجدوں تک پہنچی تو وہاں کے منبروں سے بھی مخالفت بلکہ نفرت کا اظہار شروع ہو گیا۔ قریباً سال دو سال میں نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک دوسرے کا وجود ناقابل برداشت ہو گیا۔۔۔ پرانی مسجدوں کے مولویوں

نے فتویٰ دے دیا کہ گوردوارے کو دھونے کے باوجود اس میں نماز اس لئے ناجائز ہے کہ یہ گوردوارہ تھا جس پر ناجائز قبضہ کیا گیا ہے۔ تو یہاں پر نماز ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔۔۔ اس نکتے کا وہابیوں کے پاس خاطر خواہ جواب نہ تھا۔۔۔ اگرچہ انہوں نے کہا کہ سکھوں کے جانے کے بعد یہ ریاست کی ملکیت ہے اور ریاست کی جگہ پر مسجد بنائی جاسکتی ہے لیکن اس بات کی کسی کو سمجھ نہ آ سکی۔ پرانی مسجدوں کے مولوی اور اُن کے پکے نمازی گاؤں میں کہتے پھرتے کہ سکھوں کے گوردوارے پر قبضہ کر کے پتہ نہیں کس ریاست نامی آدمی کا نام لے رہے ہیں۔ حالانکہ بٹوارے سے پہلے کے لوگ ابھی زندہ ہیں، وہ تو کہتے ہیں ریاست نام کا آدمی تو مسلمان تھا اور بیس پچیس سال پہلے مسلمان ہی مرا تھا، گوردوارہ اُس کا کیسے ہو گیا۔۔۔ بات بڑھتے بڑھتے یہاں تک آ گئی کہ سنی مسجد کے مولوی اور نمازی کہنے لگے کہ یہ دین، نماز اور شعائر اسلام کی توہین ہے کہ وہ سکھوں کے گوردوارے میں ادا کئے جائیں۔۔۔ ہم اسے بزور گرا دیں گے۔۔۔ اشفاق بھائی نے جب یہ شدت محسوس کی تو دو کام کئے۔ پہلا تو غیر مقامی وہابی مولوی برخاست کیا جو بات بات پر باقیوں کو مشرک قرار دیتا تھا۔ اور ایک گاؤں کے نوجوان کو مولوی مقرر کر لیا۔ جس سے حالات میں معمولی تبدیلی آ گئی لیکن قضیہ رفع نہ ہوا۔۔۔ پنچائت ہوئی تو اہلحدیثوں نے ایک قیمتی نکتہ پکڑ لیا۔ کہ اگر نماز نہیں ہوتی تو ہماری نہیں ہوتی، سنیوں کو کیا مسئلہ ہے ہماری نماز ہو یا نہ ہو۔۔۔ دنیا داری کے لحاظ سے تو بات ٹھیک تھی لیکن سنیوں کے مولویوں کا موقف اب یہ ہو گیا کہ ہم نماز اور شعائر اسلام ایک ناجائز، نجس جگہ پر ہوتے دیکھتے رہیں تو کل قیامت کو اس کا حساب کون دے گا۔۔۔ اس لئے نماز اس گوردوارے میں نہیں ہو سکتی اور نہ ہی اسے مسجد کہا جاسکتا ہے۔۔۔ جیسے ملا کی دوڑ مسیت تک ہوتی ہے، ویسے ہی اشفاق بھائی سمیت دیگر پکے اہلحدیث ایک رات میاں صاحب کے پاس پہنچے۔۔۔ میاں صاحب کے ڈیرے میں

210 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

ہی اُن کے والد کا مزار بھی تھا اور بلا ناغہ جو لنگر تقسیم ہوتا تھا، اُس پر ختم بھی پڑھا جاتا تھا۔۔۔ میاں صاحب نے لنگر پیش کیا تو اشفاق بھائی سمیت سب نے یہ کھانا کھانے سے انکار کر دیا اور اصرار کیا کہ آپ ہماری بات سنیں، اپنے ناجائز بلکہ ایک ’نووہابی‘ جو ان کے بقول غیر اللہ کے نام پر پکے والے نجس کھانے کو ہم سے دور ہی رکھیں۔۔۔ میاں صاحب یہ سن کر حسب معمول چپ تو ہو گئے لیکن چہرے کے تاثرات سے یوں لگا کہ انہیں یہ بات ہضم کرنے میں کافی تکلیف ہوئی ہے۔۔۔ چند منٹوں بعد انہوں نے اپنے خادم خاص کو بلا کر کہا۔ ان کے گاؤں گھیالہ خورد جا کر انہی کے کسی ہم مسلک کی دکان سے فوراً پکانے کی اشیاء لائیں۔ دوبارہ کھانا پکائیں اور مہمانوں کو کھلائیں۔ تاکیداً یہ بھی کہا، اس کھانے پر ختم نہ پڑھا جائے۔۔۔ اب تمام اہلحدیث چپ بلکہ قدرے شرمسار ہو گئے۔ انہوں نے لاکھ انکار کیا، ممنونیت کا بھی اظہار کیا کہ میاں صاحب آپ ہماری بات سن لیں، کھانے کو چھوڑیں۔۔۔ لیکن میاں صاحب اپنے معمول کے مطابق نرم گوئی سے کہتے رہے۔ آپ کا اکرام مجھ پر لازم ہے۔ براہ کرم کھانا کھائیے۔ اور ساتھ ساتھ اپنا مسئلہ بھی بتائیے۔۔۔ بالآخر آنے والے وفد نے کھانا کھایا تو میاں صاحب نے توجہ سے ساری بات سنی۔۔۔ کہنے لگے، اللہ کا نام تو زمین کے چپے چپے پر لیا جاسکتا ہے۔ گوردوارے میں بھی، مسجد میں بھی۔۔۔ اشفاق بھائی نے کہا کہ پھر آپ سنیوں کو سمجھائیے۔ میاں صاحب نے پیغام بھجو کر سنیوں کے مولوی اور اُن کے تمام اہم افراد کو اپنے ڈیرے پر بلا لیا۔۔۔ انہوں نے پھر ناجائز قبضے والی بات شروع کر دی۔۔۔ میاں صاحب نے کہا کہ اب گوردوارے کی جگہ کس سے خریدی جائے، جب مالک تو چھوڑ کر ہندوستان چلے گئے۔۔۔ طویل گفتگو کے بعد میاں صاحب نے کہا کہ میری دانست میں گوردوارے یا کسی بھی جگہ پر اللہ کا نام لیا جاسکتا ہے۔ ساری زمین ہی مسجد ہے۔۔۔ ہاں ناجائز قبضے کا معاملہ ایسے حل کر لیں کہ جگہ اور

211 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

عمارت کی قیمت کا تعین کر لیں۔ اتنی رقم رفتہ رفتہ چندہ کر کے اپنے گاؤں کے یتیموں اور بیواؤں کو دے دیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ ہمارا عذر قبول کر لے گا۔ یوں اس گوردوارہ کو مسجد تسلیم کر لیا گیا۔۔۔ چند ماہ بعد ایک روز میاں صاحب گھیالہ خورد اس مسجد کے پاس موجود تھے کہ اذان کی آواز آئی تو وہ بھی نماز پڑھنے یہاں چلے آئے۔۔۔ چند منٹوں میں ہی وہاں کھلبلی مچ گئی۔ ایک مشرک ہی نہیں۔ شرک کا اڈہ چلانے والا پاک مسجد میں گھس آیا۔۔۔ آنے والے کی سماجی حیثیت کی وجہ سے اُسے تو کچھ نہ کہہ سکے لیکن نمازی اور امام مسجد سے باہر نکل گئے۔۔۔ میاں صاحب اور اُن کے دو چار ساتھیوں نے نماز پڑھی اور واپس اپنے ڈیرے آگئے۔ اُن کے جانے کے بعد مسجد کو دھویا گیا تب وہ اس قابل ہوئی کہ اس میں دوبارہ نماز پڑھی جاسکے۔۔۔ چند برسوں کی محنت رنگ لائی اور گھیالہ خورد کی دونوں پرانی مسجدوں میں بھی دین خالص پہنچ گیا کیونکہ قریباً پورا گاؤں اس پر مطمئن ہو چکا تھا۔ اب صورت حال یہ تھی کہ گھیالہ خورد میں تینوں مساجد اہلحدیثوں کے پاس تھیں۔۔۔ اگر کسی غیر اہلحدیث نے نماز پڑھنی ہو تو یا وہ اپنے گھر پڑھے یا پھر دوسرے گاؤں جائے۔۔۔ برسوں بلکہ قریباً ڈیڑھ دہائی بعد ایک مرتبہ سکھوں کی ایک تنظیم حکومتی اہلکاروں کے ساتھ متروکہ گردوارے ڈھونڈتی ہوئی ادھر آنکلی۔ کسی بڑے بوڑھے نے اس مسجد کا بھی بتا دیا۔ سکھوں کا وفد شدید گرمی میں پہنچا۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ مسجد کے امام نے حکومت کے کہنے کے باوجود وفد کو مسجد کے اندر نہ جانے دیا کہ ناپاک لوگوں کے اندر آنے سے مسجد ہی ناپاک نہ ہو جائے۔۔۔ رمضان کی وجہ سے گاؤں والوں نے وفد کو پانی تک کا نہ پوچھا۔ کسی نے میاں صاحب کو خبر کر دی۔ وہ فوراً سکھوں کو اپنے ڈیرے لے گئے۔ پانی، دودھ، لسی سب کچھ پیش کر دیا۔ گھنٹے بھر کے اندر دیگیں تیار کر کے کھانا بھی کھلایا۔ شام تک مہمان نوازی و دلداری کرتے رہے۔ پورا علاقہ بھی گھمایا۔ افطاری کے وقت دوبارہ کھانا کھلایا اور ایک بزرگ سکھ جو یہیں سے اجر

کر سنگرور جا بسے تھے، اُن کے ساتھ ایک ہی برتن میں کھانا بھی کھایا۔ شام کو میاں صاحب کی معمول کی محفل ہوتی تھی۔ جس میں دس پندرہ منٹ وہ کسی بزرگ کے مناقب بیان کرتے تھے۔ اُس روز میاں صاحب نے گورو ناناک مہاراج دیو جی کی صفت بیان کی تو سکھ وجد میں آ گئے۔

ہماری ایک پھوپھی تھیں جو والد گرامی کی چچا زاد بہن تھیں۔ ساٹھ، ستر کی دہائی کے سماجی پس منظر میں اُن کی حیثیت ہمارے ہاں ابا جان کی سگی بہنوں جیسی ہی تھی۔ جھنگ روڈ پر واقع پینسرہ کے قریب سوہل نامی گاؤں میں رہتی تھیں۔ ان کے بڑے بیٹے کا نام حنیف تھا۔ اسکول میں ناکامی کے بعد اسے ساتھ والے گاؤں کے مدرسے میں دینی تعلیم کے لئے داخل کروا دیا گیا۔۔۔ کئی سال وہاں پڑھتا رہا۔ تھا بے ضرر، گھر میں کم آ میز ہی رہتا۔۔۔ اسکی شادی کے دن قریب آرہے تھے۔ معمول کی تیاریاں جاری تھیں۔۔۔ لیکن حنیف بات بات پر اپنی ماں سے کہتا تھا۔ سادگی اپنائیں۔۔۔ دوسری طرف اُس کے ددھیال والوں نے اُس کی شادی پر ناچنے والیوں کا بھی بندوبست کر لیا کیونکہ پہلے بیٹے کی شادی تھی تو کیوں نہ دھوم دھام سے کی جائے۔۔۔ شادی سے دو ہفتے قبل پھوپھی جان نے حنیف سے کہا کہ بھاگ کر جا اور گھر میں سفیدی کرنے کے لئے سامان لے آؤ۔ حنیف نے مارکیٹ سے سامان خرید کر گھر روانہ کر دیا اور تانگے والے سے کہہ دیا وہ بعد میں آجائے گا۔۔۔ شام سے رات اور رات سے اگلی صبح ہو گئی۔ حنیف گھر نہ پلٹا۔۔۔ تلاش شروع ہو گئی۔ لیکن حنیف کا کوئی اتا پتہ نہیں۔۔۔ دو، تین دن گزرنے کے بعد یقین ہو گیا کہ وہ اغوا ہو گیا ہے کیونکہ علاقے میں کوئی حادثہ پیش نہ آیا تھا۔ شادی کی تیاریاں بیچ میں ہی رہ گئیں۔ حنیف ملے تو کچھ ہو۔۔۔ مہندی سے تین دن پہلے، تمام رشتے داروں کے ہاں نائی کو بھیج کر اطلاع پہنچا دی گئی کہ حنیف کو کسی نے اغوا کر لیا ہے اور شادی کے لئے دوبارہ تاریخ طے کریں گے تو آپ کو اطلاع کر دیں

213 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

گے۔۔۔ قبلہ والد گرامی پریشان ہو کر موضع سوبل گئے کہ بہن کو تسلی دے کر آئیں، واپس گھر پہنچے تو خود بے حد پریشان تھے۔۔۔ دن، ہفتے، مہینے گزرتے گئے۔ حنیف کا کچھ پتہ نہ چلا۔۔۔ نو مہینے گزر چکے تو کسی نے بتایا کہ حنیف زندہ ہے، خیریت سے ہے اور آجکل رائے ونڈ تبلیغی اجتماع میں موجود ہے۔۔۔ اُس کے گھر والوں میں سے کسی کا بھی کسی مذہبی جماعت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ انہیں سمجھ ہی نہیں آرہی تھی کہ حنیف تبلیغی جماعت میں کیوں چلا گیا۔۔۔ یہ بے حد پیچیدہ سوال ایک ہی جست میں گاؤں کے مولوی صاحب نے حل کر دیا۔ یہ کہہ کر کہ جس مدرسے اُسے آپ نے پڑھنے کے لئے بھیجا تھا، وہ تبلیغی جماعت والوں کا ہی تو ہے۔۔۔ حنیف کے گھر والوں کو پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ مولویوں کے مدرسے مختلف فکری وابستگیاں رکھتے ہیں۔۔۔ خیر یہ بحث کہ کونسا مدرسہ کیا ہے اور کیا نہیں ہے، یہ اُس کے گھر والوں کا مسئلہ نہیں تھا۔۔۔ وہ بھاگے بھاگے، تبلیغی اجتماع رائے ونڈ پہنچے۔ وہاں حنیف اور اُس کے ساتھیوں کو وہ گالیاں دیں کہ سننے والوں نے کانوں کو ہاتھ لگا لیا۔ جواب میں کوئی گالی تو کیا ماتھے پر شکن تک نہ آئی۔۔۔ حنیف فوری طور پر گھر نہ آیا۔ البتہ اجتماع کے بعد گھر واپسی کا وعدہ کر لیا۔۔۔ واپسی پر پھوپھی جان نے پوچھا حنیف تم نے ایسا کیوں کیا۔ کہنے لگا اماں جان! میں نے کئی مرتبہ کہا۔ آپ سادگی سے شادی کریں۔ لیکن آپ نے تو ناچنے والیاں بھی بلائیں ہوئی تھیں۔۔۔ پھوپھی جان رو پڑیں۔ کہنے لگیں۔ حنیف! پگلے اتنی سی بات پر تم نے جدائی دی تھی۔ جیسے کہو گے ویسے ہی شادی کر دیں گے لیکن خدا کے واسطے ایسی حرکت دوبارہ نہ کرنا۔۔۔ اُس نے وعدہ کر لیا، وہ ایسے دوبارہ نہیں کرے گا۔۔۔ سالہا سال مدارس اور مولویوں اور ان کی کتابوں کے درمیان رہنے کی وجہ سے حنیف میں تجزیاتی صلاحیت بیدار ہو چکی تھی۔ اب وہ مختلف دینی مسائل پر اپنی رائے بھی دینے لگا۔۔۔ پڑھتے پڑھتے اُسے محسوس ہونے لگا کہ اُس کی فکر درست نہیں۔ تب اُس نے

214 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

اپنا راستہ تبدیل کیا اور اہلحدیث ہو گیا۔ علمی جزئیات تو اُسے پہلے ہی معلوم تھیں، جلد ہی اہلحدیثوں کا بھی امام بن گیا اور اُن کے اجتماعات میں تقرر ریریں کرنے لگا۔۔۔ اشفاق بھائی تک خبر پہنچی تو وہ اُسے اپنے گاؤں کی مسجد میں بطور خطیب لے آئے۔ یہاں اُس کا بھی دل لگ گیا اور یوں کئی سال خاموشی سے گزر گئے۔۔۔ لیکن ایک دن نیا ہی انکشاف ہوا کہ حنیف نے کچھ عرصے سے اہلحدیثوں کے مولویوں کے سامنے کچھ اشکالات رکھے ہوئے ہیں۔۔۔ اہلحدیث سنیوں سے ہر معاملے میں دلیل حدیث سے طلب کرتے تھے، حنیف علمی اعتبار سے اس کام سے آگے گزر گیا۔ اُس نے حدیثوں اور روایتوں کو پرکھنے کا کام شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلنے لگا۔ کہ کسی مسئلے پر اہلحدیث روایت پیش کریں۔ یہ اُس روایت کی سند، سیاق و سباق حتیٰ کہ اُس کے متن پر بحث کرنا شروع ہو جائے۔۔۔ اس کام سے اہلحدیث اتنے زچ ہوئے کہ حنیف سے جان چھڑانے کا سوچنے لگے۔۔۔ ایک جمعہ کو اُس نے ایسا خطاب کیا جس کی براہ راست زد اہلحدیث فکر پر پڑنے لگی۔۔۔ جمعے کے بعد وہاں کے بڑوں کا ایک خفیہ اجتماع ہوا جس میں طے پایا گیا کہ حنیف کو آج رات عشاء کی نماز سے دو تین گھنٹے بعد فارغ کر کے رات کی تاریکی میں ہی گاؤں چھوڑنے کا کہہ دیا جائے۔ تاکہ صبح جب لوگوں کو خبر ہو تو وہ گاؤں چھوڑ کر جا چکا ہو۔۔۔ سخت سردیوں کی رات تھی۔ ساتھ ہی بارش شروع ہو گئی۔ نصف شب سے کچھ پہلے حنیف کو حکم دیا گیا کہ اپنا سامان اٹھاؤ اور یہاں سے نکلو اور کبھی دوبارہ ادھر کا رخ نہ کرنا۔ اُس نے لاکھ کہا کہ صبح ہو لینے دیں، میں چلا جاؤں گا۔ لیکن وہاں کے بڑوں کو خطرہ تھا کہ صبح اگر گاؤں کے چند لوگ بھی اس کے ساتھ مل گئے تو ممکن ہے اس کی بجائے انہیں گاؤں چھوڑنا پڑ جائے کیونکہ حنیف کی آواز وہاں موثر ہو چکی تھی۔۔۔ سو، انہوں نے عین نصف شب حنیف کے سر پر اُسکا بستر لاد کر گاؤں کی حد سے باہر دھکا دے دیا۔ اور اپنے دو تین لوگ راستے پر بٹھا دیے کہ کہیں وہ واپس نہ

215 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

آجائے۔۔۔ وہ سر پر اپنا بستر اٹھائے سخت سردی اور بارش میں گاؤں سے نکل کر کہاں جاتا۔ راستہ ایک ہی تھا کہ چلدھے آلی چلا جائے۔۔۔ تہجد کے قریب وہ میاں صاحب کے ڈیرے پہنچ گیا۔۔۔ میاں صاحب نماز کی تیاری کر رہے تھے۔ کہ کسی نے مہمان آنے کی اطلاع کر دی۔۔۔ حسب معمول اُسے ڈیرے میں ٹھہرا لیا گیا۔ لباس تبدیل کروایا گیا۔ نیا بستر دے دیا۔ صبح ناشتے کے بعد اُس نے میاں صاحب کو رات کا قصہ سنایا۔ تو میاں صاحب جیسے پہلے چپ ہوا کرتے تھے پھر چپ ہو گئے۔۔۔ کئی دن گزر گئے۔ حنیف ڈیرے پر ہی رہا۔۔۔ وہ ڈیرہ چھوڑ کر گیا، نہ ہی میاں صاحب نے اُسے جانے کو کہا۔۔۔ رفتہ رفتہ اُس کے ہم خیال مولوی ادھر آنا شروع ہو گئے۔ اب ڈیرے پر اُن کی بحثیں بھی شروع ہو گئیں۔ ایک مولوی جاتا تو دوسرا آ جاتا۔۔۔ ڈیرے پر ایک بالکل انوکھے رنگ کا حلقہ بن گیا۔۔۔ گا ہے وہ میاں صاحب کے والد کی قبر کو بُت بھی قرار دیتے، شرک کا گڑھ بھی کہتے۔ لیکن موجود بھی وہیں رہتے۔ کھانا بھی لنگر سے کھاتے، اور رہائش بھی ڈیرے میں ہی رکھتے۔۔۔ میاں صاحب نے کبھی اُن کی کسی سرگرمی میں شرکت کی نہ انہیں روکا۔۔۔ ہفتے عشرے میں مولویوں کا جتھہ میاں صاحب سے بھی فکری بحث کرتا جو بالکل یک طرفہ ہی ہوتی۔ میاں صاحب جواب دیتے اور نہ ہی یہ کہتے کہ بحث نہ کی جائے۔۔۔ حنیف اور اُن کے حلقے کا خیال تھا کہ میاں صاحب چونکہ کسی مدرسے سے تعلیم یافتہ نہیں ہیں اس لئے انہیں سمجھ ہی نہیں آتی ہے کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں۔ اور یہ معلوم بھی ایسے ہی ہوتا تھا۔۔۔ یہ سلسلہ بھی دو اڑھائی سال چلا تا وقتیکہ حنیف نے اعلان کر دیا کہ اُسے کسی دور دراز علاقے میں خطیب کی ذمہ داری مل گئی ہے۔۔۔ وقتِ رخصت میاں صاحب نے حنیف کو گلے لگایا، ایک سوٹ اور ایک بہترین جوتا تحفے میں دیا، آنکھوں میں آنسو بھر کر کہنے لگے۔ مولانا حنیف صاحب! تم صاحبِ علم آدمی ہو۔ ہم جیسے جاہلوں کو بھول نہ جانا۔ جب وقت ملے چکر ضرور لگاتے

رہنا۔ میاں عبداللہ تمہیں یاد کرتا رہے گا۔

اب ہماری یونین کونسل میں شامل تینوں دیہات کی صورت یہ ہو گئی۔ ہمارے گاؤں میں اکثریت سنی۔ درمیان والے گاؤں چلدھے آلی میں شیعہ اور دوسرے کوٹے پر گھیالہ خورد میں اہلحدیث ہو چکی تھی۔۔۔ اشفاق بھائی اور اُن کے رفقاء نے ملکی سطح کے اپنے ہم مسلک علماء سے رابطے بڑھائے۔ جن کے ذریعے انہوں نے عرب شریف سے علماء منگوا کر اپنی مساجد میں تقریریں کروادیں۔۔۔ اب ایک نیا مقابلہ شروع ہو گیا۔ چلدھے آلی کی امام بارگاہ والوں نے بھی ہاتھ پاؤں مارے اور ایران و عراق سے مقررین بلا کر جلسہ کر دیا۔۔۔ جلسوں میں مقررین نے کیا بولا، یہ کسی کو سمجھ نہیں آئی۔ کوئی کہتا عربی میں تقریر کی ہے تو دوسرے کا خیال تھا کہ یہ فارسی تھی۔۔۔ جو بھی تھا، کسی کو کچھ سمجھ نہ آسکی۔۔۔ زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم۔ اس دوڑ میں پیچھے رہ گئے ہمارے گاؤں نتھو چک والے۔ کوشش انہوں نے بھی کی۔۔۔ یہ جھنگ بازار فیصل آباد کی مرکزی مسجد اپنی فریاد لے کر گئے کہ ہمیں بھی عربی، فارسی بولنے والا کوئی مولوی لا دیں۔ کسی دوسرے ملک سے۔ لیکن مرکزی مسجد والوں کو خبر ہی نہیں تھی کہ ملک سے باہر کس سے رابطہ کریں اور کیسے کریں۔۔۔ انہوں نے ملک کے اندر سے کئی لچھے دار تقریریں کرنے والے بلائے، تقریریں بھی ہوئیں۔ لیکن رنگ جم نہ سکا۔ یہ بین الاقوامی دوڑ سے باہر ہو گئے۔۔۔ محرم میں تعزیے کا جلوس نکلتا، ماتم ہوتا اور تینوں گاؤں سے گھوم کر واپس چلدھے آلی امام بارگاہ میں ختم ہوتا۔ مجلسِ شامِ غریباں کے بعد دہائیوں سے دعا میاں صاحب ہی کروایا کرتے تھے۔ اب یہ ہوا کہ محرم سے قبل ہی گھیالہ خورد والوں نے اعلان کروا دیا کہ اُن کے گاؤں کی حد میں محرم کا کوئی جلوس نہیں داخل ہو سکے گا۔ اور اگر ایسا کرنے کی کوشش کی گئی تو زبردستی بلکہ پوری طاقت سے روکا جائے گا۔۔۔ میاں صاحب نے کہا اس مرتبہ جلوس کا علم لے کر میں سب سے آگے

217 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

ہوں گا کیونکہ اُن کا خیال تھا ایسا کرنے سے جلوس ماضی کی طرح پر سکون انداز میں مکمل ہو جائے گا۔ شیعہ حضرات کے لئے بھی یہ بڑی اچھی خبر تھی اور انہوں نے اسے سراہا بھی۔ لیکن اُن کے غیر مقامی ذاکر اس بات کی راہ میں حائل ہو گئے۔ کہنے لگے جو شخص آج تک علی اعلان خود کو شیعہ نہ کہتا ہو، وہ ہمارے جلوس کی کیسے قیادت کر سکتا ہے۔۔۔ اس پر بجائے طیش میں آنے کے میاں صاحب مزید عاجز ہو گئے اور کہنے لگے۔ یقیناً میں اس لائق کہاں کہ غازی کا علم لے کر چل سکوں۔ میرے اعمال کی وجہ سے غازی نے اپنا علم میرے ہاتھ میں نہیں دیا۔۔۔ روتے رہے، اور معافی طلب کرتے رہے۔۔۔ بالآخر جلوس شروع ہوا تو فریقین پوری طرح مسلح ہو کر نکل آئے۔ چلدھے آلی سے جلوس نکل کر جو نہی گھیالہ خورد کے پاس پہنچا تو سڑک بند ملی۔۔۔ میاں صاحب اور اُن کے مرید بیٹھے ہوئے ہیں اور مجلس حسین علیہ السلام جاری ہے۔۔۔ اب جلوس ان کو پھلانگنے سے تو رہا۔ ادھر گھیالہ خورد والے اس تاک میں کہ جلوس پہنچے تو ہم آج پرانے حساب بھی برابر کر دیں۔۔۔ میاں صاحب کے شاگردوں نے انتظام کر رکھا تھا، جلوس والوں اور اُن کے مخالفوں کو کھانا کھلایا۔ پانی پلایا۔۔۔ رات ہو گئی تو میاں صاحب نے وہیں پر مجلس شامِ غریباں ایسے پڑھی کہ تمام شیعہ اور اہلحدیث بیٹھے سن رہے ہیں۔ رورہے ہیں۔۔۔ میاں صاحب نے کسی جھگڑا کرنے والے کی اصلاح کے لئے بھی ایک جملہ تک نہ بولا۔ رات گئے دونوں فریق اپنے اپنے گاؤں چلے گئے۔۔۔ چند برس گزرے تو عید میلاد کے جلوس پر پھر تنازعہ ہوا لیکن اُس کی قیادت میاں صاحب ہی کرتے آئے تھے۔ اس مرتبہ بھی انہوں نے ہی کی۔۔۔ جلوس جب گھیالہ خورد پہنچا تو اہلحدیث علماء کو بلا کر سیرتِ پاک پر تقاریر بھی کروا دیں۔ تو معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

عیسیٰ نگری ایک چھوٹی سی بستی تھی جو ہمارے گاؤں کے بالکل پاس ہی تھی۔ اس

218 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

کے بارے میں یہاں کے باسیوں کا کہنا تھا کہ یہ بھی ایک گاؤں ہے۔ لیکن یونین کونسل کے باقی تینوں گاؤں اسے بستی کہتے تھے۔ جس کا درجہ گاؤں سے کم سمجھا جاتا تھا۔۔۔ یہاں پر صرف عیسائی ہی رہتے تھے۔ وہ وہاں کیوں رہتے تھے۔ کسی گاؤں میں کیوں نہیں رہتے تھے۔ اور عیسیٰ نگری میں مسلمان کیوں نہیں رہتے تھے۔ اس کا جواب کسی کے پاس نہ تھا۔ نہ ہمارے تایا ابا کے پاس اور نہ ہی میاں صاحب کے پاس۔۔۔ یہاں کے عیسائی اکثر میاں صاحب کے پاس آتے۔ دم درور کراواتے۔ کھانا کھاتے اور بیماری میں علاج بھی یہیں سے کرواتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ مسلمان کسی گندگی صاف کرنے والے عیسائی کو لنگر کھاتے ہوئے اپنے پاس بیٹھنے نہ دیتے۔ تو میاں صاحب اُسے اپنے پاس بلا کر ایک ہی پلیٹ میں کھانا شروع کر دیتے۔۔۔ یہاں تک بات سمجھ میں آچکی تھی لیکن ہم جیسوں کو یہ سمجھ نہ آیا کہ میاں صاحب دھتکارنے والے مسلمان کو کیوں کچھ نہیں کہتے۔ کئی مرتبہ استفسار کیا، لیکن ایک چپ تھی جو ہر معاملے کا جواب تھی۔۔۔ چند سالوں سے ایک نیا تماشہ شروع ہو گیا۔۔۔ ہر چند روز بعد کوئی عیسیٰ نگری سے آتا۔ میاں صاحب سے کہتا۔ میں آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کرنے آیا ہوں۔ اُس کو کلمہ پڑھایا جاتا، مرید کیا جاتا۔ ایک دو جوڑے کپڑوں اور جوتوں کے دیے جاتے اور شیرینی بھی۔ مبارکبادیں دی جاتیں۔ نو مسلم کو اور میاں صاحب کو بھی۔۔۔ چند دنوں بعد خبر ملتی وہ نو مسلم پھر عیسائی ہو گیا۔۔۔ جب ایسے واقعات تواتر سے ہونے لگے تو مولویوں کے ہاتھ یہ موضوع آ گیا۔ کہ میاں صاحب مرتدوں کو سزا دیں۔۔۔ میاں صاحب کہیں کہ میں عدالت نہ حکومت۔ میں تو خود ایک بوجھ ہوں زمین پر۔۔۔ کسی کو کیسے سزا دوں۔۔۔ اُس پر سٹپٹا کر مولویوں کے ایک وفد نے کہا کہ آپ سزا نہیں دے سکتے تو مسلمان نہ کیا کریں۔۔۔ جواب میں کہنے لگے، جب کوئی آ کر کہے میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں تو کیا کہوں۔ نہیں تم نہیں ہو سکتے۔۔۔ وفد نے کہا، یہ

مسلمان ہونے نہیں آتے، آپ سے کپڑے، جوتے، مٹھائی لینے آتے ہیں۔۔۔ آپ سمجھتے کیوں نہیں ہیں۔۔۔ کہنے لگے، تحائف کا کیا ہے۔ کسی کو بھی دیے جا سکتے ہیں۔۔۔ لیکن اس سے اسلام کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ علما کا اصرار تھا۔ اُن کا تو پتہ نہیں میں تو اس بات سے بچتا ہوں کہ کہیں میں ہی مذاق اڑانے والوں میں شامل نہ ہو جاؤں۔ میاں صاحب کا جواب تھا۔۔۔ لیکن ہم نے تو سنا ہے کہ کئی عیسائی چار چار مرتبہ آپ ہی کے ہاتھ پر مسلمان ہو کر تحائف لے جا چکے ہیں، ان کو تو روکیں۔ یہ تو مرتد ہیں اور واجب القتل۔۔۔ کیا روکوں؟ عیسائی جا کر وہ عیسیٰ نگری میں ہوتے ہیں، پھر کچھ عرصے بعد میرے پاس تو دوبارہ مسلمان ہونے کے لئے آتے ہیں۔۔۔ اب میرے پاس دل کا حال جاننے کی صلاحیت تو ہے نہیں۔۔۔ تو کیا کہوں کہ ایمان نہ لاؤ۔۔۔ اس کا مطلب ہے میاں صاحب آپ مرتدوں کی حمایت جاری رکھیں گے۔۔۔ برادران! میں تو ایمان لانے والوں کی دل جوئی کرتا ہوں۔ آپ بتائیں، اور کیا کروں۔۔۔ یوں یہ بحث بے نتیجہ ختم ہو گئی۔ اور عیسیٰ نگری والے عیسائی سے مسلمان۔ اور مسلمان سے عیسائی بنتے اور تحائف بٹورتے رہتے۔۔۔ ساٹھ سال سے زائد عمر میاں صاحب نے تجرّد میں ہی گزاری۔ اچھے خاصے زمیندار تھے۔ مربعوں کے جدی پشتی مالک۔ ڈیرہ، مزار، گاڑیاں۔ ڈھور ڈنگر بھی تھے۔ ہر سال کبڈی، گھڑ سواری، نیزہ بازی کا مقابلہ کرواتے۔ کھیل میں ایسے دلچسپی لیتے جیسے اس کے بغیر ان کا کھانا پینا ہضم نہ ہوتا ہو۔۔۔ شادی کی نہ کبھی ذکر کیا۔۔۔ بھائی، بھتیجے اور دیگر عزیزوں کا سگی اولاد کی طرح خیال رکھتے۔۔۔ عیسیٰ نگری سے ایک پنتالیس سالہ عیسائی عورت جو پڑھی لکھی اور خوش شکل تھی۔ اُس نے ڈیرے پہ آنا جانا شروع کر دیا۔۔۔ میاں صاحب نے اپنے مزاج کے مطابق کبھی کسی کو ڈیرے بلایا نہ نکالا۔ اُسے بھی کچھ نہ کہا۔۔۔ خاتون کا نام نگار تھا۔ گفتگو عمدہ کرتی تھی۔۔۔ کچھ عرصہ یہاں قیام کرنے کے بعد وہ میاں صاحب کی توجہ

220 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔۔۔ جناب کبھی کبھار دو دو گھنٹے اُس سے محو گفتگو رہتے اور پھر اگلے دس دن بات کا جواب ہی نہ دیتے۔۔۔ نگار جھنجھلاتی۔ لیکن میاں صاحب کے مزاج شناس جانتے کہ یہ کوئی انوکھی بات نہیں، ساری عمر ایسے ہی گزری ہے۔۔۔ ایک دن یوں لگتا کہ دنیا میں کوئی موضوع اور کوئی معاملہ ایسا نہیں جس میں جناب کی دلچسپی نہ ہو، اگلے روز یوں معلوم ہوتا کہ بھری پُری دنیا میں ایسا کچھ بھی نہیں جس سے کوئی واسطہ ہو۔ لا پرواہی، مکمل بے نیازی۔۔۔ نگار مسلمان ہو گئی، ڈیرے پر میاں صاحب اور آنے والے مہمانوں کی خدمت کرتی رہتی۔ رفتہ رفتہ ڈیرے کے کھانے پکانے کے معاملات میں دخیل بھی ہو گئی۔۔۔ ایک دن خبر آئی کہ میاں صاحب نے نگار سے شادی کر لی۔۔۔ لوگوں نے شک کی نگاہ سے دیکھنا تھا۔ سو دیکھا۔۔۔ کسی نے کہا کہ ساری عمر کی کمائی برباد کر لی۔ کسی نے کہا نگار کی شخصیت کے سامنے دل ہار گئے۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔۔۔ میاں صاحب نے آج تک کسی کام کی کوئی وضاحت دی ہو تو آج دیں۔۔۔ شادی کے بعد ایک نئی گاڑی خرید کر نگار کے نام کر دی۔ تاکہ کہیں آنا جانا ہو تو دقت نہ ہو۔۔۔ ابھی چھ آٹھ ماہ ہی ہوئے ہوں گے شادی کو۔ کہ ایک دن چند اجنبی آئے اور کہنے لگے ہم چنیوٹ سے آئے تھے یہاں فلاں شخص سے ملنے اور آپ سے اپنی بیمار ماں کی دوا بھی لینا تھی۔ اور دعا بھی کروانا تھی۔۔۔ آپ کے ڈیرے سے دو تین سو میٹر کے فاصلے پر ہماری گاڑی چند آدمیوں نے گھیر لی اور اسلحے کے زور پر چھین کر لے گئے ہیں۔۔۔ میاں صاحب نے اپنے آدمی بھیجے لیکن کوئی سراغ نہ مل سکا۔۔۔ میاں صاحب نے اپنی نئی گاڑی دے کر انہیں روانہ کر دیا۔ اور کہہ دیا گاڑی واپس بھجوا دیں۔۔۔ وہ اجنبی گاڑی لے کر ایسے گئے کہ کوئی اتا پتہ نہیں۔ اُن کے گاؤں لوگوں کو بھیجا گیا تو وہاں سے بھی کچھ معلوم نہ ہو سکا۔۔۔ گاڑی گئی تو میاں صاحب کی لیکن طیش نگار کو تھا۔ میاں صاحب نے کہا نئی گاڑی لے لیں گے لیکن نگار

221 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

نے میاں صاحب سے جھگڑنا شروع کر دیا۔ کہ اُس کی گاڑی میاں صاحب نے کیوں کسی کو دی۔۔۔ جواباً میاں صاحب نے یہ بھی نہیں کہا کہ گاڑی تو انہوں نے خریدی تھی، نگار کو تو استعمال کے لئے دی تھی۔۔۔ وہ کہتے رہے کہ نئی گاڑی لے لیتے ہیں، پریشانی کس بات کی ہے؟۔۔۔ نگار نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ غصے میں ڈیرہ چھوڑ کر چلی گئی۔۔۔ جا کر پولیس میں مقدمہ درج کروا دیا کہ میاں صاحب نے اُس کی گاڑی غائب کروا دی ہے۔ اور ثبوت کے طور پر گاڑی کے کاغذات دیے جن کے مطابق گاڑی نگار کی ملکیت تھی۔۔۔ پولیس نے تفتیش شروع کی تو گاڑی مل گئی اور دھوکے سے گاڑی لے کر جانے والے بھی۔ انکشاف یہ ہوا کہ گاڑی نگار نے خود اپنے لوگوں کے ذریعے سے بھگائی ہے۔۔۔ مزید طیش میں آ کر نگار نے خلع کا دعویٰ دائر کر دیا۔۔۔ میاں صاحب نے کیس کی پیروی ہی نہ کی۔ مصالحتی عدالت خود چل کر آئی اور بتایا کہ نگار کسی صورت میں آپ کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی۔۔۔ آپ اُسے طلاق دے دیں۔ کہنے لگے، دھتکارنا ہمارے مشرب میں حرام ہے، طلاق تو نہیں دیں گے۔۔۔ عدالت نے کہا کہ آپ کی بیوی خلع مانگ رہی ہے، خلع کا فیصلہ اُس کے حق میں ہو گا تو آپ کی عزت تار تار ہو جائے گی۔۔۔ میاں صاحب نے پہلے کبھی عزت بچائی ہو تو اب بات کریں۔۔۔ نگار کو خلع مل گیا۔۔۔ اُس نے دوسرا مقدمہ کر دیا کہ میاں صاحب کی زمین، جائیداد، مویشیوں، ڈیرے میں سے اُس کا حصہ دیا جائے۔۔۔ جب عدالت میں ریکارڈ پیش ہوا تب پتہ چلا کہ میاں صاحب کے مرشد اور والد گرامی تمام جائیداد اپنے ہاتھ سے اپنے ٹرسٹ اور ڈیرے کے نام کر گئے تھے۔ میاں صاحب تو کسی شے کے مالک ہی نہیں ہیں تو حصہ کہاں سے دیں۔۔۔ نگار کے دل پر ایسی چوٹ پری کہ اُس کا اسلام سے اعتبار ہی اٹھ گیا اور وہ پھر عیسائی ہو کر بیرون ملک چلی گئی۔

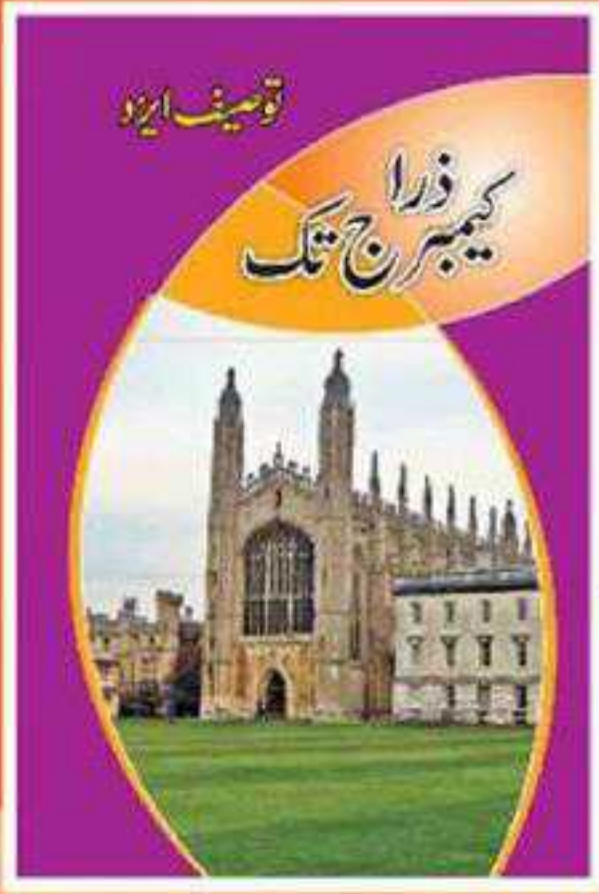
میاں صاحب کی ہمارے ابا کے ساتھ گاڑی چھنتی تھی۔ برسوں ایک دوسرے کے

222 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

ساتھ اٹھتے بیٹھتے رہے۔ جس کی وجہ سے ہمیں بھی میاں صاحب کو قریب سے دیکھنے کے مواقع ملے۔ گا ہے میاں صاحب کی طبیعت میں روانی آتی تو وہ قبلہ والد گرامی کے سامنے بلھے شاہ سے لے کر حافظ تک کے کلام ایسے پڑھتے جیسے یہ اشعار اُن پر نازل ہوئے ہوں۔ پڑھتے ہوئے یوں تفسیر کرتے جیسے انہوں نے ساری عمر انہی پر غور و خوض کیا ہو۔۔۔ ستائیس برس قبل جب ہم نے انجینئرنگ کی تعلیم مکمل کی تو ایک دن ہمارے ابا حضور ہمیں میاں صاحب کے پاس لے گئے۔ ہم اسے معمول کی کارروائی سمجھ رہے تھے۔۔۔ ڈیرے پر جا کر ابا جان نے پوچھا۔ میاں صاحب! برخوردار نے انجینئرنگ کی تعلیم مکمل کر لی ہے۔ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔۔۔ اس غیر متوقع سوال پر ہم بے حد حیران ہو کر ابا جان کی طرف دیکھنے لگے۔ کہ میاں صاحب کو کیا علم انجینئرنگ کیا ہے اور ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ جواب میں میاں صاحب نے ہم سے پوچھا۔ Numerical methods اور Mechanics of Machines میں کیا کچھ پڑھا ہے۔۔۔ ہمارا تو منہ ہی کھلے کا کھلا رہ گیا۔ میاں صاحب کو کیسے معلوم ہے کہ انجینئرنگ میں یہ مضامین پڑھائے جاتے ہیں۔۔۔ ہم سے رہا نہ گیا۔ پوچھا۔ آپ کیسے ان مضامین سے واقف ہیں۔۔۔ پہلی اور شاید آخری مرتبہ اُن کے منہ سے سنا۔ کہ بٹوارے سے دو سال قبل اُن کے والد نے انہیں لندن انجینئرنگ کی تعلیم کے لیے بھیجا تھا۔۔۔ جی، کیا۔ آپ انجینئرنگ پڑھتے رہے ہیں۔۔۔ کہا، ہاں ڈگری مکمل کر لی تھی، وہیں رہ جانے کا ارادہ تھا کہ کسی کی نظر پڑ گئی۔۔۔ علم، کیریئر سب بھلا دیا، واپس یہاں بھیج دیا۔ کام پر لگا دیا۔۔۔ اچھا ہی ہوا۔ جہاں کا خمیر تھا وہیں پہنچ گیا۔۔۔ کئی گھنٹے گفتگو جاری رہی۔ ہم نے ایک گستاخ سوال پوچھا۔۔۔ میاں صاحب! آپ دین، دنیا ہر معاملے میں ذخیل ہوتے ہیں۔ ہر کسی کی تعریف کرتے ہیں۔ جو اچھائی ہی ہے لیکن ہمارے گاؤں کے عالم جنہوں نے کئی کتابیں بھی لکھی ہیں، وہ کہتے ہیں کہ برائی کو برا کہو۔ نہیں تو نفرت

223 ----- یہ واقعہ بھی ہونا تھا

ہی کر لو۔۔۔ آپ کیوں کسی بری چیز کو برا کہنے سے کتراتے ہیں۔ کیوں نفی نہیں کرتے
برائی کی۔۔۔ بے حد سکون اور رسان سے بولے، نفس کی نفی شروع کی تھی، ابھی تک مکمل
ہی نہیں ہوئی۔ ہو جائے تو کردوں گا نفی کسی اور کی بھی۔۔۔ اُس ملاقات کے قریباً چھ ماہ
بعد قبلہ والد گرامی اپنے رب کے حضور چلے گئے۔ دفن کے وقت میاں صاحب نے اپنے
ہاتھوں سے مٹی ڈالتے ہوئے ہمیں کہا۔۔۔ سب نے ہی جانا ہے۔ کسی نے یہاں نہیں
رہنا۔۔۔۔ ہم لاہور آگئے۔ پھر سال بھر اُن سے رابطہ نہ رہ سکا، ایک دن خبر آئی
میاں صاحب رخصت ہو گئے۔ آج تیسرا دن ہے۔۔۔۔۔



ذرا کیمبرج تک

برطانیہ کا شہر دنیا کے ان شہروں میں شمار ہوتا ہے جہاں پر جدید سائنس اور تہذیب کی بنیاد رکھی گئی۔ کیمبرج یونیورسٹی آٹھ سو سال پرانی درس گاہ ہے۔ اس یونیورسٹی میں جدید علوم بالخصوص سائنس کے حوالے سے بنیادی نوعیت کا کام سرانجام دیا گیا ہے جس کی بناء پر انسانی تہذیب مادی ترقی کی معراج تک پہنچی ہے۔ اس کتاب کے ذریعے عام لوگوں کو کیمبرج شہر، یونیورسٹی اور یہاں پیدا کیے گئے علوم اور سرکردہ افراد سے متعارف کروایا گیا ہے۔ یہ کتاب سفرنامے کے انداز میں تحریر کی گئی ہے۔ اظہار کے حوالے سے دو پہلو اہم ہیں۔ پہلا، ہلکا بھلکا مزاح اور دوسرا معلومات۔ درج ذیل عبارت ملاحظہ کریں:

”ادب کے میدان میں ٹرینی کالج نے متعدد معروف لوگ پیدا کیے ہیں۔ لارڈ بائرن کا نام انگریزی ادب میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ وہ ۱۸۰۵ء میں ٹرینی کالج میں داخل ہوا۔ وہ اپنی شاعری، معاشقوں، قرض، خود ساختہ جلاوطنی اور خلافت عثمانیہ کے خلاف جنگ کی وجہ سے مشہور ہوا۔ بائرن اور غالب میں شاعری، عشق اور قرض مشترک ہیں۔ قرض کے معاملے میں غالب بائرن سے آگے بلکہ بہت ہی آگے ہے۔ بحث یہ نہیں کہ غالب نے زیادہ قرض لے رکھا تھا یا بائرن نے۔ کیونکہ یہ معاملہ دونوں کے ہاں فروغی ہے۔ اصل یہ ہے کہ قرض لیا جائے اور تسلسل سے لیا جائے۔ قرض کی مقدار و تعداد کے حساب کا جھنجھٹ قرض خواہ کے ذمے ہے، مقرض اس قضیے میں نہیں پڑتے۔ غالب کو میدان قرض میں فوقیت یہ ہے کہ اس نے قرض سے گھبرا کر کبھی سکونت تبدیل کرنے کے بارے میں نہیں سوچا۔ البتہ اس کے قرض خواہ قرض دینے سے جان چھڑانے کے لیے مکان تو کیا دنیا چھوڑنے کے بارے میں غور و خوض کرتے رہے ہیں۔“

غزنی سٹریٹ • اردو بازار • لاہور
0300-4489310 - 0331-4489310
nastalique786@gmail.com

نستعلیق
Publications

